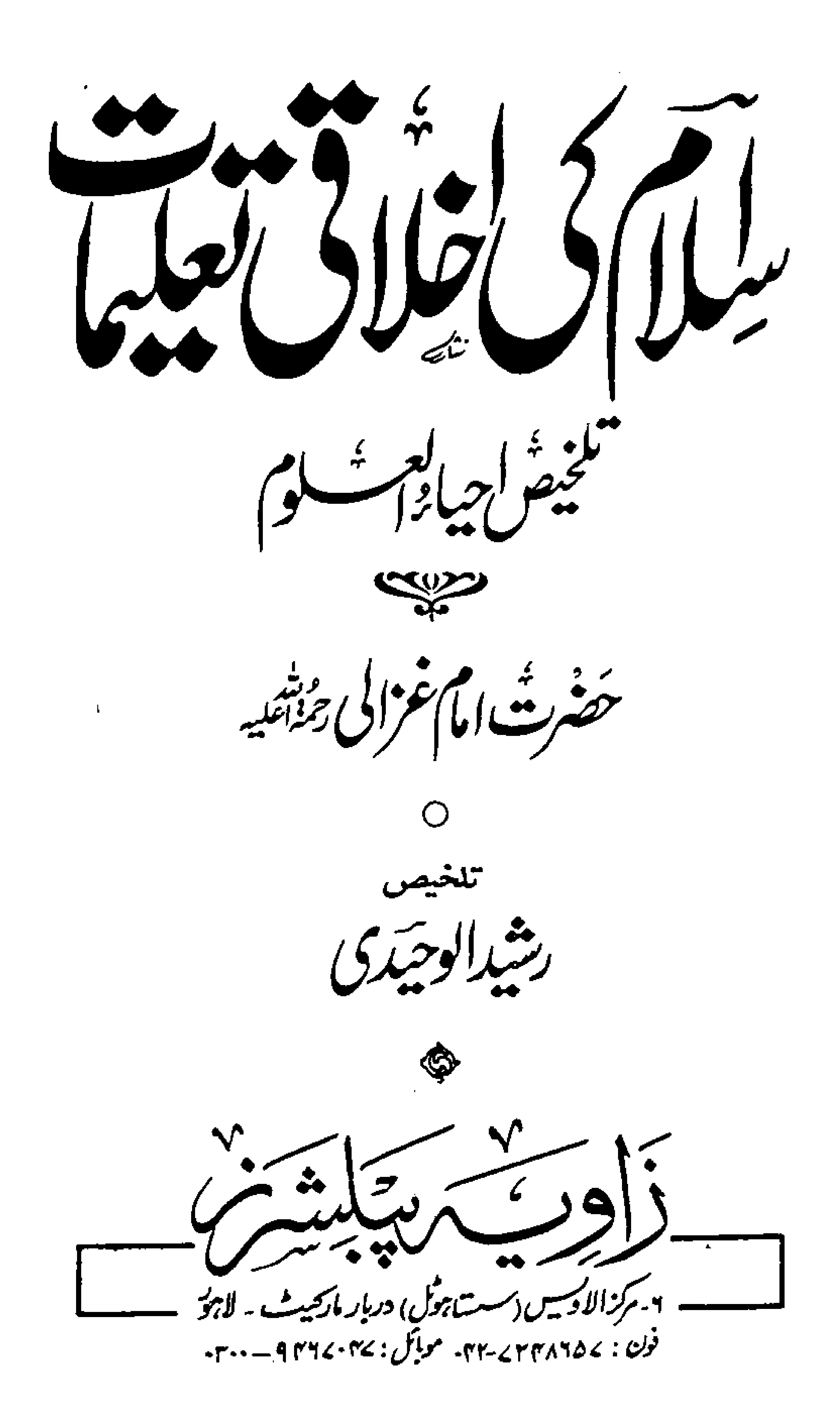

سلام کی اخلاقی تعلیمات
حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ


اسلام کی اخلاقی تعلیمات
تلخیص احیاء العلوم
حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ
تلخیص
رشید الوحیدی
زاویہ پبلشرز
۶- مرکز الاویس (دستا ہوٹل) دربار مارکیٹ - لاہور
فون: ۷۲۴۸۶۵۷-۰۴۲ موبائل: ۹۴۶۷۰۴۷-۰۳۰۰



زیر اہتمام

نجابت علی تارڑ

84927

اشتراک وتعاون

شیخ الحدیث علامہ خالد محمود

ادارہ معارف القرآن کراچی

نوٹ: اس کتاب کے جملہ محاصل ادارہ معارف القرآن کراچی کے لئے وقف ہیں

سالِ اشاعت — ۲۰۰۹ ○ تعداد — ۱۰۰۰ ○ ہدیہ — 150/



کتاب گھر، کمیٹی چوک، راولپنڈی	051-5552929
اسلامک بک کارپوریشن، کمیٹی چوک، راولپنڈی	051-5536111
احمد بک کارپوریشن، کمیٹی چوک، راولپنڈی	051-5558320
مکتبہ قادریہ، پرانی سبزی منڈی، کراچی	0213-4944672
مکتبہ برکات المدینہ، بہادر آباد، کراچی	0213-4219324
مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی	0213-2216464
حنفیہ پاک پبلی کیشنز، کھارادر، کراچی	
مکتبہ غنی سلطان، حیدر آباد	0321-3025510
مکتبہ قادریہ، سرکلر روڈ، گوجرانوالہ	055-4237699
مکتبہ قادریہ، داتا دربار مارکیٹ لاہور	0423-7226193
کتب خانہ حاجی مشتاق احمد، ملتان	061-4545486
مکتبہ ابوحنیفہ، جامعہ نعیمیہ، گڑھی شاہو، لاہور	0300-4986439
قادری کتب خانہ، قائداعظم روڈ، میلسی	0307-6666422

حسن ترتیب

مقدمہ

(ضیاءالحسن فاروقی)

بعض شخصیتیں دور آفریں کہلاتی ہیں، ان کی سیرت اور شخصیت کے نشیب و فراز اور احساسات اور افکار میں تغیر و تبدل کے جو نقوش ہوتے ہیں، اُن میں فطرت کا سا حُسن پایا جاتا ہے جو خود اپنی طرف کھینچتا ہے اور کیفیات سے بھرے پُرے دل کو تڑپاتا اور روشن ذہنوں کو اور زیادہ روشن کر جاتا ہے۔ ایسی شخصیتوں کی کمزوری اور بعض صورتوں میں خیالات کے تضاد اور افکار کی پیچیدگیوں میں بھی ایک بات ہوتی ہے جو دامن پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ایسی ہی بیدار مغز، دور آفریں اور کبھی کبھی چونکا دینے والی شخصیتوں میں امام ابو حامد الغزالی (۱۱۱۱-۱۰۵۸ء) بھی ہیں۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب خراسان کے شہر اور قصبات اپنی مردم خیزی کے لیے دور دور تک مشہور تھے، اسی علاقے کے ایک ضلع طوس کے ایک قصبے طبران میں امام صاحب کی ولادت ہوئی۔ علامہ شبلی کی تحقیق ہے کہ ان کے والد سوت فروش تھے اور اس مناسبت سے وسط ایشیا میں نسبت کے طریقے کے مطابق ان کا خاندان ''غزّالی'' کہلاتا ہے، علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ غزالہ، طوس کے ایک گاؤں کا نام ہے، امام صاحب وہیں کے رہنے والے تھے، اس لیے غزالی مشہور ہوئے مگر حقیقت یہ ہے کہ طوس کے ضلع میں غزالہ کوئی گاؤں نہیں، اس طرح پہلی نسبت ہی صحیح ہے۔[1]

امام موصوف کے رشتے کے ایک دادا تھے، یعنی اُن کے والد کے چچا، نام ان کا بھی ابو حامد الغزالی (م ۱۰۴۳ء) تھا' دینی علوم اور خاص طور سے علم فقہ میں اُن کا رتبہ بلند تھا' کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت میں کہ انکے والد تعلیم سے محروم رہ گئے تھے امام صاحب نے

اپنے انھیں بزرگ کو اپنی تعلیمی کاوشوں کے لیے نمونہ بنایا ہو۔ زندگی کے شروع ہی کے ایام میں ان کے گرد و پیش تصوف کا چرچا تھا' خود ان کے والد علم دوست' متقی' پرہیزگار اور درویش صفت انسان تھے، لیکن افلاس بھی دامن گیر تھا اور جب وہ ان کی کم عمری ہی میں انتقال کر گئے اور ان کے ایک دوست نے ان کے بیٹے کی تعلیم کا انتظام کرنے کے متعلق معذوری کا اظہار کیا، تو انھیں ایک مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ اس مدرسے سے ابتدائی علوم کی تحصیل کر کے انھوں نے اپنے وطن ہی میں شیخ احمد بن محمد الراذ کافی سے فقہ شافعی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔[۲] اس کے بعد جرجان گئے جہاں آپ نے امام ابونصر اسمٰعیلی سے فقہ شافعی کی اور کتابیں پڑھیں، اب امام صاحب نے طویل سفر کا ارادہ کیا اور نیشاپور جا کر امام الحرمین[۳] کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا' اس وقت

دنیائے اسلام کے مشرقی حصے میں امام الحرمین اور علامہ ابواسحٰق شیرازی کے پائے کے دوسرے عالم مشکل ہی سے ملتے تھے، علامہ شیرازی بغداد میں درس دیتے تھے ، اس لیے نیشاپور ہی حاضری ممکن تھی' وہاں انھوں نے امام الحرمین کے حلقۂ درس میں بہت جلد ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا' یہاں تک کہ اپنے نامور استاد کے مُعید بن گئے۔ خود امام الحرمین ان کی ذہانت وفطانت اور علم و تدین کے قائل تھے۔ استاد کا انتقال ہوا تو انھوں نے بھی نیشاپور چھوڑ دیا' اس وقت ان کی عمر ۲۸ برس کی تھی۔ امام الحرمین کے حلقۂ درس میں علم الکلام' فقہ واصول فقہ، فلسفہ، منطق، جدلیات، علوم طبیعی، تصوف، غرض تمام علوم کی تعلیم ہوتی تھی اور امام موصوف کے یہاں پورے طور پر آزادی خیال واظہار افکار کی فضا قائم تھی' وہ اپنے طالب علموں کی ہر قسم کے بحث ومباحثے' اور نقد ونظر کے لیے ہمت افزائی کرتے تھے' امام الحرمین نے شروع ہی سے اندازہ کر لیا کہ الغزالی میں فکری وفلسفیانہ صلاحیت کی ارزانی ہے، وہ الغزالی کو ایسے بحر زخار سے تعبیر کرتے تھے جس میں کوئی غواصی کرے تو بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اپنے دو تلامذہ خوافی اور کیا س کی خصوصیات بتا کر وہ الغزالی کے

نظری علوم کے شوق کی تعریف کیا کرتے تھے۔[1] ان کی مناظرانہ صلاحیتیں بھی بے مثل تھیں اوران کے ساتھی طلبا اُن سے پریشان رہتے تھے۔لیکن ان تمام روایتی علوم اوران میں کمال مہارت غزالی کی حقیقی صلاحیت کو دبانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔فطرت نے انھیں ایک نقاد ذہن عطا کیا تھا۔اورآغاز ہی سے ان کے آزادانہ نقد ونظر اور مبصرانہ بصیرت کے آثار نمایاں تھے۔امام غزالی کے علمی ماحول کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ بڑے بڑے جید علما شہرت ودولت اور جاہ وحشمت ہی کو علم حاصل کرنے کا مقصد تصور کرتے تھے۔تاریخ نے ایسے بے شمار دنیا پرست علما کی زندگیاں محفوظ کرلی ہیں کہ جب اُن کی سواری حشم وخدم کے ساتھ نکلتی تو معلوم ہوتا کہ کوئی بادشاہ یا امیر سیر کو نکلا ہے۔غرضکہ دینی علم بھی دنیا کمانے کا ایک وسیلہ تھا اور اسے عار سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔

اپنے قیام نیشاپور کے دوران وہ ایک صوفی بزرگ فارمدی کے جو امام غزالی کے چچا اور مشہور صوفی عالم قشیری (م ۱۰۷۴ء) کے شاگرد تھے' حلقہ اثر میں آ چکے تھے،اس طرح وہ تصوف کی لذت سے آشنا ہو چکے تھے' لیکن یہ تصوف رسمی زیادہ تھا' فارمدی سے انھوں نے نظریہ تصوف اور صوفیانہ اوراد واعمال سے متعلق زیادہ سیکھا، کہتے ہیں کہ اس دور میں انھوں نے خاصی ریاضت بھی کی' مگر وہ چنگاری جو دل میں پیدا ہو کر پوری شخصیت میں ایک نئی زندگی اور چمک پیدا کردیتی ہے،اس کا ابھی کوئی پتہ نہ تھا کیونکہ اس عہد کی ریاضتوں وعبادتوں سے وہ کیفیت نہیں ظاہر ہوئی جسے صوفی ''عالم بالا'' سے براہ راست بطور فیضان حاصل کرتا[2] ہے۔اور محض' مکتب' کی کرامت،ان کے لیے کافی وشافی نہ تھی'اس کے لیے ابھی تو،جیسا کہ ہم دیکھیں گے،انھیں ایسے تازہ ویرانوں اور نئے بیابانوں میں صحرا نوردی کرنی تھی جہاں ابھی تک کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔

فارمدی کا انتقال ۱۰۸۴ء میں ہوا اور امام الحرمین نے ۱۰۸۵ میں وفات پائی۔ اس وقت امام غزالی ۲۸ برس کے تھے ان میں توانائی اور حوصلہ تھا اور ان کے علم کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی، اپنے خارجی ماحول کے علاوہ اپنی ذہنی کیفیت اور افتادِ طبیعت کے لحاظ سے بھی وہ دینوی جاہ و حشمت کے خواہاں تھے، اور شاید اسی شے کی تلاش میں وہ سلجوقی سلطان ملک شاہ (۹۲-۱۰۷۲ء) کے مشہور وزیر نظام الملک طوسی کے دربار میں آئے۔ وزیر موصوف نے نہایت تعظیم و تکریم سے ان کا استقبال کیا۔ یہاں تک کہ وہ جلد ہی اس کے دربار سے وابستہ فقہا و ماہرین علم الکلام کی علمی مجلسوں اور مناظروں میں نمایاں اور ممتاز جگہ کے حامل سمجھے جانے لگے۔ نظام الملک جو خود ایک اچھا عالم تھا، امام موصوف کے علمی تبحر سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور بالآخر اس نے انھیں جامعہ نظامیہ بغداد کی صدر مدرسی کے لیے منتخب کرلیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۴ سال تھی اور درحقیقت یہ ان کے علم و فضیلت کا غیر معمولی اعتراف تھا۔ یہ واقعہ ۱۰۹۱ء میں پیش آیا۔

مدرس اور معلم کی حیثیت سے غزالی بہت کامیاب رہے، تھوڑے ہی دنوں میں ان نے درس، حسن تقریر اور تبحر علمی کی بغداد میں دھوم مچ گئی اور کیا طلبا اور کیا اساتذہ، وہ مہتم بالشان طور پر مرجع خلایق بن گئے۔ مولانا شبلی نے مکاتبات امام غزالی (مطبوعہ آگرہ) کے حوالے سے لکھا ہے کہ "تھوڑے ہی دنوں میں ان کے علم و فضل کا یہ اثر ہوا کہ ارکان سلطنت کے ہمسر بن گئے بلکہ جیسا کہ سبکی نے طبقات میں لکھا ہے، ان کے جاہ جلال نے وزراء اور امراء کو بھی دبا لیا" یہاں تک کہ سلطنت کے بعض اہم معاملات ان کی شرکت کے بغیر انجام نہیں پاسکتے تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے دو سیاسی اور تہذیبی مرکز تھے، خاندان سلجوق اور آل عباس کے دربار۔ امام صاحب دونوں میں نہایت محترم تھے۔ چنانچہ ایک خط میں خود اس بات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: "بست سال در ایام سلطان شہید (یعنی ملک شاہ سلجوقی) روزگار گذاشت، واز وے باصفہان و بغداد،

اقبالہا دید، وچند بار میان سلطان وامیر المومنین رسول بود در کارہائے بزرگ۔"؎

طبیعت کی وہ بے چینی اور اطمینان قلب سے وہ محرومی جو نیشا پور میں ظاہر ہوئی تھی، اس نے اب ایک طرح کی تشکیک کی صورت اختیار کرلی۔ کوئی اور ہوتا تو اس دنیا کی 'متاع قلیل' پر قانع ہوکر، صبر وشکر کے ساتھ، بیٹھ رہتا، علم میں رتبہ 'بلند، جاہ وحشم، شہرت ونا موری، فراخی وخوشحالی، بظاہر سب کچھ انھیں حاصل تھا، لیکن ان کا 'دل، بہت بے چین تھا اور رفتہ رفتہ اندر کی دنیا میں فکری وروحانی بے چینی نے ایک بحران کی صورت اختیار کرلی تھی، اب کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ خود صدر مدرسی ایک بوجھ معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کا خاص سبب تلاش وتحقیق کا وہ فطری ذوق تھا جو نہ صرف گردوپیش کو جانچتا ہے بلکہ اپنی جانچ بھی کرتا رہتا ہے۔ ایسی شخصیتیں تقلید سے مطمئن نہیں ہوتیں' یہ اور بات ہے کہ بعد کو وہ خود بُت بن جائیں اور عوام کا ذکر کیا' علما وصلحا اُن کی بے لچک تقلید کرنے لگیں۔ امام صاحب کی بے چین طبیعت کو بغداد جیسے شہر نے تلاش وتحقیق پر اور بھی اُکسایا جہاں ہر طرح کے عقیدے اور مناظروں کا شہر تھا، جہاں آزادی تھی اپنے مسلک اور اپنے طریقے سے زندگی گزارنے کی، جہاں مشرق کی دنیائے اسلام کے انقلابات وتغیرات کی دھڑکنیں صاف سُنی جاتی تھیں، خود اپنا علم، اپنی مناظرانہ صلاحیں، انھیں بے یقینی کی منزل کی طرف لے جارہی تھیں' متکلمین کی اصطلاحیں، ان کی لفظی بازی گریاں، ان کا کٹر پن' ان سب میں وہ حقیقت کبریٰ جس کی ان کو تلاش تھی' کھوئی ہوئی تھی' امام صاحب نے اپنی ان ذہنی کیفیات کو اپنی ایک طرح کی خودنوشت سوانح المنقذ من الضلال میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی روحانی ارتقا کی کہانی ہی بیان نہیں کی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ عقل محض کے کرامتی ادراک کے علاوہ ایک اعلیٰ درجے کا ادراک انسانی بھی ہے، اور وہ پیغمبروں کا علم وادراک ہے جسے خدا بذریعہ وحی ان پر القاء کرتا ہے۔ المنقذ کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہوچکا ہے، خود اس کے

بیشتر حصّوں کا ترجمہ اردو کے مُستند عالموں نے کیا ہے۔ہم اس موقعے پر علامہ شبلی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ترجموں کے بعض ضروری حصّے نقل کریں گے۔ کیونکہ جلوت سے خلوت اور خلوت سے جلوت کی طرف انھیں لے جانے اور لانے والے اسباب خود انھیں کی زبان سے سن لئے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

''چونکہ میری طبیعت ابتدا سے تحقیقات کی طرف مائل تھی اس لیے رفتہ رفتہ یہ اثر ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی، اور جو عقائد بچپن سے سنتے سنتے ذہن میں جم گئے تھے ان کی وقعت جاتی رہی۔ میں نے خیال کیا کہ اس قسم کے تقلیدی عقائد تو عیسائی، یہودی سبھی رکھتے ہیں، حقیقی علم اس کا نام ہے کہ کسی قسم کے شبہ کا احتمال تک نہ رہ جائے، مثلاً یہ امر یقینی ہے کہ دس کا عدد تین سے زائد ہے، اب کوئی شخص کہے کہ نہیں بلکہ تین زائد ہے اور اس کے ثبوت میں وہ شخص یہ کہے کہ میرا دعویٰ حق ہے کیونکہ میں عصا کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے، تو میں کہوں گا کہ بے شبہ عصا کا سانپ بن جانا سخت حیرت انگیز ہے لیکن اس سے اس یقین میں فرق نہیں آ سکتا کہ دس تین سے زائد ہے۔

''اب میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس قسم کا یقینی علم مجھ کو کس حد تک ہے، معلوم ہوا کہ صرف حسّیات و بدیہیات، لیکن جب کہ کاوش زیادہ بڑھی تو حسّیات میں بھی شک ہونے لگا، یہاں تک کہ کسی امر کی نسبت یقین نہیں رہا۔ قریباً دو مہینے تک یہی حالت رہی، پھر خدا کے فضل سے یہ حالت تو جاتی رہی لیکن مختلف مذاہب کی نسبت جو شکوک تھے باقی رہے، اسوقت جس قدر فرقے موجود تھے، چار

تھے۔ متکلمین، باطنیہ، فلاسفہ، صوفیہ۔ میں نے ایک ایک فرقے کے علوم وعقائد کی تحقیقات شروع کی۔ علمِ کلام کے متعلق جس قدر قدماء کی تصنیفات تھیں، سب پڑھیں، لیکن وہ میری تسلی کے لیے کافی نہ تھیں، کیونکہ ان میں جن مقدمات سے استدلال ہوتا ہے ان کی بنا، یا تقلید ہے، یا اجماع یا قرآن وحدیث کے نصوص، اور یہ چیزیں اُس شخص کے مقابلے میں بطور حجّت کے پیش نہیں کی جا سکتیں، جو بدیہیات کے سوا اور کسی چیز کا قائل نہ ہو۔

''فلسفے کا جس قدر حصّہ یقینی ہے یعنی ریاضیات وغیرہ اس کو مذہب سے تعلق نہیں اور جو حصّہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے یعنی الٰہیات وغیرہ وہ یقینی نہیں۔

''فرقہ باطنیہ کے عقائد کا تمام تر مدار، امامِ وقت کی تقلید پر ہے لیکن امامِ وقت کی حقیقت کی نسبت کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے، اب صرف تصوف باقی رہ گیا۔

''سب سے آخر میں میں نے تصوف کی طرف توجہ کی، اس فن میں حضرت جنیدؒ، شبلیؒ، بایزید بسطامیؒ کے جو ملفوظات ہیں ان کو دیکھا، ابو طالب مکّی کی قوت القلوب اور حارث محاسبی کی تصنیفات پڑھیں، لیکن چونکہ یہ فن دراصل عملی فن ہے اس لیے صرف علم سے کچھ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا اور عمل کے لئے ضروری تھا کہ زہد وریاضت اختیار کی جائے، اِدھر اپنے اشغال کو دیکھا تو کوئی خلوص پر مبنی نہ تھا۔ درس وتدریس کی طرف، طبیعت کا میلان اس وجہ سے تھا کہ وہ جاہ پرستی اور شہرت عامہ کا ذریعہ تھی، ان واقعات نے

دل میں تحریک پیدا کی کہ بغداد سے نکل کھڑا ہوں اور تمام تعلقات
کو چھوڑ دوں۔ یہ خیال رجب ۴۸۸ھ (۱۰۹۵ء) میں پیدا ہوا لیکن
چھ مہینے لیت و لعل میں گزرے نفس کسی طرح گوارا نہیں کرتا تھا کہ
ایسی بڑی عظمت و جاہ سے دستبردار ہو جائے۔ ان تردّدات میں نوبت
یہاں تک پہنچی کہ زبان رُک چلی، درس دینا بند ہو گیا' رفتہ رفتہ ہضم کی
قوت جاتی رہی۔ آخر طبیبوں نے علاج سے ہاتھ اٹھالیا اور کہہ دیا کہ
ایسی حالت میں علاج کچھ سودمند نہیں ہو سکتا۔ بالآخر میں نے
سفر کا قطعی ارادہ کرلیا، علماء اور ارکان سلطنت کو جب یہ خبر ہوئی
تو سب نے نہایت الحاح کے ساتھ روکا اور حسرت سے کہا "یہ اسلام
کی بدقسمتی ہے۔ ایسی نفع رسانی سے آپ کا دست
بردار ہونا' شرعاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔" تمام علما و فضلا یہی کہتے تھے
لیکن میں اصل حقیقت کو سمجھتا تھا۔ اس لیے آخر سب چھوڑ
چھاڑ کر دفعتاً اُٹھ کھڑا ہوا اور شام کی راہ لی۔"[۱]

ہیچ کارے گرچہ صائب بے تامل خوب نیست
بے تامل آستیں افشاندن از دنیا خوش است

۱۰۹۵ء سے ۱۰۹۷ء تک وہ دمشق میں مجاہدہ و ریاضت میں مشغول رہے۔

"روزانہ یہ شغل تھا کہ جامع اموی کے غربی مینار پر چڑھ کر دروازہ بند کر لیتے
اور تمام تمام دن مراقبہ اور ذکر و شغل کیا کرتے۔"[۱] ذکر و مجاہدے کے ساتھ علمی مشاغل
چھوٹے نہیں، وہ بھی کسی نہ کسی پیمانے پر جاری رہے۔ دو برس دمشق میں گزار کر انھوں نے
القدس کا رُخ کیا اور وہاں جامع عمر اور صخرہ کے حجرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتے
اور مجاہدہ کیا کرتے۔ وہاں سے وہ مقامِ خلیل (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

مزار) پر حاضر ہوئے اور تین باتوں کا عہد کیا:

۱۔ کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جاؤں گا۔

۲۔ کسی بادشاہ کا عطیہ نہ لوں گا۔

۳۔ کسی سے مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا۔[2]

اس سفر میں مصر اور اسکندریہ بھی پہنچے، مغرب بھی جانا چاہتے تھے لیکن پھر خیال ترک کر دیا، مجاہدہ و ریاضت کا سلسلہ برابر جاری رہا تا آنکہ حج و زیارت کی نیت سے مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ کا قصد کیا۔[3] حج کے بعد اہل و عیال کی کشش نے امام موصوف کو وطن پہنچا دیا (۱۱۰۵ء)' حالانکہ وہ وطن واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔[4]

دس گیارہ سال کی اس بیاباں نوردی میں مجاہدات و ریاضات اور حج و زیارات کے تبرکات کے طفیل غزالی کو کیا ملا، اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے، ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ۔ آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔ کے مصداق وہ اہل دنیا کے لیے گم ہو جاتے، لیکن عزلت و تنہائی کے برسوں میں علم و حقیقت کے بحرِ بے کراں سے اُچھل کر ان کی آغوشِ تمنا میں جو کچھ پہنچا اُسے انھوں نے خلق اللہ کی رہنمائی اور مسلم سماج کی بھلائی ہی میں صرف کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور یہی وہ مجدّدانہ شان ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ مجدد حقیقت کے 'طارم اعلیٰ' پر بیٹھنے کے بعد دنیا میں پھر واپس آتا ہے اور اصلاح و تجدید کا فرضِ منصبی ادا کرتا ہے۔ کیونکہ ایسی شخصیتوں کو اس کا الہام ہوتا ہے کہ یہی عزیمت کا کام، انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور عبادتِ افضل ہے۔ اسی کو وہ سارے مجاہدات و ریاضات کا تعمیری اور با مقصد نتیجہ تصور کرتا ہے۔ دنیائے یکسوئی و تنہائی کی درد آشنائی کی لذّت یابی کے بعد امام غزالی جب انسانوں کی دنیا میں واپس آئے ہیں تو اس کا سبب انھوں نے اس طرح خود تحریر کیا ہے:

''میں نے دیکھا کہ فلسفے کے اثرات، بہت سے مدعیان تصوف کی

گمراہی، بہت سے علما کی بے عملی اور متکلمین کی غلط اور کمزور نمایندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے۔ بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند بھی ہیں لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں، بعض محض سوسائٹی، اہل شہر کی عادت کی پیروی اور اپنی حفاظت کے لیے، بعض احکامِ شرعی کی مادّی منفعتیں اور ان کے نہ کرنے کے دنیاوی نقصانات بتلاتے ہیں، اور اگر ان نقصانات سے بچا جا سکے تو ان کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ میں نے دیکھا کہ میں ان شبہات کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں، اور بآسانی اس پر قادر ہوں.... یہ دیکھ کر میرے دل میں شدّت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہیے اور یہی وقت کا فریضہ ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ تجھے یہ عزلت وخلوت کب جائز ہے۔ مرض پھیل گیا ہے اور طبیب خود بیمار ہیں ..... (ممکن ہے کہ حالات کو نامساعد دیکھتے ہوئے میں ہمت ہار بیٹھتا) لیکن (اللہ تعالیٰ) نے سلطانِ وقت کے دل میں یہ تحریک خود پیدا کر دی، اس نے مجھے اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے نیشاپور پہنچنے کا تاکیدی حکم دیا...... میں نے خیال کیا کہ اب میرے لیے عذر باقی نہیں رہا۔ اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لیے ہوگی اور آزمائش اور تکالیف سے گریز ا۔“

طوس پہنچ کر وہ عزلت نشینی کی زندگی چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے، لیکن نظام الملک

مرحوم کے بیٹے فخر الملک نے جو اس وقت سلطان سنجر کا وزیر تھا اصرار کیا کہ وہ نیشاپور کے میمونہ نظامیہ مدرسہ کی مسند درس سنبھالیں جسے انھوں نے کسی قدر تامل اور ہچکچاہٹ کے بعد مان لیا اور ۱۱۰۶ء سے درس و تدریس کا سلسلہ

پھر شروع کر دیا۔لیکن تھوڑے عرصے بعد وہ نیشاپور چھوڑ کر طوس آ گئے اور خود ایک مدرسہ قائم کر کے دینیات اور تصوف کی تعلیم میں مصروف ہو گئے۔اسی دوران انھیں نظامیہ بغداد کی صدر مدرسی کے لیے پھر بلایا گیا لیکن انھوں نے اپنے قیام طوس ہی کو ترجیح دی اور اپنے تلاندہ و مریدوں کے ساتھ عبادت و ریاضت اور تدریس و تعلیم میں مشغول رہے، یہاں تک کہ اسی عالم میں دسمبر ۱۱۱۱ء کو وہ اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے' امام موصوف نے بڑی بھرپور زندگی گزاری' ایسی ہی بھرپور جیسے کہ شاعر نے کہا ہے:

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

امام غزالی کی تصنیفات بہت ہیں، چھوٹی بڑی بلاشبہ انھوں نے سینکڑوں کتابیں لکھیں، علامہ شبلی نے اپنی کتاب الغزالی میں بترتیب حروف تہجی ایک اجمالی فہرست دی ہے، لیکن ہم یہاں مضامین کے لحاظ سے ان کی چند مشہور تصانیف کی ایک فہرست درج کرتے ہیں:

فقہ: وسیط' بسیط' وجیز' خلاصۃ الرسائل، مجموعہ فتاویٰ۔

اصولِ فقہ: تحصین الماخذ، منخول، مستصفیٰ، الخلاف فی اصول القیاس۔

منطق: معیار العلم' محک النظر، میزان العمل۔

فلسفہ: مقاصد الفلاسفہ

کلام: تہافتہ الفلاسفہ، النقذ من الضلال، اقتصاد فی الاعتقاد' مستظہری، قسطاس المستقیم، مواہم الباطنیہ، تفرقہ بین الاسلام والزندقہ۔

تصوف و اخلاق: احیاء العلوم الدین، کیمیائے سعادت، مشکوٰۃ الانوار، معراج السالکین، نصیحۃ الملوک، بدایۃ الہدایہ، منہاج العابدین، جواہر القرآن۔ امام غزالی نے جس طرح اپنی زندگی شروع کی، جس ماحول میں ان کی عقل و ہوش کی آنکھیں کھلیں، جس طرح ان کے مطالعے اور غور و فکر نے شک کا دروازہ کھولا، اور وہ تخلیق کی تنگنائیوں سے نکل کر تلاش حق کی پہنائیوں میں آئے، جستجو اور تلاش کی سرگردانی و حیرانی میں جو کھویا اور جو پایا، یہ سب ہم نے دیکھا کہ خود ایک دلچسپ، سبق آموز، اور پُر کشش داستان ہے، دیوانگی کے بحر میں غواصی کر کے فرزانگی کے جو موتی وہ نکال لائے اور جسے دیکھ کر گوہر شناس نگاہیں متحیر اور خیرہ رہ گئیں، ان سب کی بنا پر یہ ضروری تھا کہ ان کی کتابیں عام ہوتیں اور ان کے خیالات زیادہ سے زیادہ پھیلتے اور مقبول ہوتے اور ساتھ ہی ساتھ ان پر تنقید و احتساب بھی ہوتا۔ مقدمہ نگار مختصراً بیان کرے گا کہ یہ دونوں صورتیں کیوں پیش آئیں۔

آج یہ جو مولوی رشید الوحیدی صاحب نے امام غزالی کی اخلاقی تعلیمات کی تلخیص و ترجمہ کیا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ غزالی کے عہد سے لے کر اب تک ان کی تصنیفات پڑھی جا رہی ہیں اور ان کے خیالات سے استفادہ کیا جا رہا ہے، مغرب سے لے کر مشرق تک، مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں نے امام موصوف کے خیالات و افکار کو، خواہ وہ فلسفے کے حق میں ہوں یا اس کی مخالفت میں، خواہ مذہب و اخلاق سے متعلق ہوں یا خالص فقہی و کلامی مباحث ہوں، سب نے ان کو قابلِ اعتناء اور لایقِ مطالعہ سمجھا ہے، کسی عالمِ دینیات کے خیالات کو مسلمانوں میں اتنی مقبولیت نہیں حاصل ہوئی کہ اس کے فرمودات کو اچھی، نیک اور خدا ترسی کی زندگی گزارنے کا ایک وسیلہ تصور کریں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ دوسرے اور بجنل مفکرین کی طرح وہ تنقید و احتساب سے بھی نہیں محفوظ رہے۔ انھوں نے آرتھوڈوکسی کو تصوف اور تصوف کو آرتھوڈوکسی سے ملانے کی عدیم المثال

کوشش کی، اور نتیجے کے طور پر زندگی میں بھی اور زندگی کے بعد بھی تقریباً ہر مکتب خیال کے نمائندہ علما نے یا تو ان کی نیت پر شبہ کیا یا اُن کے خیالات پر سخت تنقید کی ___ وسیع المشربی نے ان کی قدامت پسندی کی تنقید کی، اور قدامت پسندی نے ان کی وسعتِ نظر اور فسحتِ فکر کو ہدف ملامت بنایا۔ فلسفیوں نے ان کی آرتھوڈوکسی کو نہیں بخشا اور آرتھوڈوکسوں نے ان کے فلسفے کو معاف نہیں کیا۔

امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں فلسفیانہ زبان واسلوب بیان کیا ہے، استدلال منطقی ہے اور تصوف میں کافی اشتغال ہے، اُن کی ان خصوصیات کی بنا پر طرطوشی (م ۱۱۲۶ء) مازری (م ۱۱۴۱ء)، ابن جوزی (م ۱۲۰۰ء)، ابن الصلاح (م ۱۲۴۵ء)' ابن تیمیہ (م ۱۳۲۸ء)' ابن قیم (م ۱۳۵۰ء) اور آرتھوڈوکس مکتب خیال کے دوسرے علمائے دینیات نے کھلے عام اُنھیں 'یکے ازگم گشتگان راہ' کہا ہے۔ قرطبہ کے قاضی ابوعبداللہ محمد ابن حمدین نے تو یہاں تک کیا کہ امام غزالی کی کتابوں کے خلاف ایک فتویٰ شایع کیا' اس فتوے کا یہ اثر ہوا کہ پورے اسپین میں ان کی کتابیں بشمول احیاء علوم الدین جلائی گیئں اور اُن کے رکھنے کی سزا ضبطی جائداد، یہاں تک کہ پھانسی بھی قرار پائی مراکش کے سلطان علی ابن تاشقین (۱۰۸۴۔۱۱۴۲) کے حکم سے جو اپنے مذہبی خیالات میں بہت کٹر تھا' شمالی افریقہ میں بھی امام کی فلسفے اور دینیات کی کتابیں ضایع کر ڈالی گیئں، لیکن ان دونوں واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ امام غزالی کی کتابیں بارہویں صدی کے شروع ہی میں شمالی افریقہ، مغرب اور اسپین میں نشر ہوکر مقبول ہو چکی تھیں۔[۱]

مسلمان فلسفیوں میں ابن رشد (۱۱۲۶۔۱۱۹۸) نے امام غزالی کی شدید مخالفت کی، ۱۱۸۰ء میں تہافت کے جواب میں تہافت التہافت لکھی اور بڑی قابلیت سے لکھی جس میں فلسفے اور فلاسفہ کے خلاف امام موصوف کے ہر اعتراض کا جواب درج کیا' لیکن Islamic Occasionalism کے مصنف مجید فخری کا خیال ہے کہ فلسفے کے علما

اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ ابن رشد کے مقابلے میں امام غزالی کے خیالات مدلل' متوازن اور وزنی ہیں، ابن رشد نے بحث کے دوران امام صاحب پر یہ الزام لگایا ہے کہ آرتھوڈوکس طبقے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے منافقت سے کام لیا اور فلسفیوں کو ہدف ملامت بنایا۔ ابن رشد نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام موصوف کے خیالات میں تضادات پائے جاتے ہیں اور مشکوٰۃ الانوار اور تہافتُ وغیرہ کتابوں سے اس کی مثالیں بھی دی ہیں' ان کے خیال میں امام غزالی کی تعلیمات کے بعض حصے مذہب کے لیے مضرت رساں ہیں اور بعض فلسفے کے حق میں مہلک، ابن طفیل (م ۱۱۸۵ء) نے بھی امام صاحب پر متضاد خیالات کے حامل ہونے کا الزام لگایا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ امام صاحب کے علم و دانش اور خیالات وافکار کا قدرداں ہے اس کی اپنی تصنیف حیّ بن یقظان میں غزالی کے خیالات کے اثرات کا سراغ ملتا ہے۔

مغربی دنیا' اسلام اور عیسائیت کی آویزش کے سبب دینی علوم کے مسلمان عالموں اور مفکروں سے واقف نہ ہوسکی تھی' لیکن فلاسفہ کی کتابوں کے ذریعہ بالواسطہ انھیں مسلمان متکلمین کے بارے میں کچھ معلومات ضرور تھیں' البتہ امام غزالی کی دینیات سے عیسائی دنیا براہ راست واقف تھی، امام موصوف کی حیثیت انوکھی تھی' وہ فلسفی بھی تھے اور متکلم بھی' اور یہی وجہ ہے کہ دونوں حیثیتوں سے وہ مغربی دنیا پر اثر انداز ہوئے اور بقول علامہ شبلی "یہ عجیب بات ہے کہ امام صاحب کی تصنیفات کے ساتھ جو اعتنا یورپ نے کیا خود مسلمانوں نے نہیں کیا۔"[۱] خاص طور سے عقلیات اور کسی قدر دینیات میں یورپ نے ان کے خیالات وافکار میں بڑی دلچسپی ظاہر کی اور ان سے کافی فیضان حاصل کیا۔ مشہور مستشرق وینسنک نے اپنی کتاب میں یورپ کے فلسفیانہ و دینیاتی نظام پر الغزالی کے گہرے اثرات کا اعتراف کیا ہے، اور اس سلسلے میں پلوٹنس، اگسٹن، پاسکال سے اُن کا موازنہ کیا ہے۔[۲] مقدمہ نگار یوروپی افکار پر امام صاحب کے اثرات کی تفصیل نہیں بیان

کرے گا، کیونکہ اس کے لیے تو الگ ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ بعض تنگ نظر مغربی مصنفین نے الغزالی پر آگسٹن کے اثرات دیکھنے کی کوشش کی، مگر انھیں کوئی شہادت نہ مل سکی، لیکن ابوالفرج نے جو تیرھویں صدی میں سُریانی یعقوبی کلیسا کا مشہور پادری تھا، سُریانی اور عربی دونوں زبان میں لکھا اور الغزالی کی احیاء العلوم سے کئی ابواب نقل کیے اور انھیں کسی قدر اپنے مقصد کے پیش نظر تراش خراش کر اپنی کتابوں Ethican اور The Book of the Dove میں استعمال کیا' یہ گویا آغاز تھا عیسائی تصوف پر امام غزالی کے اثرات کا' ابوالفرج کی مذکورہ کتابیں عیسائی خانقاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ امام غزالی کے خیالات وافکار کو اپنے مسیحی عقائد کے مطابق پاتا تھا۔

وینسنک نے ابوالفرج کی دونوں کتابوں کو جانچنے کے بعد بتایا ہے کہ کس طرح ان میں احیاء العلوم کے موضوعات لگ بھگ اسی ترتیب کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ علامہ شبلی نے ''امام صاحب کی تصنیفات اور یورپ'' کے عنوان سے اپنی کتاب الغزالی میں تین صفحوں پر مشتمل ایک باب قلمبند کیا ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک جو تحقیقات ہوئی ہیں' وہ مغرب میں غزالی کے اثرات کو' خاص طور سے فلسفیانہ خیالات کو' ڈیکارٹ سے گزرتے ہوئے شوپنہار اور کانٹ تک بتاتی ہیں کیونکہ امام صاحب کی تقریباً سبھی اہم کتابوں کے ترجمے ۱۱۵۰ء سے قبل لاطینی زبان میں ہو چکے تھے اور یورپ کے ارباب علم ودانش ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ اسلامی دنیا نے اگرچہ' جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' قبولیت کے ساتھ امام غزالی پر تنقیدیں بھی کیں' لیکن آخرکار فیصلہ یہی ہوا کہ امام موصوف نے گیارہویں صدی کے آواخر اور بارہویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کے دینی خیالات کے انتشار میں استحکام پیدا کیا' اور اس سلسلے میں ان کی مختصر سی مگر بہت بلیغ خودنوشت سوانح' المنقذ من الضلال اور ضخیم تصنیف احیاء علوم الدین نے نمایاں کام انجام

دیا۔امام صاحب پر آج بھی تنقیدیں ہوتی ہیں اوران پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ ان کے خیالات کے اثر سے آرتھوڈوکسی کی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور دنیائے اسلام میں سائنس اور فلسفے کی تعلیم کو نہ صرف یہ کہ کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ علم کے یہ دونوں شعبے جن کی بدولت یورپ نے آگے چل کر عقل کو حیران کرنے والے کارنامے انجام دیئے، تقریباً ختم ہو کر رہ گئے، لیکن یہ تنقیدیں اگر صحیح بھی ہوں تو تنہا امام صاحب اس کے ذمہ دار نہیں، مگر یہ موقع اس بحث کا نہیں۔

مولوی رشید الوحیدی صاحب نے امام غزالی کی اخلاقی تعلیمات کو تلخیص کے ساتھ احیاءعلوم الدین سے اخذ کیا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ اس کتاب سے متعلق بھی گفتگو ہو جائے۔امام صاحب کی تصنیفات فقہ، کلام، اخلاق اور تصوف پر ہیں۔فنِ تفسیر وفنِ حدیث کو انھوں نے ہاتھ نہیں لگایا، لیکن ان تمام تصنیفات میں سب سے زیادہ مقبولیت (اور مخالفت بھی) احیاءعلوم الدین کو میسر آئی، محدث زین الدین عراقی اور عبد الغافر فارسی اس کے بڑے قدرداں تھے، علامہ شبلی نے تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء سے کئی روایتیں بیان کی ہیں[1]، ان میں یہ تین چار روایتیں، اگر چہ مبالغے کے ساتھ ہیں، مگر ان سے اس کتاب کی اہمیت، معنویت اور افادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور ساتھ ہی اُن خصوصیات پر بھی غور وخوض کیا جا سکتا ہے جن کی وجہ سے یہ ضخیم کتاب جسے خود کیمیائے سعادت کے نام سے امام موصوف نے فارسی میں مختصر کیا، اس قدر مقبول ہوئی کہ اس حُسنِ قبول نے کسی قدر دوام حاصل کر لیا۔

''امام نووی شارح صحیح مُسلم لکھتے ہیں کہ ''احیاء العلوم قرآن مجید کے لگ بھگ ہے''۔شیخ ابو محمد کازرونی کا دعویٰ تھا کہ ''اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیے جائیں تو احیاء العلوم سے میں سب کو دوبارہ زندہ کر دوں گا۔

[1] ''علامہ شبلی۔الغزالی، صفحہ ۴۹

''قطب شاذلی مشہور صوفی گزرے ہیں۔ایک دن وہ احیاء العلوم ہاتھ میں لیے

ہوئے نکلے اور لوگوں سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا کتاب ہے، یہ کہہ کر اپنے جسم پر کوڑوں کے نشان دکھائے اور کہا کہ پہلے میں اس کتاب کا منکر تھا، آج شب کو امام غزالی نے مجھ کو خواب میں آنحضرت کے دربار میں پیش کیا اور اس جرم کی سزا میں مجھ کو کوڑے لگائے گئے شیخ محی الدین اکبر کو زمانہ جا[illegible] ہے وہ احیاء العلوم کو کعبے کے سامنے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے

احیاء العلوم [illegible] مفید علوم اسلامی کا شہ پارہ کہہ سکتے ہیں جن میں امام غزالی یدِ طولیٰ رکھتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں عام رواج اور قبولیت کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ ابن خلدون کا خیال ہے کہ امام غزالی نے دوسرے صوفیا کے برخلاف۔ دونوں طریقوں کو جمع کیا ہے۔ یعنی ورع اور اقتداء کے ساتھ ارباب حال کے آداب وطریقے بھی بتائے ہیں، تصوف کی اصطلاحوں کی وضاحت اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔ اس طرح تصوف باضابطہ ایک فن بن گیا، اس سے پہلے تصوف کا پہلا طریقہ عبادت تھا اور اس کے اسرار لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھے

یہاں سے یہ جان لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ صحیحین اور مستند سنن کی تالیف وترتیب دسویں صدی کے بالکل آغاز میں مکمل ہو چکی تھی، لیکن امام غزالی نے حدیث کا فن اثنائے تحصیل علم میں نہیں سیکھا تھا، انتقال سے چند سال پہلے اس کی تکمیل کا خیال آیا اور انھوں نے حافظ عمر بن ابی الحسن الرداسی سے جو اتفاق سے طوس آگئے تھے سے علم حدیث حاصل کیا اور صحیح بخاری ومسلم کی سند لی، کہا جا سکتا ہے کہ مسلسل مجاہدات وریاضیات کے دوران، جو بادیہ پیمائی کے دور میں انھوں نے کیے تھے اس سے ان کی دل کی صفائی ہو گئی تھی اور شاید تصوف ہی کو وہ روحانی نجات کا واحد ذریعہ سمجھنے لگے تھے، لیکن خیال گزرتا ہے کہ زندگی کے چند آخیر برسوں [illegible] سے وہ کچھ غیر مطمئن سے تھے۔ اسی لیے حدیث کے مطالعے میں مصروف ہو گئے:::::اور اسی راستے سے مذہب، اس کی حقیقت اور اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کو سمجھنے میں وہ کامیاب بھی ہو گئے۔

امام غزالی کا انتقال ۱۱۱۱ء میں ہوا، یعنی بارہویں صدی عیسوی کے اوائل ہی سے نہیں بلکہ اس سے ذرا کچھ پہلے ہی سے "سُنی اسلام" کے خیالات وعقائد پر ان کے فکر ونظر کی چھاپ پڑنے لگی تھی، اس کے بعد سے سُنی اسلام کے مشہور مصنف وشارح، خواہ ان کا تعلق علم الکلام سے ہو یا مذہب سے، خواہ صوفیانہ شاعری سے ہو یا اخلاقی ادبیات سے (خاص طور سے مشرقی دنیائے اسلام میں) تقریباً سبھی پر امام موصوف کا اثر ہے۔ ڈاکٹر شور نے صحیح لکھا ہے کہ "عقائد نسفی" مقاصد، مواقف اور ان کے شروح، مسامرہ اور تمہید وغیرہ امام ہی کے بیان کردہ اصول وعقائد کی تشریح ہیں۔ اشاعرہ کے عقائد اور اس وقت عالم اسلام کے سب سنی مسلمانوں کے عقائد امام کے سمجھائے ہوئے عقائد کے آئینہ دار ہیں۔ صوفیاء کرام اور حکمائے اسلام اسی الٰہیات کے پیرو ہیں جس کو امام نے شریعت سے تعبیر کیا ہے

"شیخ اکبر، مولانا روم، صدر الدین شیرازی، اور شاہ ولی اللہ وغیرہ امام کی دعوتِ فکر کے تابع ہیں۔

اخلاقی تصنیفات میں اخلاقِ ناصری، خلاقِ جلالی اور اخلاق محسنی متداول کتب کیمیائے سعادت کی تشریح اور امام کے قائم کردہ خطوط پر مبنی ہیں۔

"فرید الدین عطار، سعدی شیرازی، حافظ اور عراقی وغیرہ کے خیالات میں امام کے طرزِ تصوف کے اثرات کارفرما ہیں۔[۱]"

ہماری پچھلی معروضات سے اس کی وضاحت تو ہو چکی ہے کہ امام غزالی نے فلسفے کا ابطال کیا، اور معذرت خواہانہ اور مدافعانہ انداز میں نہیں' بلکہ فلسفے کا تفصیلی وتنقیدی مطالعہ کر کے اور آگے بڑھ کر اس کی کمزوریوں کو ظاہر کیا' اور اس کے مفروضات کی بنیادوں کو ہلا دیا' اور چونکہ یہاں بحث امام غزالی کی اخلاقی تعلیمات سے ہے اس لیے اب ہم یہ دیکھیں گے کہ انھوں نے اپنے گردوپیش کی زندگی ومعاشرت کا کس طرح پوسٹ مارٹم

کیا' اوراس کا اسلامی واخلاقی جائزہ لے کر اصلاح وتجدید کے لیے کس انداز میں اپنے قلم سے کام لیا۔ یہاں ہم فلسفہء اخلاق سے بھی بحث نہیں کریں گے کہ اس کے ڈانڈے یونانی افکار وآراء سے ملانے ہوں گے اور یہ بتانا ہوگا کہ کس طرح یونانی علوم مسلمانوں میں پھیلے، اورایک گروہ' مثلاً معتزلہ اوراخوان الصفاوغیرہ کا مسلمانوں میں پیدا ہوا جس نے 'دین' سے قطع نظر 'عقل' کو جانچ کا پیمانہ بنایا۔ اس موضوع پر کئی کتابیں اُردو میں بھی اچھی نکل چکی ہیں' اوران کے علاوہ مضامین کی شکل میں بھی بہت کچھ موجود ہے۔

ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اشاعرہ نے معتزلہ کے مقابلے میں اصول دین پر زور دیا اوراسی کا اثر تھا کہ امام غزالی نے اپنی کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد میں بڑے گونجتے ہوئے لفظوں میں یہ بات کہی کہ 'عقل محض' کی مدد سے کوئی عام اور ہمہ گیر اخلاقی اصول ترتیب نہیں دیا جاسکتا۔ یہ گویا معتزلی عقیدے کے علی الرغم شریعت میں اخلاق کے نظریے کو دوبارہ شامل کرنا تھا کیونکہ دوسری صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے اس حقیقت کو لوگ بھول چلے تھے۔ فطری عقلیت سے انفرادی ضمیر کا سلسلہ ملا ہوا ہے اوراس کے نتیجے کے طور پر خیر وشر محض اضافی ہوکررہ جاتے ہیں، جواعلیٰ سطح پر مذاہب کا منشا نہیں ہوتا، کیونکہ اس سے اخلاقی انحطاط کے پھیلنے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ معتزلہ نے عقلیت پسندانہ اخلاق عامہ کے اس تصور کی شدید مخالفت کی ،لیکن امام غزالی نے بھی اس شدّت سے اپنے ردّعمل کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر 'عقل محض' اپنی فطری صورت میں کوئی بنیادی اخلاقی اصول دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی، تو پھراس میں یہ صلاحیت اور کمتر درجے پر ہوگی کہ واجبات کی تشکیل کرکے انسانی زندگی کو سُدھارے۔ اخلاقی اصول اورواجبات دونوں خدا کی رحمتِ عامہ اور قدرتِ کاملہ سے ماخوذ ہونے چاہئیں، یعنی شریعت کوان کی بنیاد ہونا چاہیئے ،فرائض اور واجبات کا سرچشمہ ہرصورت میں عقل نہیں بلکہ شریعت ہی ہوسکتی ہے۔ اس طرح شریعت میں اخلاق اورقانون دونوں چیزیں شامل ہیں' لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم الکلام یا علم

دینیات کیا شریعت میں شامل نہیں؟ یہ مشکل سوال تھا لیکن امام غزالی نے ''آرتھوڈکس'' تصوف کی ابتدائی شکل اِکی خصوصیات سے فائدہ اُٹھا کر علم الکلام اور شریعت میں ایک متوازن سمجھوتے کی بنیاد ڈالی۔ امام صاحب خود علم الکلام کی منطقی خارجیت اور رسمیت سے غیر مطمئن تھے اور خالص عقلیت پسندانہ عقائد کو اس قابل تصور نہیں کرتے تھے کہ ان پر عمل کیا جائے، اس لیے انھوں نے صوفی اندازِ فکر اور طرزِ عمل کو علم کلام کے مفروضات سے ہم آہنگ کر کے عقیدہ کو دل کا معاملہ بنا دیا یعنی یکسوئی سے بھرپور خدا سے جذباتی عقیدت اور تعلق کا معاملہ اور اسے انھوں نے شریعت کا اصل مفہوم قرار دیا۔

دین کی اس داخلیت اور دل سرگشتگی کو امام صاحب نے دین سے تعبیر کیا اور اس طرح دین شریعت کی اصل قرار پایا' یعنی اسرار شریعت جو انسان کی داخلی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں' شریعت دین کے بغیر ایک بے مغز خول ہے اور ظاہر ہے کہ دین بغیر شریعت کے قایم نہیں رہ سکتا۔ قرونِ اولیٰ میں صورت حال یہی تھی' اور دین وشریعت کی یکجہتی ابھی دوئی میں نہیں تبدیل ہوئی تھی' لیکن تاریخ اور واقعات کے دھارے نے جب قرن اول اور امام غزالی کے عہد کے درمیان صدیوں کا فاصلہ پیدا کر دیا' تو یہ مشکل نظر آنے لگا، بلکہ ناممکن سا ہو گیا کہ صدر اول کی دینی اقدار کی انفرادیت کے کسی حصّے کو بھی برقرار رکھا جا سکے' اس لیے یہ امر بڑی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے کہ امام صاحب نے اپنے سب سے بڑے علمی کارنامے کو احیاء علوم الدین کا نام دیا' اسے علم شریعت کا احیاء نہیں کہا۔ لیکن درحقیقت یہ راستہ بڑا تنگ اور نازک تھا' علم اسرار دین کے نام سے لفظ پرستوں اور ظاہر بینوں کے خلاف، بعد میں صوفیوں کے جو علمی معرکے ہوئے اس نے تصوف اور شریعت کی کش مکش کو بہت گہرا کر دیا۔[۲]

عظمت وحشمت اور جاہ وعزّت کی زندگی گزار کر گیارہ سال کی صحرا نوردی، مجاہدہ وریاضت کے بعد جو کچھ امام غزالی کو بارگاہِ الٰہی سے ملا' اسے انھوں نے نہایت دردمندی

سے اور اپنے قلب کی ساری خستگی اور برشتگی کے ساتھ احیاء میں پیش کر دیا' احیا کسی فلسفی کی نظری اور وضعی بحث نہیں، یہ ایک تڑپتے ہوئے دل کی آواز ہے جسے اس کا مصنف انحطاط و زوال کے مارے اپنے معاشرے کے باضمیر افراد تک پہنچانا چاہتا ہے۔ گذشتہ صفحات میں دل کی زندگی کا جوذکر آیا ہے وہی احیاء العلوم کا مقصد ہے' امام موصوف میں چونکہ شان مجددیت تھی اس لیے وہ فلسفی کے ہاتھی دانت کے بنے مینار سے اتر کر اپنے کمزور' خستہ حال اور زوال آمادہ معاشرے میں آئے جہاں عالم اور صوفی سے لے کر ایک عامی تک سبھی اخلاقی خرابیوں میں ڈوبے ہوئے تھے' وہ کیوں آئے' اس کا حال خود انھیں کی زبان میں سنیے جسے مولانا علی میاں نے اچھی اُردو میں ڈھال دیا ہے:

> مجھ محسوس ہوتا ہے کہ اگر چہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے، لیکن درحقیقت اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے۔ میری اس پہلی اور دوسری حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا جو حصولِ جاہ کا ذریعہ ہے اور میں اپنے قول و عمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا' اور یہی میرا مقصود و نیت تھی' لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں جس سے جاہ سے دستبردار ہونا پڑتا ہے' اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا ہوں' مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہنچوں گا' یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا' لیکن یقین اور مشاہدے کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے' اسی سے آدمی گمراہی اور شر سے بچ سکتا ہے اور ہدایت و طاعت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے، دراصل میں نے اپنی طرف سے حرکت نہیں کی ہے' اللہ مجھے حرکت میں لایا ہے' میں نے خود کام نہیں شروع

کیا ہے' اللہ نے مجھے کام میں لگایا ہے۔ میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے' پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح ہو' پہلے مجھے راہ پر لگائے' پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے' حق مجھ پر منکشف ہو جائے اور اُس کے فضل سے مجھے اتباع کی توفیق ہو' باطل مجھ پر واضح کر دے اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے۔''[۱]

احیاء العلوم سفر کے دوران لکھی گئی لیکن امام غزالی نے بڑی دیانتداری کے ساتھ اس بات کو ظاہر کر دیا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تصنیف میں رسالہ قشیریہ' قوت القلوب لابو طالب مکی اور ذریعہ الی علم الشریعۃ للراغب الاصفہانی سے پوری طرح استفادہ کیا ہے' اِن کے علاوہ ابن سینا اور ابن مسکویہ کی تصنیفات کو احیاء العلوم سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو گوہر سے' سنگ کو آبگینے سے' کاسہ سفالیں کو جام جم سے ہے[۲]۔''

امام صوف نے اس کتاب کے دیباچے میں اپنے دل کی بے چینی کو ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا میں اخلاقی بیماریاں پھیل گئی ہیں اور جو طبیب ہو سکتے تھے وہ خود ان میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس دیباچے کے شروع کا ایک ٹکڑا ہم علامہ شبلی کی زبان میں نقل کرتے ہیں' اُردو داں جو عربی سے واقف نہیں پورے دیباچے کو مذاق العارفین (ترجمہ احیاء علوم الدین' از مولوی محمد احسن نانوتوی مطبع نامی نشی نول کشور' فروری ۱۹۰۰ء) میں دیکھ سکتے ہیں' علامہ شبلی اپنی انشاء کے سہارے لکھتے ہیں:۔

''میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھا لیا ہے اور سعادت اُخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں، علماء جو دلیل راہ تھے، زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے، اور جو رہ گئے ہیں۔ وہ نام کے عالم ہیں جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اور جنھوں نے تمام عالم کو یقین دلا دیا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے۔ مناظرہ (جو فخر و نمود کا

ذریعہ ہے) وعظ و پند (جس میں عوام کی دلفریبی کے لیے رنگین اور مسجع فقرے استعمال کیے جاتے ہیں) فتویٰ دینا جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے اور لوگ اس کو بھول بھلا چکے۔ یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور مُہر سکوت ٹوٹ گئی۔"[۱]

امام غزالی نے شریعت محض کے مقابلے میں دین کو اچھی اخلاقی زندگی کی اساس تصور کیا' اور پھر جو اپنا اور دوسروں کا حال دیکھا تو ہر قسم کے اخلاقی معائب سے اسلامی معاشرے کو خستہ حال پایا۔ اس میں دوبارہ جان ڈالنے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کو خاص طور سے علما' فقہا' مناظروں' اور صوفیوں وغیرہ کو دین کی روح تک پہنچنے اور اپنے اخلاق کو جانچنے کی طرف متوجہ کیا۔ علماء سوسائٹی کا نمک ہیں' اگر نمک ہی نہ ہو تو کھانے کی مزہ کیا۔ علما نے یہ کیا کہ سلطانِ وقت کے ظلم و جبر کی تاویلیں کر کے اپنے دینوی مفاد کو ان کی خوش نودی اور سرکاری عہدوں سے وابستہ کر لیا۔ احیاء العلوم (باب امر بالمعروف) میں امام صاحب نے لکھا ہے کہ "رعایا اسی وجہ سے ابتر ہو گئی کہ سلاطین کی حالت بگڑ گئی اور سلاطین کی حالت اس وجہ سے بگڑی کہ علما کی حالت بگڑی گئی اور علما کی خرابی اس وجہ سے ہے کہ جان و مال کی محبت نے ان کے دلوں کو چھا لیا ہے۔"

علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"کوئی شخص اگر امام صاحب کے تمام حالات اور خیالات کو غور کی نگاہ سے دیکھے تو اس کو صاف نظر آئے گا کہ امام صاحب کو سب سے زیادہ جس چیز کا رونا ہے، وہ علماء کی حالت ہے۔ یہ آگ ان کے دل میں اس قدر بھری ہوئی ہے کہ ذرا سی تحریک سے فوراً بھڑک اُٹھتی ہے کسی قسم کا ذکر ہو' کوئی بحث ہو' کوئی تذکرہ ہو یہ پُر درد ترانہ خواہ

مخواہ ان کی زبان پر آجاتا ہے اور احیاء العلوم تو سراپا اسی نوحے سے لبریز ہے غرور جاہ۔ ریا وغیرہ عیوبِ نفسانی پر جو مضامین لکھے ہیں سب میں تصریح کی ہے کہ یہ عیوب سب سے زیادہ علما ہی میں ہیں۔"[۱]

ذم الغرور کے عنوان کے تحت امام موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا علماء کیا عُبّاد کیا امراء کیا صوفیا وزہاد سب اس فریب میں مبتلا ہیں کہ وہ مذہبی کام انجام دے رہے ہیں فقہا کی جب مانگ بڑھی تو علم فقہ ہر طرح کے لوگ سیکھنے لگے تفقہ فی الدین کے جو قرآنی معانی تھے، وہ تو لوگ، بھلا بیٹھے، البتہ رفتہ رفتہ سلاطین زمانہ کی بزم میں ایک تماشا بن کر رہ گئے کہ ان میں سے ہر ایک مناظرہ ومباحثہ کے زور سے زیادہ سے زیادہ دُنیا کمالینا چاہتا تھا، اس طرح جن سے تفقہ فی الدین کی توقع تھی وہ بقول امام صاحب دین تو دین شریعت کے تقاضے بھی بھلا بیٹھے اور اپنے اندر تفاخر، حسد، رشک ضد جاہ پرستی حبِ مال فضول گوئی اور قسادتِ قلبی جیسے اخلاقی امراض پیدا کر لیے۔ سلاطینِ وقت کی وظیفہ خواری کے لیے علماء نے ایک دوسرے کی دستار اُچھالی لیکن خود امام صاحب نے جو ایک زمانے میں نہایت مُعجب جاہ پرست اور خود پسند تھے، اپنے دل کی دنیا میں انقلاب کے بعد یہ لکھا کہ

"سلاطین کی تمام آمدنیاں ہمارے زمانے میں کل یا قریبِ کل محض حرام ہیں اور کیوں حرام نہ ہوں حلال آمدنی صرف زکوٰۃ، فَــیٔ اور مالِ غنیمت ہے سو ان کا سرے سے وجود نہیں رہ گیا جزیہ وہ ایسے ناجائز ظالمانہ طریقے سے وصول کیا جاتا ہے کہ حلال نہیں رہتا۔"

قرآن شریف میں کئی موقعوں پر اعتدال کی تعلیم دی گئی ہے اور دیکھا جائے تو خیــر الامــور فــی اوسطھــا کے تحت یہی دین اسلام کا منشا بھی ہے اور یہی صراط مستقیم

بھی۔امام صاحب نے بھی علم اخلاق (چونکہ اس کی بنیاد مذہب پر ہے عقل محض پر نہیں) کا مقصود یہ بتایا ہے کہ انسان کے تمام قویٰ (Faeuities) باقی رہیں لیکن ایمان وعمل سے ان میں اعتدال آجائے۔اس سلسلے میں یوں تو امام صاحب نے تقریباً تمام اخلاقی امراض کا احاطہ کیا ہے، بڑی دقیقہ سنجی سے پوسٹ مارٹم کیا ہے۔یہاں ہم صرف اشارہ کریں گے' قارئین اصل کتاب میں اس موضوع کا ضرور مطالعہ کریں۔یہ مرض ریاکاری کا مرض ہے'امام صاحب نے ریا کی تین قسمیں بتائی ہیں' ریائے جلی' ریائے خفی' ریائے اخفی اور پھر ان تینوں قسموں کی وضاحت کی ہے۔اس مسئلے پر غور کریں تو شاید ہر آئینے میں ہمیں اپنی شکل بھی دکھائی دے۔ایک اور مرض ہے جو امام صاحب کے زمانے میں بھی عام تھا اور آج بھی ہے اور اُسے ہم ''مذہبی خودفریبی'' کہتے ہیں ،اس خودفریبی پر مذہبی رنگ چڑھا ہوتا ہے، جو کام کیا جاتا ہے''مذہبی نیکی سمجھ کر کیا جاتا ہے لیکن تہہ میں کوئی اور چیز ہوتی ہے جو محترم ہوتی ہے''۔اہل علم زہاد ہوں یا حجاج سب اپنے کام نیکی کا کام (الا ماشاءاللہ) سمجھ کر کرتے ہیں جو دولت مند اور ارباب وسائل ہیں، ان کا اپنا الگ ایک ''فرقہ'' بن گیا ہے، ان سے متعلق امام صاحب لکھتے ہیں غور کرو تو یہی صورت حال آج بھی ہے فاعتبروا یا اولی الابصار:

> ''ان میں (ارباب مال) بہت سے لوگ مساجد، مدارس، خانقاہیں تعمیر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ بڑے ثواب کا کام ہے، حالانکہ جس آمدنی سے تعمیر کی ہے وہ بالکل ناجائز طریقوں سے حاصل کی گئی ہے،اور آمدنی جائز بھی ہو تو ان کا مقصود دراصل ثواب نہیں بلکہ شہرت اور نام وری ہوتی ہے۔اسی شہر میں ایسے ارباب حاجت موجود ہوتے ہیں جنکی خبر گیری کرنی، مسجد بنانے سے زیادہ موجب اجر ہے، لیکن ان کے مقابلے میں یہ تعمیرات کو ترجیح دیتے ہیں جس کی وجہ صرف یہ

ہوتی ہے کہ تعمیرات سے جو دیرپا شہرت حاصل ہوتی ہے وہ مساکین کے دینے سے نہیں ہو سکتی، مساجد وغیرہ کی تعمیر میں زرِ کثیر نقش نگار، مینا کاری، زیب و آرائش میں صرف کیا جاتا ہے، حالانکہ مسجد کا مقصود ادائے عبادت ہے، نہ اظہارِ شان و شوکت۔

''بہت سے لوگ خیرات و زکوٰۃ میں ہزاروں روپے صرف کرتے ہیں، اذنِ عام دیا جاتا ہے، ہزاروں فقرا جمع ہوتے ہیں جو خیرات لیتے ہیں اور مجمع سے نکل کر تعریفیں کرتے جاتے ہیں، بعض سمجھتے ہیں کہ حرمین میں خیرات کرنے سے زیادہ ثواب ملے گا۔ اس غرض سے حج پر حج کرتے ہیں اور وہاں جا کر ہزاروں روپے خیرات کرتے ہیں، حالانکہ اس تمام داد و دہش کا اصلی محرک شہرت اور نام وری ہوتی ہے، ورنہ اگر محض تحصیلِ ثواب مقصود ہوتا تو اعلان و اشتہار کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح چپکے سے دیتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔(۱)

اس موقع پر ہمیں سورہ التوبہ کی تین آیتیں یاد آتی ہیں۔ جو ہماری اصلاح کے لیے آج بھی اتنی ہی مفید ہیں جتنی کہ نہ صرف امام غزالی کے عہد میں تھی۔ بلکہ اس وقت بھی جب قرآن کریم نے اہل مکہ کی تنذیر و تذکیر کی تھی، وہ آیتیں تسلسل کے ساتھ یہ ہیں۔

''مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰىٓ اَنْفُسِهِم بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِي

سَبِیْلِ اللّٰہِ لاَ یَسْتَوٗنَ عِنْدَاللّٰہِ وَاللّٰہُ لاَیَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ o۱؎

یہاں بحث کافر ومومن، مشرک ومومن کی نہیں ہے۔ بلکہ ان آیات کی تشریح میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اسے بیان کرنا مقصود ہے تاکہ ہمیں اپنے اخلاق و اعمال کا جائزہ لینے میں مدد ملے اور یہ بھی کہ ہمیں کیوں برائیوں سے بچنا چاہئے اور کیوں اچھی باتیں اختیار کرنی چاہئیں۔ اخلاص ہی تمام اعمال صالحہ ہی کی بنیاد ہے نہ کہ نمود ونمائش جو محض ریکاری ہے کہیں خفی کہیں جلی۔ امام غزالی نے نہایت وضاحت سے لکھا ہے: رویم کا قول ہے کہ اخلاص کے یہ معنی ہیں کہ کام کا معاوضہ، دنیا یا آخرت میں کہیں نہ چاہا جائے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لذت نفس خواہ دنیا میں ہو، یا آخرت میں، آفت ہے جو عابد اس غرض سے عبادت کرتا ہے کہ بہشت کے مزے اٹھائے گا وہ بیمار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہونا چاہئے۔

''باقی جو شخص جنت کی امید اور دوزخ کے خوف سے عبادت کرتا ہے وہ فوری نفع کے لحاظ سے مخلص کہا جا سکتا ہے لیکن دراصل وہ شکم پرست اور زن پرست ہے۔'' پس سارا معاملہ خلوص اور اخلاص نیت کا ٹھہرا۔ اب دیکھیے مولانا آزاد مذکورہ بالا آیات کے سلسلے میں کیا کہتے ہیں: ''(خانہ کعبہ) پرستاران توحید کی عبادت گاہ تھی اور اب آیندہ بھی انھیں کے لیے مخصوص رہے گی..... قریش مکہ کو خانہ کعبہ کی مجاوری اور حاجیوں کے کاروبار کے منصرم ہونے کا بڑا غرور تھا اور جب ایک جماعت اعتقاد وعمل کی حقیقت سے محروم ہو جاتی ہے تو اسی طرح کے رسوم ومظاہر کو ہر طرح کی بزرگی وسعادت کا ذریعہ سمجھنے لگتی ہے۔ چنانچہ آج کل مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ کسی بزرگ کی سجادہ نشینی، کسی مزار کی مجاوری' کسی زیارتی گاہ کا متولی ہونا جو اثر ورسوخ رکھتا ہے' وہ بڑے سے بڑے اور بہتر سے بہتر مومن ومتقی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک صالح ومتقی مسلمان کو کوئی نہیں پوچھے گا' لیکن ایک بدعمل مجاور یا متولی درگاہ کی ہزاروں آدمی قدم بوسی کریں گے۔''

کہنا صحیح ہے کہ "انھوں (امام غزالیؒ) نے کوئی نیا تصور نہیں پیش کیا بلکہ اس کی تعلیم دی کہ ابتدائی دور کی اعلیٰ ذہنیت اور مزاج کو دوبارہ پیدا کیا جائے۔ اس ذہنیت اور مزاج کے نقشے کو انہوں نے بہر حال دوبارہ اجاگر کیا جبکہ وہ دلوں میں مٹ سا گیا تھا، اور اس میں تصوف کے تصورات کو شامل کر کے اس کی معیت میں اور اضافہ کر دیا۔ انہوں نے نفاق پیدا کرنے دینیات کی بحثوں اور مدرسوں کی خود پسندانہ دانش وری سے منہ موڑ لیا اور اس کی کوشش کی کہ ان کے ہم مذہب ایمان کی گہرائیوں کی طرف متوجہ ہوں، اس ایمان کی طرف جو متحد کرتا ہے، اس عبادت کی طرف جس کی سجدہ گاہ دلوں میں ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے اور عمل پر تصوف کا یہی سب سے نمایاں اثر تھا"۔ ا

اسلام کی اخلاقی تعلیمات

علم کا بیان

اس فصل میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی کہ علم میں اور اس کے طلب کرنے میں کیا کیا فضائل ہیں؟ اس میں کچھ ایسے دلائل کا ذکر ہوگا جن کی بنیاد عقل پر ہوگی اور کچھ ایسے ہوں گے کہ جن کی بنیاد واقعات اور قرآن وحدیث پر ہوگی۔

علم کی برتری اور بلندی کا ذکر خدا نے اپنی کتاب میں اس طرح فرمایا ہے "کیا علم رکھنے والے اور بے علم والے برابر ہو سکتے ہیں؟" علم وحکمت سے شریف انسان کا مرتبہ اور بھی اونچا ہوتا ہے اور ادنیٰ یا غلام قسم کے آدمی کو علم کو شرافت سے وہ مقام مل جاتا ہے کہ وہ بادشاہوں کی جگہ پالیتا ہے، تمام انسانوں میں بہترین عالم وہ ہے جس کے پاس لوگ اگر اپنی کوئی ضرورت لے کر جائیں تو وہ ان کی ضرورت پوری کر دے اور اگر لوگ اس سے بے پرواہ ہوں تو وہ بھی اپنے نفس کو سب سے بے پرواہ رکھے۔ علم ہی تمام نیکیوں کی اصل اور ایمان کا پھل ہے۔ محض ایمان تو ایک خالی سی چیز ہے۔ انسان کے اندر تقویٰ اور پاکیزگی ہو تو وہی اس ایمان کے لئے ایمان لباس ہے اور انسان میں غیرت ومروت ہو تو ایمان کو اس سے حسن وآرائش ملتی ہے اور علم ہو تو گویا ایمان کی تکمیل ہوگئی۔ ایک انسان کی اس سے بڑی خوبی کیا ہوگی کہ وہ اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ "عالم زمین پر خدا کی امانت کا امین ہوتا ہے"۔ عالم کا مرتبہ ایک جاہل عابد وزاہد کے مقابلے میں بہت بلند مانا گیا ہے، انسان خواہ کیسا ہی نیک کام کرے علم حاصل کرنے والے کے مقابلے میں اس کا درجہ نہیں بڑھ سکتا، علم کے ساتھ ساتھ کوئی شخص معمولی سا عمل یا نیک کام کرتا ہے تو جہل کے ساتھ ساری زندگی کے عمل سے بہتر ہے۔ اس لیے عمل میں بھی سب سے بہتر علم ہے۔

تمام رات کی عبادت سے بہتر ہے کہ چند گھنٹے علم میں غور وفکر کرے۔ اگر مریض کو دوا نہ دی جائے اور اس پر توجہ نہ کی جائے تو وہ مر جائے گا یہی دل کا حال ہے اگر دل کو تین دن بھی علم وحکمت نہ ملے تو وہ مر جاتا ہے، دل کی غذا علم وحکمت ہے، اگر دل علم وحکمت کی طلب نہیں کر

رہا ہے تو وہ مریض سمجھا جائے گا، جس طرح ایک انسان جب بیمار ہوتا ہے تو اسے غذا کی طلب نہیں رہتی۔ اور بات ہے کہ بے حسی کی وجہ سے کسی کو اپنے دل کی بیماری اور موت کا علم نہ ہو چونکہ وہ دنیا کی محبت میں مشغول ہونے کی وجہ سے دل کی طرف سے غافل ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ انسان اگر کسی بڑے معاملے میں الجھا ہوا ہے یا اس پر شدید خوف یا نشے کی کیفیت طاری ہے، ایسے وقت میں اسے کوئی زخم پہنچ جائے تو اگر چہ زخم میں تکلیف ہے مگر اسے اس وقت احساس نہ ہوگا لیکن جب یہ کیفیات ختم ہوتی ہیں یا اس کا ذہن اپنی مشغولیت سے فارغ ہوتا ہے تب اسے زخم کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح انسان جب موت سے ہمکنار ہوتا ہے، دنیا اور اس کا نشہ اس کے دل و دماغ سے کم ہوتا ہے تب اسے خیال ہوتا ہے کہ اس کا دل کس قدر مردہ ہے کہ اسے کسی خوبی اور اچھائی کا احساس تک نہیں ہے۔ علم ہی وہ دولت ہے جس کو جمع کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے، کشتی پر ہو تو ڈوبنے کا غم نہیں، راستے میں رہزنی کا کھٹکا نہیں ہے اور یہ دولت موت تک بلکہ موت کے بعد ساتھ رہتی ہے۔ ذخیرہ اندوزی کے لائق۔ یہی دولت ہے، علم کی شرافت کی وجہ سے اگر کسی شخص کو معمولی بات کے لیے کہا جائے کہ آپ کو اس بات کا علم نہیں، آپ اس سے ناواقف ہیں تو بہت برا لگے گا، اور نہایت معمولی چیز کے لیے کسی کو کہا جائے کہ آپ یہ بات جانتے ہیں تو وہ خوش ہوگا، فخر محسوس کرے گا، علم کے بعد ہی انسان کو برے بھلے کی تمیز ہوتی ہے، تب وہ برائی سے بچنے کی اور بھلائی کو حاصل کرنے کی بار بار کوشش کرتا ہے۔ خدا بھی ایسے شخص پر مہربان ہوتا ہے جو برائی کے بعد توبہ کر لیتا ہے اور یہ توبہ یا برائی سے بچنے کی سعادت اسے علم ہی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے، جاہل کو احساس بھی نہیں ہوتا اور وہ برائیوں کے چکر میں پھنسا رہتا ہے، ایک شخص نہایت ذلت کی حالت میں زندگی گزار رہا تھا اسے خود بخود احساس ہوا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے لوگوں میں عزت بڑھے، اس نے علم حاصل کرنا شروع کیا اور کچھ دنوں میں اپنے وقت کا امام بن کر مشہور ہوا، علم سے اللہ پاک دلوں کو اس طرح زندہ کرتا ہے جیسے

موسلا دھار بارش سے زمین میں تازگی آجاتی ہے، علم حاصل کرنا بہادری اور شیوۂ مردانگی ہے، اس لیے بہادر ہی علم حاصل کرتا ہے اور ہمت والا اس کام کو انجام دیتا ہے۔

علم طلب کرنے کی فضیلت

بڑائی اور فضیلت ہر اس شخص کے لیے ہے جو عزم اور حوصلے کا مالک ہو، اپنے ملک، اپنی قوم اور وطن سے نکل کر علم حاصل کرتا ہو اور علم کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات اور تکلیفیں برداشت کرتا ہو۔ علم کے رستے میں سو سو طرح کی رکاوٹیں آتی ہیں سب کو ہوشیاری سے ہٹاتے رہنا چاہئے، کبھی نیکی اور عبادت کی خواہش ہوتی ہے اس میں مشغول ہو کر طالب علم پڑھنے کے اوقات خرچ کر دیتا ہے، ایسے وقت میں ہوشیار رہنا چاہئے طالب علم کی سب سے بڑی عبادت تعلیم کی مشغولیت ہے۔ علم ایک خزانہ ہے۔ اس خزانے کی کنجی کا سوال کرنا ہے، اس لیے علم کے لیے زیادہ سے زیادہ سوال کرنا چاہیے۔ سوال کرنے یا کسی سے کچھ پوچھنے میں کبھی شرم نہ کرے۔ علمی سوالات میں شرم کرنا علم سے محرومی کا سبب ہوتا ہے۔ سوال کرنے کا فائدہ چار آدمیوں کو پہنچتا ہے، اول سائل کو، دوم اس عالم کو جس نے سوال کا جواب دیا ہے، تیسرے سننے والے کو جو ان دونوں کے سوال و جواب کو سن رہا ہے، چوتھے اس شخص کو جو ان دونوں کو اور ان کے سوال و جواب کو پسند کرتا ہے، جاہل کو چاہئے کہ اپنی جہالت پر خاموش نہ رہے یعنی سوال کر کے اپنی جہالت کو دور کرے، اسی طرح عالم اپنے علم پر خاموش نہ رہے۔ جاہلوں کو سمجھا کر راستے پر لگاتا رہے، علم ہی انسان کو ہر قسم کی بزرگی و شرافت پر پہنچاتا ہے ظاہر ہے جو علم نہ حاصل کرے گا اس کا نفس کسی اچھائی کی طرف کیونکر اس کی رہبری کر سکتا ہے، بعض عقلمندوں کا قول ہے کہ دو شخصوں کی حالت بہت قابلِ رحم ہے، ایک وہ جو علم کی طلب میں لگا ہو مگر اس کا ذہن بہت اچھا نہ ہو اور وہ زیادہ حاصل نہ کر سکتا ہو دوسرا وہ جس کا ذہن بھی اچھا ہو مگر وہ علم حاصل نہ کرتا ہو، عالم اپنے علم سے خدا کی مخلوق کو جو فائدہ پہنچاتا ہے۔ وہ عابد و زاہد کو نصیب نہیں، اس

لیے عالم کا درجہ عابد شب بیدار سے کہیں زیادہ ہے۔ ابن عبدالحکم ایک بزرگ امام شافعیؒ کے پاس پڑھتے تھے ان کا بیان ہے کہ ایک بار ظہر کی اذان سن کر میں نے کتاب بند کر دی اور نماز کے لیے چلا۔ امام صاحب نے فرمایا ''میاں! تم نے کتاب بند کیوں کر دی، اگر تمہاری نیت درست اور صحیح ہے تو جو کام تم کر رہے تھے وہ زیادہ افضل تھا بہ نسبت اس کام کے جس کے لیے تم جانا چاہتے ہو یعنی جب تم عبادت کا صحیح طریقہ علم کے ذریعے جان لوگے تبھی تو تمہاری عبادت قبول ہوگی اور تبھی تو تم دوسروں کی اصلاح کر سکو گے۔ زندگی کا سب سے بڑا جہاد علم حاصل کرنا ہے، پھر اس پر عمل کرنا ہے۔

دوسروں کو تعلیم دینے کی فضیلت

جس طرح تعلیم حاصل کرنا اور خود کو جہالت کی برائی سے نکالنا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو گمراہی اور جہالت سے نکالا جائے، علم کی روشنی پھیلائی جائے، نرمی اور دانائی کے ساتھ لوگوں کو نیک باتوں کی طرف بلایا جائے، آدمی جب کچھ جان لیتا ہے اسے علم حاصل ہوتا ہے تو اس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے علم کو چھپا کر نہ رکھے دوسروں کو پہنچاتا رہے ورنہ علم ختم ہو جائے گا۔ علم ختم ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ علما ہی نہ رہیں یہاں تک کہ جہلا عام مسائل پر زبان کھولنے لگیں اور خود بھی بہکیں دوسروں کو بھی بہکائیں ایک شخص دوسرے کو اس سے بہتر فائدہ کیا پہنچا سکتا ہے کہ اسے کوئی عمدہ بات یا عمدہ حکمت سکھا دے۔ دو مجمعے الگ الگ بیٹھا ہوئے تھے، ایک جماعت کے لوگ عبادت اور دعا میں مصروف تھے، دوسری جماعت لوگوں کو تعلیم دے رہی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا پہلی جماعت کے لوگ خدا سے اپنا مطلب مانگ رہے ہیں، خدا کی مرضی ہے انہیں دے یا نہ دے، اور دوسری جماعت کے لوگ دوسروں کو تعلیم دے رہے ہیں، فائدہ پہنچا رہے ہیں، پھر آپؐ دوسری جماعت کے قریب بیٹھ گئے۔ علم و ہدایت کی مثال ایسی ہے کہ جیسے آسمان سے خوب پانی برسا، زمین کے ایک ٹکڑے میں وہ پانی جذب ہو گیا۔ وہاں

خوب پیڑ پودے اگ آئے دوسرا ٹکڑا زمین کا ایسا ہے کہ اس نے پانی کو روک لیا تا کہ لوگ اس سے نفع حاصل کریں، کھیتوں کو سیراب کریں تیسرا ٹکڑا وہ ہے کہ نہ خود پانی کو جذب کرے نہ دوسروں کو فائدہ پہنچائے پہلی مثال ان لوگوں کی ہے جو علم سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں، دوسری مثال انکی ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، تیسری مثال ان کی ہے جو دونوں سے محروم ہیں۔ بہترین انسان وہی ہے کہ خود بھی اپنے علم سے اپنی اصلاح ودرستگی کا خیال رکھے اور دوسروں کو بھی فیض پہنچائے۔ انسان کی نیکی اور بھلائی کا سلسلہ اس کی زندگی تک رہتا ہے، موت کے بعد ظاہر ہے یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے لیکن اگر اپنے علم سے کوئی شخص کسی کو فائدہ پہنچا گیا ہے تو جب تک اس فائدے کا سلسلہ ایک سے دوسرے کو دوسرے سے تیسرے کو منتقل ہوتا رہے گا اس پہلے شخص کے لیے خیر و بھلائی کا سبب ہوگا۔ کیونکہ بھلائی کی تعلیم دینے والا مثل اس کے کرنے والے کے ہوا کرتا ہے۔ دو شخص ایسے ہیں جن کو دیکھ کر انسان حسرت کر سکتا ہے کہ کاش ہم بھی ایسے ہو جائیں، ایک وہ عالم جو اپنے علم پر عمل کرتا ہو، دوسرا وہ مال دار جو اپنا مال و دولت خیرات کرتا ہو، علماء اپنے عہد کے چراغ ہوتے ہیں جو اپنے اپنے زمانوں میں روشن ہوتے ہیں اور ایک دنیا کو منور رکھتے ہیں۔ علما ہی انسانوں کو حیوانیت سے نکال کر انسانیت تک پہنچاتے ہیں، عقلمندوں کا کہنا ہے " علم کی ابتدا سکوت سے ہوتی ہے، انسان خاموش رہ کر سنتا رہے پھر یاد کرلے، پھر جو کچھ یاد کیا ہے اس پر عمل کرے اور تب موقع آتا ہے کہ لوگوں کو بتلائے، سکھلائے " انہوں نے یہ بھی کہا۔ علم سیکھو، علم سیکھنا! خوف الٰہی، علم کی جستجو! عبادت، علم کا پڑھنا پڑھانا! خدا کا ذکر، علم تنہائی میں بہترین انیس، سفر میں ہم سفر، خلوت کا دوست، حالت مفلسی اور حالت مال داری میں شمع ہدایت، دشمنوں کے سامنے کارگر ہتھیار، دوستوں کے لیے مددگار، علم دل کے لیے زندگی کا سامان ہے اور جہالت کی موت سے دل کو دور رکھنے والا ہے۔ عالم سے سبھی لوگ محبت کرتے ہیں کیوں کہ ایک سچا اور صحیح عالم خود بھی سب سے محبت کرتا ہے۔ دلوں کی تاریکی

علم کے نور سے دور ہو جاتی ہے۔ بدن کو ظاہری قوت اور دل کو باطنی قوت نصیب ہوتی ہے۔ علم میں انہماک، علم میں مشغول رہنا یہ سب عبادت ہے۔ ایسی عبادت جس کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچ سکتا ہے۔ علم امام ہے اور عمل اس کا تابع، اور یہ دونوں چیزیں اچھے انسانوں کو حاصل ہوتی ہے۔

فضیلت علم کے بعض عقلی دلائل

یہاں سے علم کی فضیلت کے کچھ عقلی دلائل ذکر ہوں گے۔ مگر پہلے فضیلت کو جان لو جب تک خود فضیلت نہ معلوم ہوگی اس وقت تک علم کی فضیلت کیا سمجھ میں آئے گی۔ جیسے یہ معلوم کرنا ہو کہ ''زیاد حکیم ہے'' تو پہلے حکمت کا علم ہونا چاہئے۔ فضیلت فضل سے نکلا ہے جس کے معنی زیادتی کے ہیں۔ یعنی ایک ہی قسم کی دو چیزوں میں کسی وصف کا لحاظ کر کے یہ دیکھا جائے کہ یہی وصف ایک جگہ کم ہے ایک جگہ کچھ زیادہ تو جس جگہ زیادہ ہوگا اس کو فضیلت حاصل ہوگی، معلوم ہوا فضیلت ایک اضافی صفت ہے۔ اضافی کا مطلب یہ کہ دوسرے کے مقابلے پر دیکھا جائے تو بخوبی کا اندازہ ہوتا ہے لیکن علم میں جو فضیلت ہے وہ اس قاعدے سے الگ ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہیں گے کہ کوئی دوسری چیز اس کے مقابلے پر ہو تب علم کی خوبی معلوم ہوگی۔ ورنہ نہیں کیونکہ علم میں جو خوبی اور جو فضیلت ہے وہ علم کی ذاتی ہے، جیسے سورج کی روشنی ذاتی ہے، اس کو اپنے نور کے لیے کسی مقابل کی ضرورت نہیں ہے۔ علم کو تنہا دیکھیے یا کسی اور صفت کے مقابلے پر رکھیے اس کا کمال ہر حال میں پایا جائے گا۔ اب ایک اصول اور یاد رکھنا چاہئے۔ کسی بھی اچھی چیز کی رغبت تین طرح سے ہوتی ہے۔ اول ایک اچھی چیز آدمی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس اچھی چیز سے اسے کوئی مطلب نہیں ہے بلکہ اس سے کوئی اور فائدہ ہونے کی امید ہے، جیسے روپیہ اور اشرفی وغیرہ انسان اسے حاصل کرنا چاہتا ہے مگر جانتا ہے کہ خود ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اگر ان سے انسان کی ضرورتیں پوری نہ ہوا کرتیں تو یہ کنکر پتھر کی طرح ہیں۔ دوم وہ اچھی چیز جو انسان کو

مطلوب ہو اور وہ خود اپنے اندر بھلائی رکھتی ہو، جیسے نیکی سچائی، خدا سے محبت اپنے دین سے محبت، تیسری قسم وہ کہ خود اس میں بھی نفع اور بھلائی ہے اور اس کی وجہ سے دوسرے نفع کی امید بھی ہے۔

مثلاً بدن کی سلامتی، انسان اپنے جسم کو نقص اور تکلیف سے دور رکھنا چاہتا ہے یہ جسم کے لیے بھی ہے اور اس لیے بھی کہ جسم سے دنیا اور آخرت کے دس کام نکلتے ہیں۔ علماء کا درجہ اسی تیسری قسم میں آتا ہے یعنی وہ خود بھی مفید اور افضل ہے اور اس کے ذریعے دوسرے بہت سے فائدے اور بہت سی سعادتیں حاصل ہوتی ہیں، اس لحاظ سے بھی علم قابل قدر ہوا۔ اگرچہ علم بغیر عمل کے بیکار ہے، مگر عمل کیا ہے کون سا عمل کرنا چاہئے کون سا نہیں۔ عمل کی کیفیت کیا ہے۔ ان سب کا جاننا علم ہی پر تو منحصر ہے، ان کے لیے بھی تو پہلے علم حاصل کرنا پڑے گا۔ یہاں عمل کے مقابلے میں بھی علم ہی افضل رہا۔ کسی شے کے افضل اور غیر افضل ہونے کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ اس شے کا نتیجہ اور انجام کیسا ہے، اگر نتیجہ اور انجام بہتر ہے تو وہ شے بھی اچھی ہے ورنہ بری ہے یہ معلوم ہو ہی چکا ہے کہ علم کے نتیجے میں بھلائی، بہتری اچھی اور پسندیدہ خصلتوں کے سوا کچھ اور نہیں ہے اس لیے خود علم کے بہتر ہونے میں کسی کو انکار نہ ہوگا۔ علم سے اگر ایک طرف انسان میں اعلیٰ اوصاف باطن کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں تو دوسری طرف ظاہری اور دنیاوی خوبیاں کم نہیں مثلاً عزت و بلندی، سنجیدگی و وقار، فوقیت و برتری، لوگوں کے دلوں عالم کی قدر و منزلت یہ ساری فضیلت علم کی ہے جب یہ ثابت ہو گیا کہ علم کا درجہ دوسرے تمام اوصاف سے افضل ہے تو یہ بات خود سمجھ میں آتی ہے کہ اس کا سیکھنا ایک افضل کام ہے کیونکہ دنیا کے تمام مقاصد دین اور دنیا ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ دین کی بہتری بغیر دنیاوی بہتری کے مکمل نہیں ہوتی، کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو شخص دین کو سنوارنا چاہتا ہے اسے دنیا میں بہتر سے بہتر صورت اختیار کرنی ہوگی اور یہ طے ہے کہ دنیا کا انتظام انسان کے اعمال ہی سے انجام پاتا ہے، دنیا کے انتظام

کو بنائے رکھنے کے لیے انسان کے اعمال تین طرح کے ہوتے ہیں اور ان کے تین درجے کیے جا سکتے ہیں۔ اول اصل۔ یعنی وہ اعمال جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور نہایت ضروری ہیں جیسے زراعت، نور بافی، تعمیر و سیاست، دوم وہ امور جو ان اصول کے لیے معاون ہوں جیسے زراعت کے لیے بڑھی، لوہار۔ نور بافی کے لیے دھنائی، کتائی، بنائی وغیرہ۔ سوم وہ امور جو ان اصولوں میں تکمیل اور حسن پیدا کرتے ہیں جیسے زراعت میں پیسنا، پکانا۔ نور بافی میں دھونا دھلانا اور رنگنا، دنیا کے قیام و انتظام اور مذکورہ بالا تینوں اقسام کی مثال اگر ہم انسانی جسم میں دیکھنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جسم انسانی میں کچھ اصول ہیں جیسے دل، دماغ اور جگر وغیرہ۔ کچھ وہ اعضا ہیں جو ان اصولوں کے لیے معاون کے طور پر ہیں جیسے معدہ، رگیں، شریان وغیرہ اور کچھ وہ اعضا ہیں جو محض زینت کے لیے ہیں جیسے ناخن، بال، بھویں، پلکیں وغیرہ، ان میں سب سے اعلیٰ و افضل ''اصول'' ہیں۔ پھر اصول میں بھی سب سے اعلیٰ نمبر سیاست کا آتا ہے کیونکہ سیاست پر ہی عام معاشرتی زندگی کا اور خوبی کے ساتھ مل جل کر رہنے کا دارومدار ہے، اجتماعی زندگی میں ''باہمی تعاون و ہمدردی'' اور آپس میں اتحاد و اتفاق کا شعور سیاست ہی کی دین ہے چنانچہ سیاست کی خدمت کو انجام دینے والے کو نسبتاً زیادہ ذی صلاحیت اور بیدار ذہن ہونا چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ اس خدمت کو اپنانے والا دوسروں سے اپنی خدمت لیتا ہے اور سب کو اپنا تابع سمجھتا ہے۔ اب دنیاوی نظام کے لیے سیاست کے چار مرتبے ہوتے ہیں۔ انبیاء اور رہبروں کی سیاست، یہ ظاہر و باطن سب سے متعلق ہوتی ہے۔ خلفاء، ملوک اور سلاطین کی سیاست، یہ بھی عام و خاص کے لیے ہے مگر اس کا تعلق خواص کے باطن سے ہوتا ہے عوام کی سمجھ وہاں تک نہیں پہنچتی۔ واعظوں کی سیاست، یہ عوام کے باطن سے متعلق ہوتی ہے۔ ان سیاستوں میں نبوت کے بعد سب سے افضل وہ سیاست ہے جس میں علم کی اشاعت نفس کو بری باتوں سے بچانا، عمدہ اور اچھے اخلاق کی تعلیم شامل ہے، یہی علم کا منتہیٰ و مقصود ہے ہم نے جو علم کو دوسری صنعتوں سے افضل

بتایا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسی صنعت یا پیشے کی بلندی کا پتہ مزید تین طرح سے ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ کسی صنعت کے پہنچانے اور جاننے کا ذریعہ اگر معزز ہے تو وہ صنعت بھی معزز ہوگی مثلاً علوم عقلی کے پہنچانے کا ذریعہ عقل ہے اور علوم لغوی کا تعلق سننے سے یا کان سے ہے اور عقل کا مرتبہ ظاہر ہے بلند ہے اس لئے علوم عقلی کا مرتبہ بڑا ہوگا۔

دوم، ہم دیکھیں گے کہ کسی صنعت کا فائدہ کتنا عام ہے۔ عام فائدے والی صنعت کو محدود فائدے والے پیشے کے مقابلے میں بڑھا ہوا مانیں گے، جیسے زراعت بمقابلہ زرگری کے عام فائدہ رکھنے والا پیشہ ہے تو زراعت کو زرگری کے مقابلے میں اہمیت حاصل ہوگی۔ زرگری کا فائدہ بہت محدود ہے۔ سوم ہم دیکھیں گے کہ کسی صنعت کا محل و موقع کیسا ہے محل و موقع کی شرافت سے بھی صنعت کی شرافت کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً زرگری کا موقع و محل کپڑا، سونا اور ریشم ہے اور چمڑا رنگنے (دباغت) کا موقع و محل چمڑا نمک وغیرہ ہے اور ظاہر ہے چمڑا یا نمک، کپڑا یا سونے کے مقابلے میں کمتر ہیں تو یہاں زرگری کو فوقیت حاصل ہوگی ان مثالوں کے بعد غور کیجئے باعتبار فائدے کے بھی علم کا فائدہ کس قدر عام اور اہم ہے، انسان، حیوان، آسمان، زمین، حیات و موت سب کو گھیرے ہوئے ہے اور باعتبار موقع و محل یعنی ذریعے کے بھی علم کا تعلق عقل و ذہن اور دل و دماغ سے متعلق ہے اور یہ چیزیں کائنات میں سب سے افضل ہیں، تعلیم دینے والا لوگوں کے قلب و دماغ پر حکومت کرتا ہے، براہ راست قلب کو اپنا موضوع بنا کر اسی کو جلا دیتا ہے اخلاق کو پاکیزگی عطا کرتا ہے اس سے علم کی شرافت بخوبی واضح ہو جاتی ہے علم کا سیکھنا، سکھانا خدا کی عبادت بھی ہے اور خدا کی خلافت بھی خدا نے اپنی بہترین صفت یعنی ''علم'' کا امین بنایا اور ساتھ ہی اس کی اجازت بھی دے دی کہ جو اس دولت کا محتاج ملے اُس کو یہ خزانہ عطا کر دیا جائے انسان کے ظاہر و باطن کی تمام خوبیاں اس علم سے متعلق کر دی گئیں گویا عالم خدا کی طرف سے لوگوں کو گمراہی سے بچانے کا ایک ذریعہ بن گیا ہے اس سے بڑا مرتبہ ایک انسان کو اور کیا مل سکتا

ہے اور یہ علم ہی کی وجہ سے مل سکا ہے۔

علم کی قسمیں اور ان کے احکام

اس فصل میں تین بیان ہیں پہلا بیان اس علم سے متعلق ہے جو فرض عین ہے فرض عین کے بارے میں لوگوں میں بڑا اختلاف ہے، خلاصہ یہ کہ ہر شخص نے اسی علم کو فرض عین بتلایا جس میں وہ خود مشغول تھا یا جس میں اسے دلچسپی تھی علم کلام کا شیدائی علم کلام کو ضروری اور فرض عین بتاتا ہے، دلیل یہ ہے کہ توحید، ذات اور صفاتِ خداوندی کا علم اور اس کی معرفت عقلی وضاحت کے ساتھ اس علم کلام کے ذریعے ممکن ہے، فقہا، علم فقہ کو ضروری مانتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اسی علم سے عبادت کی صحت و نقص اور شریعت کی جزئیات و تفصیلات کا پتہ چل سکتا ہے، مفسرّ و محدّث کتاب اللہ اور سنت کو اصل قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ دنیا کے سارے علوم کا مخزن یہی علم ہے، صوفیا علمِ تصوف کو فرض عین مانتے ہیں پھر صوفیا میں ایک گروہ کہتا ہے کہ اس علم سے غرض یہ ہے کہ بندہ اپنے حال سے باخبر رہے، اپنے مقام کو نہ بھولے، دوسرا گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس سے غرض یہ ہے کہ بندے کو اخلاص کی حقیقت معلوم رہے اور نفس کی آفتوں سے باخبر اور ہوشیار رہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد علم باطن ہے اور یہ علم باطن چند خاص لوگوں ہی پر واجب ہوا کرتا ہے۔ بہر حال یہ سارے علوم علم معاملہ سے متعلق ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک قسم علم کی وہ ہے جسے علمِ مکاشفے سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا بیان آئندہ آئے گا۔ جو علم ضروری اور فرض ہے اس میں عموماً تین باتیں آتی ہیں۔ ایک اعتقاد کا علم، دوسرے اُن باتوں کا علم جن کے کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، تیسرے ان باتوں کا علم جن سے ہمیں روکا گیا ہے، جن مفاسد کو اور برائیوں کو دور کرنا ضروری ہوتا ہے ان کو، ان کی حقیقت کو اور ان کے اسباب کو پہلے سے معلوم بھی رہنا چاہیے، کیونکہ جو برائی کو نہیں جانتا وہ اکثر برائی میں گرفتار رہتے ہوئے اُس سے غافل رہتا ہے، اُسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ عام طور

پر انسان کے لیے جو علم ضروری ہے وہ وہی ہے جس سے برائیوں کا بھی علم رہے اور نیکی کی راہ معلوم رہے تا کہ انسان ان دونوں کو سامنے رکھ کر پاک صاف اور بہترین زندگی گزار سکے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جب انسان اس دنیا میں نیک، اچھی اور پاک زندگی گزارے گا تو آخرت میں بھی خدا کے فضل کا حقدار ہو گا کیونکہ یہ دنیا تو آخرت کے سنوارنے کا ذریعہ ہے۔

دوسرا بیان علم جو فرض کفایہ ہے

فرض کفایہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نہ حاصل کرے تو سب کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور اگر کوئی ایک شخص بھی سیکھ لے تو سب نقصان سے بچ جائیں، یعنی کسی ایک کا حاصل کرنا سب کو کفایت کر جائے اسی وجہ سے اس کو کفایہ کہا گیا، تو بعض علوم اسی قسم کے ہوتے ہیں، مثلاً طب کا علم یا حساب کا علم، طب انسان کی، زندگی صحت وغیرہ کے لیے بہر حال ضروری ہے یا حساب، وصیت، میراث اور ترکہ وغیرہ کے لیے ضروری ہے، یہ دونوں فرض کفایہ میں شامل ہیں، یعنی اگر شہر میں کوئی نہیں جانتا تو سارے شہر والے پریشانی اٹھائیں گے اور اگر ایک شخص بھی واقف ہے تو سب کو کفایت کر سکے گا، اسی فرض کفایہ میں ایک درجہ اس سے کچھ کم حیثیت کا آتا ہے جہاں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس علم کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا حاصل کرنا بہتر ہو گا۔ مثلاً یہی علم طب و حساب ہے اس کو اپنی اور دوسرے کی ضرورت کے مطابق جان لینا تو فرض کفایہ میں داخل ہو چکا لیکن کوئی اس میں زیادہ وقت لگائے، باریکیوں میں گھسے، نئی نئی موشگافیاں پیدا کرے تو اسے ''بہتر'' تو کہہ سکیں گے، لیکن اس قدر محنت کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں ہے اس لیے فرض نہیں کہا جا سکتا باریکی اور گہرائی میں گھسنے سے تجربہ و ملکہ ہی تو بڑھتا ہے، اصل ضرورت کے لیے تو ان کا جان لینا ہی کافی ہے اس لیے ان کا صرف ''جاننا'' فرض کفایہ ہے اور ان پر تحقیق و جستجو ''بہتر'' ہے۔

علوم میں بعض وہ ہوتے ہیں جو عموماً پسندیدہ ہوتے جیسے مثلاً علم نجوم، سحر، جادو وغیرہ، بعض مباح ہوتے ہیں، جو برے نہیں کہے جا سکتے جیسے علم شعر و شاعری یا علم تاریخ وغیرہ۔ مذہبی علوم میں بھی بعض علم کی فروعی حیثیت ہوتی ہے ان سے دنیا کی بہتری کا کام متعلق ہوتا ہے جیسے مثلاً فقہ ہے، اس کے عالم فقیہہ ہوتے ہیں وہ دنیا کے عالم ہوتے ہیں۔ وہ انسان کے ان تمام معاملات سے بحث کرتے ہیں جن کا تعلق ظاہری مسائل سے یا دنیاوی امور سے ہوتا ہے یعنی دنیاوی رہن سہن میں صحیح و غلط کا فیصلہ کرتے ہیں اور حکم دیتے ہیں، اب اگر انصاف اور دیانت داری سے اس دنیا کو برتا جائے تو کسی قسم کا جھگڑا و فساد نہ ہو اور یہ فقہا بیکار رہ جائیں گے۔ فقہا کی ضرورت تو اس لیے پڑتی ہے کہ انسان اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی میں سینکڑوں دنیاوی جھگڑے فساد میں پڑ جاتا ہے۔ جس سے نئے نئے مسائل وجود میں آتے ہیں جس کو فقیہہ حل کرتا ہے، یہیں سے ایک سلطان اور حاکم کی ضرورت سمجھ میں آتی ہے جو لوگوں کو اپنی ڈانٹ اور انتظام میں رکھے اور ایک قانون کی ضرورت پڑتی ہے جس سے لوگوں کے احوال کو قابو میں رکھا جا سکے اسی لیے فقیہہ کو قانون اسلامی اور سیاست دونوں سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے کیونکہ فقیہہ، سلطان و حاکم کے لیے ایک مشیر و معلم ہوتا ہے، اس کا فرض ہوتا ہے کہ سلطان کو امور ملکی کے انتظام میں جادۂ حق پر رکھے۔ اسی طرح سلطان دین اور دینی معاملات کا نگہبان ہوتا ہے اگر اس کی نگرانی اور نگہبانی، نہ ہو تو سارا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے جس طرح ''سلطنت جس کے ذریعے لوگوں پر حکومت کی جاتی ہے'' اس کا جاننا اول درجے کا علم دین نہیں ہے۔ اسی طرح امور سلطنت کی صحیح نگرانی کا علم جو فقیہہ کرتا ہے وہ بھی اول درجے کا علم دین نہیں ہو سکتا۔ علم فقہ کا حاصل صرف یہ ہے کہ ملک میں سیاست اور حفاظت کا صحیح طریق معلوم ہو سکے۔ فقہا کے بارے میں کچھ اہم امور ہم لکھتے ہیں وہ صرف ظاہری امور پر حکم لگاتے ہیں۔ دلوں کا اور قلوب کا حال ان کے اختیار سے باہر کی چیز ہے۔ وہ اگر دین کے مسائل یا عبادات کے

معاملات میں بھی دخل دیتے ہیں تو بس اسی قدر کہ ان کا ظاہری حکم کیا ہے، باقی عبادات و دینی معاملات کے اسرار و رموز یا باطنی کیفیات، اس سے فقیہہ کوئی بحث نہیں کرتا ہے۔ دل کا معاملہ فقہ کے موضوع سے خارج ہوا کرتا ہے۔ دل کے لحاظ سے ایک معاملہ کتنا ہی برا ہو اگر ظاہری اعتبار سے وہ معاملہ صحیح ہے تو فقیہہ اس کی صحت کا حکم لگا دے گا، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول مقرر فرمایا ہے اگر چہ لوگ فتویٰ دینے والے موجود ہوں مگر اپنے دل سے پوچھنا چاہیے۔

بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ علم فقہ آخرت کے علوم میں سے نہیں ہے ان کا مطلب یہ تھا کہ علم کی شرافت اس چیز میں ہے کہ اس پر عمل کیا جائے جس سے باطن کو جلا ملے اور فقہ میں بہت سے علوم ایسے ہیں کہ ان پر عمل سے قلب یا باطن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر کوئی یہ سوچتا ہو کہ فقہ کے ظاہری معاملات بھی خدا کی رضا مندی کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں تو اس کا جواب اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کی رضا مندی اور خوشنودی صرف ظاہری اعمال کی دوستی سے حاصل ہونی کب ممکن ہے، یہ دولت تو ظاہری خوبیوں کے ساتھ دل کی اصلاح و بہتری سے بھی تعلق رکھتی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طب کا تعلق انسان کے ظاہری اعضا سے ہے اور فقہ کا تعلق بھی ظاہری اعضا سے صادر ہونے والے اعمال سے ہے، اس لحاظ سے درجے اور مقام کے اعتبار سے فقہ اور طب برابر ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے فقہ طب کے مقابلے میں بہر حال افضل ہے ایک فرق تو یہی ہے کہ طب، ظاہری اعضا سے بحث کرتا ہے اور فقہ ظاہری اعمال پر توجہ کرتا ہے اعضا کے اعمال کا منشا و مقصد بہر حال دلوں کی صفات کو بہتر بنانا ہوتا ہے اور صرف اعضا کا منشا و تعلق دل سے نہیں مزاج یا خلط انسانی سے ہے تو ایک کا موضوع جسم ہے دوسرے کا دل ہے اس لیے فقہ اشرف علم ہوا۔

علم مکاشفہ

یہی علم باطن ہے۔علوم کی انتہا اور مقصد بھی یہی علم ہے۔مغرور و منکر کو اس علم سے حصہ نہیں ملتا۔علم باطن ایک ایسا نور ہوتا ہے جو دل میں تمام برائیوں سے پاک ہونے کے بعد آتا ہے،اسی نور سے انسان بہت سی چیزوں کی حقیقت کو پالیتا ہے، ہر نیکی کی اصلیت سمجھ میں آجاتی ہے۔یہاں تک کہ خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے،بعض لوگوں کا قول ہے کہ خدا کی اور اشیاء کی معرفت اس لیے قلب کو حاصل نہیں ہوتی کہ اس پر برائی اور بری خواہشات کا زنگ رہتا ہے جیسے جیسے قلب کو صفائی اور جلا حاصل ہوگی چیزیں اپنی حقیقتوں کے ساتھ اس پر واضح ہوتی جائیں گی اور اس جلا و صفائی کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی ریاضت کی جائے اس سب کی تفصیل علم مکاشفہ سے متعلق ہے، یہ علم کتابوں میں نہیں ملتا، یہ سینہ بہ سینہ چلتا ہے۔اسی علم کے بارے میں کہا گیا ہے بعض علم مثل پوشیدہ ہیت کے ہیں جن کو دنیا میں سوائے خدا کے عارفوں کے اور کوئی نہیں جانتا۔اسی لیے جب کوئی اس علم باطن کا دعویٰ کرے تو اس کو جھوٹا یا حقیر مت سمجھو۔دوسرا علم، دل کے حالات کا علم ہے، دل کے حالات اچھے بھی ہوتے ہیں جیسے صبر و شکر، خوف و رجا، قناعت و سخاوت، لوگوں سے اچھا سلوک کرنا، اچھا اخلاق، اچھی معاشرت، صدق و راستی، اور برے بھی ہوتے ہیں جیسے کینہ رکھنا، حسد، نفاق، غصہ، شیخی، عداوت، بغض، طمع، بخل، کبر، حرص، اترانا، آپس میں ایک دوسرے سے نفرت کرنا وغیرہ۔یہ تمام باتیں بری ہیں۔غرض دل کے ان حالات کو جاننا ہی اصل علم ہے اور ضروری بھی ہے۔لوگ فقہ میں مصروف ہو گئے ہیں جس کا موضوع ظاہری اور دنیاوی مسائل تک ہے اور باطن کا علم چھوڑ بیٹھے ہیں۔حالانکہ یہ علماء ظاہر علماء باطن کے سامنے جھکتے رہے ہیں ایک چرواہا جس کو علم باطن میں کمال حاصل تھا وہ امام شافعیؒ ایسے فقیہہ کا استاد تھا اور باطنی معاملات میں ہر وقت امام موصوف اس سے رجوع کرتے تھے۔

علوم بھی برے بھلے ہوتے ہیں

اس بات سے عام طور پر حیرت ہوگی کہ کیا علم بھی برا ہوسکتا ہے مگر علم خود کبھی برا نہیں ہوا کرتا، دیکھا یہ جاتا ہے کہ کوئی علم عالم یا اس کے جاننے والے کے حق میں نقصان دہ اور مضر تو نہیں ہے۔ مثلاً علم سحر یا جادو ایک علم ہے مگر چونکہ سحر یا جادو سے مخلوق کو نقصان پہنچانے اور تخریب وفساد کے سوائے کوئی کام نہیں لیا جاتا اس لیے اس کا سکھانا سیکھنا منع کردیا گیا ہے مثلاً علم نجوم کہ اس میں ستاروں کی ترتیب سے واقعات کا علم ہوتا ہے اور علم نجوم کی تصدیق قرآن نے بھی کردی ہے مگر جب ستاروں کی ترتیب کے نام سے لوگ تقدیروں اور مستقبل کا حال بتانے لگے تو اب گویا اس میں برے خیالات نے جنم لیا اور اسے منع کرنا پڑا۔

علوم کے معانی میں تبدیلی

علوم کے معانی ومفہوم میں لوگوں نے تبدیلی کردی اور دوسرے معانی مراد لے لیے ہیں مثلاً فقہ کے معانی تھے دین میں تفکر اور تدبر کرنے کے یا خدا سے ڈرنے کے، اسی معنی میں لوگوں نے اور خود قرآن نے استعمال کیا ہے مگر اب فتویٰ دینے کے لیے اصول و فروع کو جاننا، فتویٰ دینے کے لیے پرانے فتاویٰ اور فیصلے کو یاد کرنا، یاد رکھنا فقہ کہلانے لگا ''علم'' پہلے معرفت الٰہی اور اس کی جزئیات پر غور کرنے کو کہتے تھے بعد میں دنیا بھر کے مضامین اور معاملات کے جاننے کو علم کہا جانے لگا۔

ایسے ہی ''تذکیر وترہیب'' کا لفظ ہے، یعنی ''اچھی باتوں کی نصیحت'' اور ''بری باتوں سے روکنا'' اس کے اصل مفہوم میں داخل تھا لیکن واعظوں نے سچی جھوٹی من گھڑت کہانیاں سُناسُنا کر لوگوں کو بہکانا شروع کردیا۔ اطاعت کے باب میں رغبت کی اور ممنوعات کے باب میں خوف کی ایسی ایسی حدیثیں گھڑلی گئیں اور ان کا نام مجلسِ وعظ وتذکیر رکھ لیا گیا

کہ اصل مفہوم لوگ بھول ہی گئے۔ ایسے ہی حکیم کا لفظ اب طبیب اور منجم وغیرہ پر بولنے لگے ہیں حالانکہ حکمت وہ دولت ہے کہ اگر کوئی ذرا سی حکمت سیکھ لے تو وہ دنیا میں سب سے بڑھ کر مانا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ لوگ اس قسم کی لفظی غلطیوں میں پڑ گئے۔ بحث ومباحثے میں گرفتار ہیں اور اس قول کے مطابق ہیں ''جو قوم زیادہ گفتگو کرتی ہے وہ عمل سے روک دی جاتی ہے۔'' آدمی کو ہمیشہ محاسبہ نفس اور اصلاح نفس کی فکر کرنی چاہیے اور جب اپنے نفس کی اصلاح سے فارغ ہو لے تو دوسروں کی اصلاح کی طرف توجہ کرے اور نفس کی اصلاح کے لیے ضروری علوم کا حاصل کرنا ناگزیر ہے' ان علوم کے علاوہ ایک چیز جو نہایت ضروری ہے جس کو ہم نے نظر انداز کر رکھا ہے وہ ہے دل کی صفات کا علم' یعنی یہ جاننا کہ دل میں کون سی صفات اچھی ہیں' کون سی بُری۔ کیونکہ ایسا کوئی دل نہیں ہے جس میں بعض بُری صفات راہ نہ پا گئی ہوں مثلاً حرص وہوا' حسد' ریا' غیبت' جھوٹ' یہ صفات انسان کو تباہ کرنے والے ہیں' ان سے نظر پھیر لینا اور صرف علومِ ظاہری میں مشغول رہنا ایسا ہی ہے گویا زخم کے اوپر اوپر مرہم لگایا جائے اور اندر فاسد رطوبت کی حفاظت کی جائے۔ ظاہری اعمال پر زور دینا باطن کو یکسر فراموش کر دینا سہل پسندی ہے۔ دل کے معاملات کا سلجھانا ذرا مشکل کام ہے اس لیے علماء ظاہر اُس طرف سے بے نیاز اپنے کاموں میں لگ گئے ہیں' اُنھیں اس سے کیا غرض کہ قلوب کی کھیتی مرُجھا گئی ہے۔

مُعلّم اور متعلّم کے آداب

علم سے مقصود سیرت اور اخلاق کی درستگی ہے، اپنی ذمہ داریوں اور اپنے فرائض کو جاننا' ان پر عمل کرنا' دوسروں کے حقوق کو پہچاننا' ان کو ادا کرنا اچھے معاشرے کے لیے بہت ضروری ہے' کیونکہ ایک فرد کے احساسِ ذمہ داری کا اثر پورے سماج پر پڑتا ہے اس لیے ایک بہتر اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص جہالت سے پاک اور علم سے مزین ہو' اللہ اور اس کے حقوق اس کے بندوں کے حقوق سے واقف ہو اور ادا کرتا ہو' طالب

علم کے لیے بنیادی بات یہ ہے کہ اس کا دل ودماغ رذیل باتوں سے پاک ہو جب تک دل، رذائل کی آماجگاہ ہوں گے علم سے نفس کی صفائی اور ضمیر کی بیداری حاصل نہ ہوگی اور پھر علم جو انوارِ الٰہی میں سے ایک نور ہے، کیسے حاصل ہوگا؟

علم جب باطنی قوتوں کو چمکا دیتا ہے تو انسان کی فکر پاکیزہ اور دل نیک ہو جاتا ہے، جب باطن پاک ہوگا تو اس سے اچھے افعال سرزد ہوں گے کیوں کہ ظاہری افعال باطنی قوتوں کے تابع ہوتے ہیں، انسان وہی کچھ کرتا ہے جو وہ سوچتا ہے لہذا اس کا عمل بھی پسندیدہ ہوگا اور اس کا ہر فعل محمود ہوگا۔ یہ جو کہا گیا ہے ''دین کی بنیاد پاکی اور نظافت پر ہے'' اس سے مراد یہ باطنی نظافت بھی ہے، دین کا تعلق اگر صرف ظاہری افعال سے ہوتا تو نظافت بھی صرف ظاہری مقصود ہوتی، چونکہ دین کا تعلق باطن سے بھی اتنا ہی ہے جتنا ظاہر سے اس لیے باطنی نظافت ضروری ہوئی۔ اسی لیے صحیح معنوں میں نیک عالم کا دل و ذہن بہت سی صفات بد سے پاک ہوتا ہے اگر علم کے انوار اسے میسر ہیں تو خود بینی، خود فریبی اور خود غرضی ایسی مذموم عادتیں اس میں نہ ہوں گی۔ دوسروں کی مدد اور دستگیری ایسے عالم کا مزاج بن جایا کرتی ہے، یہ جذبہ اور حقیقت متعلم کے دل پر اسی وقت روشن ہوگی جب وہ علم حاصل کرنے میں نیک نیت ہو، نیک ہو، بری باتوں، بری عادتوں سے دور رہے۔ طالب علم یا عالم کو کبھی علم پر تکبر نہ کرنا چاہیے، تکبر ویسے ہی برا مرض ہے پھر علم پر تکبر تو بالکل بے معنی ہے، علم تو تواضع اور انکساری کی شان پیدا کرتا ہے۔ عالم کی یہ خاموشی جہالت یا لاعلمی کی وجہ سے نہیں ہوگی بلکہ تواضع اور وقار کی وجہ سے ہوگی، طالب علم کبھی اپنے استاد کے ساتھ بد اخلاقی اور بدتہذیبی کا معاملہ نہ کرے، طالب علم کے علم و عمل کا سارا مرکز استاد کی توجہ اور اس کی شفقت ہے، ایک معمولی ہستی کو علم و اخلاق کی بلندی پر پہنچانے والی ذات استاد کی ہے، ایسے محسن کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کرنا سخت بری بات ہوگی، ابتدائی رہبری اور ذہن کو سیدھے راستے پر لگانے کا کام استاد ہی کرتا ہے، پھر ذہن کی پختگی اور حق و باطل کی تمیز کے

بعد انسان میں مطالعے کی قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ اسی بنیادی فائدے پر ساری زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ ماں باپ سے کہیں بڑھ کر استاد کا مرتبہ ہوتا ہے، ماں باپ پیدا کرنے کے ساتھی ہیں اور اس عارضی دنیا میں زندگی گزارنے کا سامان فراہم کرتے ہیں، باقی ظاہری و باطنی ساری خوبیوں کا ذمہ دار استاد ہی ہوتا ہے۔ اسی کی نگرانی اور توجہ سے یہ خوبیاں پیدا ہوتی ہیں، اگر ایک مریض اپنے علاج کے سلسلے میں کسی طبیب پر بلا سوچے سمجھے اعتماد کر لیتا ہے، اس کی تلخی کو اپنے لیے سودمند خیال کرتا ہے۔ اس کی ہدایت کو بلا چون و چرا مان لیتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک شاگرد اپنے استاد کو یہی مقام نہ دے جب کہ استاد بھی باطنی امراض کا ماہر طبیب ہوتا ہے اس کے ساتھ بھی یہ سب معاملہ ہونا چاہئے۔ استاد کے علاوہ اور جہاں کہیں سے علمی رہنمائی ملے اسے قبول کرنا چاہیے۔ علم و حکمت تو ایسا خزانہ ہے کہ جہاں سے بھی مل جائے لینا چاہیے۔ کوئی شخص بھی تمہارے مطلب کی کوئی بات بتاتا ہے یا کوئی علمی فائدہ پہنچاتا ہے وہ تمہارا محسن ہے، استاد ہے، تمہارے ادب و احترام کا مستحق ہے۔ دوسری بات اختلاف کی ہے، طالب علم کو اگر استاد کی کسی بات سے اتفاق نہ ہو تو اسے نہایت ادب سے ظاہر کر دے، کسی مسئلے میں اختلاف بری چیز نہیں، مخالفت بری بات ہے۔ ادب سے اجازت لے کر سوال کیا جائے، اپنی رائے کا اظہار کیا جائے نیت یہی ہو کہ اپنے شبہے کا ازالہ مقصود ہے، اختلاف یا سمجھنے میں مخالفت کا رنگ نہ آئے۔ اختلاف کرنے اور سننے کی طاقت ہونی چاہیے اس سے بہت سے علمی نکتے کھلتے ہیں، علم و فن کی بہت سی باریکیاں سامنے آتی ہیں۔

طالب علم کو چاہیے کہ جو مضمون وہ پڑھنا چاہتا ہے اس کے بارے میں شکوک و شبہات سے ذہن کو پاک رکھے، موضوع کے بارے میں خوب غور و فکر کر کے استاد سے مدد لے۔ اگر کچھ بھی شک ہے تو استاد کی تقریر سے فائدہ اٹھا سکے گا اپنے مضمون کے علاوہ اور دوسرے مضامین بھی پڑھتا رہے تاکہ کسی حد تک دوسرے فن سے بھی واقف رہے، علوم کا

ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اس طرح ایک موضوع کے لیے دوسرے کا مطالعہ مدد گار اور معاون ثابت ہوگا، اس سے معلومات اور مطالعے میں بھی وسعت ہوگی۔ کسی علم اور مضمون کے بارے میں محض سنی سنائی باتوں پر قناعت کر کے نہ بیٹھ جائے اور اس کے بارے میں فیصلہ نہ کرلے بلکہ خود بھی تحقیق و جستجو کرے، ہوسکتا ہے پہلے لوگوں کا ذہن بہت سے نکتوں پر نہ پہنچا ہو یا ان کی ایک رائے ہو تو اس سے الگ کوئی مفید اور قیمتی بات نکال سکو، جو فن حاصل کرنا ہو اس کو شروع سے سلسلے وار حاصل کرے تا کہ پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔ ہر فن کے ابتدائی مقاصد اور موضوع پر نظر ہونی چاہیے اس سے وہ فن آسان ہو جاتا ہے اور اس سے پورا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

علم کے معاملے میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی بات نیت کی ہے کسی نے دنیا حاصل کرنے کے لیے، مال و دولت جمع کرنے کے لیے یا اپنے دوستوں ہمعصروں پر فخر کرنے کے لیے علم حاصل کرنا شروع کیا ہے تو یہ بہت چھوٹا مقصد ہے اور بہت ہی معمولی نیت ہے، ایسے علم سے نہ خود کو فائدہ ہوگا نہ دوسروں کی اصلاح ہو سکے گی، اپنی اصلاح، خدا کے بندوں کو فائدہ پہنچانا اور دوسروں کے اخلاق و عادات کی درستگی یہ نیت لے کر علم شروع کرنا چاہیے، کسی علم کو کبھی حقارت سے نہ دیکھے علم بہر حال علم ہے، قابل احترام ہے تم جو علم حاصل کرنا چاہتے ہو اس کے علاوہ دوسرا علم بھی اسی قدر مفید اور معزز ہے جتنا کہ تمہارا پسندیدہ موضوع ہے، علم خواہ کوئی سا ہو اس سے انسان میں شرافت، سنجیدگی، بڑائی، بزرگی اور وقار پیدا ہوتا ہے۔ سر راہ اٹھکھیلیاں کرنے والا، قہقہے لگانے والا، راہگیروں کا مذاق اڑانے والا، راستے میں کھانے پینے والا، کبھی تعلیم یافتہ اور مہذب انسان نہیں کہا جا سکتا۔ علم بذات خود انسان میں نتیجہ اور ثمرہ نہیں پیدا کرتا، یا تہذیب و شرافت کا جان لینا ہی کافی نہیں ہے جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے علم دو طرح کے ہوتے ہیں علم بدن اور علم دین رضائے الٰہی کی طلب میں خدا کی طرف چلنے والا دراصل انسان کا دل ہے اگر دل پوری طرح اللہ کے

حکم پر راضی اور تیار ہے تو خدا کی قربت نصیب ہوگی۔ دل کیا ہے؟ دل خدا کا ایک بھید ہے، اسی کو روح بھی کہتے ہیں۔ چونکہ دل خدا کے راز اور بھید میں سے ہے اس لیے اس کا مرکز بھی خدا کی ذات ہے، اور شے اپنے مرکز ہی کی طرف چلتی ہے اس لیے طبعًا دل بھی خدا کی طرف مائل رہتا ہے، انسان کا بدن اسی دل کے لیے ایک سواری ہے، اگر نیکیوں کو ایک منزل مان لیا جائے دل کو سوار فرض کیا جائے اور بدن کو سواری۔ سوار اس منزل کی طرف جانا چاہتا ہے۔ تو یہاں یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ منزل تک پہنچنا سوار کا مقصد ہے، سواری تو اس سوار کے لیے ایک ذریعہ ہے۔ پھر بھی کوئی سوار اگر سواری کی طرف سے غافل ہو جائے۔ اس کی بیماری کی طرف سے بے پرواہ رہے تو یہ سفر کیسے طے ہوگا۔ اسی طرح اگر بدن کی طرف توجہ نہ کی جائے تو دل جو سوار کی مانند ہے، کس طرح اپنی منزل تک پہنچے گا، خلاصہ یہ کہ نیک زندگی گزارنے والے کو اپنے جسم و بدن کا بھی خیال رکھنا چاہیے، بیمار جسم نہ دنیا کے کام انجام دے سکتا ہے نہ نیکیوں کو حاصل کر سکتا ہے۔ علم ظاہری جو مثل بدن کے ہے اور علم باطنی جو دل کے مانند ہے دونوں کی طرف توجہ لازمی ہے، نہ بدن کی طرف اتنا متوجہ رہے کہ باطن کی اصلاح سے بے نیازی ہو، نہ باطن ہی کی اصلاح میں غرق ہو کر جسم کو گھلا کر رکھ دے کہ کسی ایک طرف افراط یا تفریط، اعتدال اور میانہ روی کے خلاف ہے اور یہی محرومی کا سبب ہے۔

استاد کے لیے ہدایات

شاگرد کے بعد معلم اور استاد کے بھی کچھ فرائض ہیں جن کو پورا کرنے سے استاد اور شاگرد دونوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ استاد، شاگرد کو اپنی اولاد کی طرح سمجھے، جس طرح ایک باپ اپنے بچے کو ہر طرح کی ہلاکت سے بچاتا ہے اسی طرح استاد اپنے شاگرد کا خیال رکھے، استاد اور ماں باپ میں یہی فرق ہے کہ ماں باپ محض ظاہری معاملات کے رفیق ہوتے ہیں مگر استاد مربی اخلاق اور باطن کو سنوارنے والا ہوتا ہے اس لیے ہر وقت اسے اپنے شاگرد کا خیال رکھنا پڑے گا، استاد کا فرض ہے کہ اپنے شاگرد کو نیک و بد سمجھاتا رہے۔

اپنے عمل سے اس کو نیکی کی تعلیم دیتا رہے۔ استاد کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جب وہ شاگرد کی کسی ناپسندیدہ بات پر سرزنش کرنا چاہے تو لوگوں کے سامنے کھلم کھلا نہ کرے، یہ عادت شاگرد کو نڈر بنا دیتی ہے، اس پر الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہی چیز شاگرد کے لیے علم سے محرومی کا سبب بن جاتی ہے، استاد کا رعب بھی دل سے نکل جاتا ہے، ایسے وقت میں جبکہ بہت سے لوگ سامنے ہوں تو عزت نفس کا خیال اسے نڈر بنا دے گا، ہر انسان اپنی عزت نفس کے لیے ہر قسم کی مدافعت کرتا ہے، اس لیے استاد کو موقع پر چشم پوشی کرنی چاہیے اور دوسرے مناسب وقت میں شاگرد کو سمجھا دے، برائی کے نتیجے سے اسے آگاہ کر دے، استاد کو چاہیے کہ شاگردوں کے سامنے کسی دوسرے استاد کی برائی نہ کرے، اس سے بھی شاگردوں کے دل سے استاد کی عزت جاتی رہتی ہے، پھر شاگرد آپس میں ایک دوسرے کی برائی کرنے لگتے ہیں، شاگرد جو کچھ استاد سے سیکھتے ہیں وہی اختیار کرتے ہیں اس لئے استاد کو ہمیشہ اچھے کام کرنے چاہیں بعض وقت کسی مضمون پر استاد کو پوری بصیرت نہیں ہوتی، اس وقت وہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے اور اپنے شاگردوں پر رعب ڈالنے کے لیے لمبی لمبی پیچیدہ تقریروں کا سہارا لیتا ہے، مگر شاگرد اس کی اس کمزوری کو فوراً سمجھ جاتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کی طبیعت بھی اچاٹ ہو جاتی ہے، تقریر میں ان کا دل نہیں لگتا ایسے استاد کا احترام اور عقیدت شاگردوں کے دل سے نکل جاتی ہے۔ ایسے وقت میں استاد کو نہایت حوصلے کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہیے۔ شاگرد اسی استاد سے مانوس ہوتے ہیں، محبت کرتے ہیں جس کی تقریر ان کے ذہن سے قریب ہوتی ہے اور سمجھ میں آ جاتی ہے، ایسے استاد کا شاگردوں کے دلوں پر قبضہ ہوتا ہے۔ پھر ایک وقت میں اگر استاد اپنی کمزوری کا اعتراف کر لے تو شاگرد کے دل میں اور محبت بیٹھ جاتی ہے، اس میں کوئی توہین کی بات نہیں ہے، ایسا کوئی انسان نہیں کہ ہر وقت ہر بات اسے یاد رہتی ہو بلکہ سہو و نسیان انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس کا بھی خیال رہے کہ اپنے شاگردوں پر رعب

ڈالنے کے لیے ان کے ذہن سے اونچی بات نہ کرے، یہی اصول استاد کے علاوہ عام واعظ کو بھی اختیار کرنا چاہیے، سیدھے سادے عوام کے سامنے مشکل اور اختلافی معاملات کا ذکر نہ کرے، جس طرح وہ سیدھی سادی عبادت میں لگے ہوئے ہیں اپنے متعلقین کے لیے رزق حاصل کرنے میں مصروف ہیں، اللہ کے بندوں سے ان کا معاملہ بالکل سادہ اور شریفانہ ہے، انہیں ایسا ہی رہنے دیا جائے ایسے معاملات میں نہ پھنسائیں جن سے ان کا ذہن پریشان ہو جائے نہ ان کے سامنے دین کا اس قدر اصرار کریں کہ وہ اپنی سیدھی سادی زندگی کو برا سمجھنے لگیں اور اپنی کمائی کو دنیا طلبی سمجھ کر چھوڑ بیٹھیں اور ان کے متعلقین معاش کی پریشانیوں میں پڑ جائیں۔ پھر ان کے اہل وعیال کا وبال بتانے والے کے سر پر ہو۔ استاد کو چاہیے کہ تقریر سے زیادہ اپنے عمل سے شاگردوں کو متاثر کرے اس کا اثر زیادہ گہرا ہوگا، استاد کو چاہیے کہ شاگرد پر کسی قسم کا احسان نہ جتائے نہ ان کو اپنا خدمت گار سمجھے کیوں کہ اسی عالم کا علم مقبول اور قابل لحاظ ہے جس سے دوسروں کو فائدہ پہنچ رہا ہو، علم کی قبولیت کی پہچان یہ ہے کہ عالم کو پڑھانے کا موقع مل جائے اگر شاگرد ہی نہ ہوں تو یہ بات عالم کو کہاں نصیب ہو سکتی تھی، شاگرد تو ایک طرح سے استاد کے لیے رحمت ہوتے ہیں، ایک طرف شاگرد کو یہ نصیحت کہ وہ استاد کا احترام کریں، دوسری طرف استاد کو یہ لازم کہ وہ شاگرد کو مثل اپنی اولاد کے سمجھیں، یہ طریقہ دونوں طرف اچھے جذبات پیدا کردے گا، اس انداز پر تعلیم وتربیت کا بہت فائدہ ہوگا ایسے شاگرد دنیا کو بہت کچھ دے سکیں گے۔ علم بغیر عمل کے تکبر پیدا کرتا ہے، فخر وتکبر اور بحث ومباحثے میں حصہ لینے کے لیے علم نہ حاصل کیا جائے۔ عموماً عالم چار قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ شخص جو جانتا ہو اور اسے احساس ہو کہ مجھ پر لوگوں کی ذمہ داری ہے وہ صحیح عالم ہے اس کی اتباع کرو دوسرے وہ شخص جو عالم ہو مگر اسے احساس ہو کہ میں کچھ نہیں جانتا، وہ غافل ہے اسے ہوشیار کرنے کی ضرورت ہے، تیسرے وہ شخص جو عالم نہیں ہے اور وہ کچھ نہیں جانتا اور اسے یہ بھی احساس ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا، ایسا شخص ہدایت کے قابل

ہے۔ چوتھے وہ شخص جو کچھ نہیں جانتا اور اپنے نہ جاننے کا اسے احساس بھی نہیں ہے۔ اسے کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ کچھ نہیں جانتا ایسا شخص جاہل ہے۔ انسان جب تک طلب علم میں مصروف رہتا ہے۔ وہ عالم ہوتا ہے، مگر جب اسے یہ گمان ہو جاتا ہے کہ کچھ جان گیا ہے تو وہ جاہل ہو جاتا ہے۔ علم سے نیکی، شرافت، انسانیت کا ادب و احترام حاصل ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص محض ظاہری شان و شوکت، نام و نمود کا کام علم سے لینے لگے تو اسے کس طرح عالم کہا جائے گا۔ بغیر علم والے انسانوں کا گروہ شہر خموشاں کی طرح ہے اور بغیر عمل کے عالموں کا اژدہام بے وقوفوں کا مجمع ہے ایک عالم کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ بولے کم اور سنے زیادہ وہ اس میں بہت کوفت محسوس کرتا ہے حالانکہ زیادہ بولنے میں غلطی اور فتنے کا امکان زیادہ ہے، جبکہ خاموشی میں امن و سلامتی اور وقار و عزت ہے۔ عالم کے لیے زیبا ہے کہ وہ عموماً خاموش اور باوقار رہے۔ ہر وقت ہنستے رہنا، ہر ایک سے مذاق ہر جگہ تمسخر مناسب نہیں ہے۔ علم زیادہ جاننے کا ہی نام نہیں ہے، علم نام ہے جس قدر معلوم ہو اس پر عمل کیا جائے۔ توریت اور انجیل میں اس حکمت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ جو چیز نہیں جانتے اس کے در پے مت ہو جس قدر جانتے ہو پہلے اس پر عمل کر لو اور علم کثرت روایات کا بھی نام نہیں ہے، علم صرف خوف خدا کا نام ہے اگر دل میں خوف خدا نہیں ہے تو انسان کو کسی برائی کے اختیار کرنے میں کوئی جھجک نہ ہوگی، انسان کے لیے ایک خبیر و بصیر جواب طلب کرنے والے کا ہر وقت اپنے سامنے تصور اس کو بڑی سے بڑی برائیوں سے بچا لے گا، علم یہی تصور انسان کے اندر پیدا کرتا ہے، انسان کے ضمیر میں ایسی جلا پیدا کر دیتا ہے کہ انسان اس خیال سے کبھی غافل نہ ہو سکے۔ عبادت کے علاوہ دنیا میں اچھا انسان بننے کے لیے بھی یہ اصول نہایت ضروری ہے جو اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔ عالم کو چاہیے کہ جو بات نہ جانتا ہو اس میں لاعلمی کا اعتراف کر لے اور خاموش ہو جائے۔ عالم اور حکیم علمی مجلسوں میں زیادہ تر خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ کلام میں لغزش اور اس کے فتنے سے واقف ہوتے ہیں۔ سوال

کرنے سے پہلے کسی بات میں دخل نہیں دیتے اور سوال کرنے پر بھی بہت غور وفکر کے بعد زبان کھولتے ہیں ایسے عالم کا مجلس میں وقار بھی محفوظ رہتا ہے اس کی رائے میں وزن ہوتا ہے۔ بلاوجہ بولنے والا اپنا وقار کھوتا ہے اور بعض اوقات اسے ندامت اٹھانی پڑتی ہے۔ ابوسلیمان کہا کرتے تھے کلام کے مقابلے میں سکوت معرفت حق سے زیادہ قریب تر ہے۔ جب علم بڑھتا ہے تو کلام کم ہونے لگتا ہے اور جب کلام زیادہ ہوتا ہے تو علم گھٹنے لگتا ہے علم ظاہر کے ساتھ ہی آدمی کو اپنے باطن اور اپنے اخلاق کی طرف نظر رکھنی بہت ضروری ہے بہت سے عالم کتابوں کو چاٹ گئے مگر حقیقت تک انکی رسائی نہ ہوئی جبکہ بعض لوگوں نے عمل پر اور دل کی پاکیزگی پر توجہ رکھی تو ان کے تھوڑے سے علم نے ان کے سامنے حکومتوں کے دروازے کھول دیے، اپنے ضمیر اور دل کو رہبر بنانے کا مطلب یہی ہے کہ دل کا نور اور ضمیر کی ہدایت انسان کو بھٹکنے سے روکتی ہے۔

علم کا خزانہ مال کے خزانے سے کہیں بہتر ہے علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے، مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے، انسان مال کی حفاظت کرتا اور جبکہ علم خود انسان کی حفاظت کرتا ہے، زندگی میں علم سے عزت ملتی ہے اور مرنے کے بعد لوگ اچھے عالم کو عزت سے یاد رکھتے ہیں علم حاکم ہے مال اس کا تابع اور محکوم ہے مال جب ختم ہو جاتا ہے تو لوگ اس مالدار کو بھول جاتے ہیں اور علم نہ خود ختم ہوتا ہے نہ اس کو حاصل کرنے والا بھلایا جا سکتا ہے۔ علما ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ جب تک زمانہ باقی ہے انکا ذکر باقی رہے گا۔ علماء کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنے یقین کو مضبوط کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ کیونکہ دین کا راس المال اور اثاثہ یہی یقین ہے۔ یقین کا معمولی درجے میں حاصل ہونا عمل کثیر سے کہیں بہتر ہے۔ کسی شخص سے اگر گناہ سرزد ہو گیا ہے اور اسے عقل و فراست اور ساتھ ہی یقین کی دولت حاصل ہو تو اسے گناہ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہوگا۔ عقل و فراست سے توبہ کی طرف مائل ہوگا اور یقین کی وجہ سے معاف ہونے کا گمان غالب رہے گا۔ اور یہ دونوں چیزیں گناہ و جرم کو مٹا

دیتی ہیں۔ یقین، عزیمت اور صبر کے بعد اگر عبادت کی زیادتی نہ بھی نصیب ہو تو انسان گھاٹے میں نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یقین کیا ہے اور اس میں کمی و زیادتی کا کیا مطلب ہے یقین ایک مشترک لفظ ہے۔ مناظرہ اور علم کلام والے شک نہ ہونے کو یقین کہتے ہیں۔ فقیہہ اور صوفی کے نزدیک کسی بات کا دل پر پورے قبضے کا نام یقین ہے یعنی نفس کسی بات کی تصدیق اور ماننے پر اس طرح مائل ہو کہ یہی تصدیق پوری طرح اس کے دل کو گھیر لے، اس تصدیق کے علاوہ اس کے خلاف کا تصور بھی نہ آ سکے، اسی کا حکم دل پر چلنے لگے۔ خوبی و برائی، حق و باطل ہر چیز میں اس تصدیق کا فیصلہ معیار بن جائے جس کو وہ اچھا سمجھ لے انسان اسی سے رغبت کرنے لگے جو اس تصدیق کے سامنے برا ہو انسان اس سے نفرت کرنے لگے اس حالت کو یقین کہتے ہیں یقین کے متعلقات میں یہ چند موٹے موٹے مسائل آتے ہیں توحید یعنی تمام چیزوں کو خدا کی طرف سے سمجھنا، دنیا کے وسائل پر زیادہ توجہ اور بھروسہ نہ کرنا، تمام وسیلوں کو خدا کے حکم کے ماتحت اور مجبور سمجھنا۔ یہ جاننا کہ دنیا کی کوئی چیز خود کسی چیز پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، جو خدا کا حکم ہو گا ویسا ہی ہو گا۔ جیسے کسی بادشاہ نے کسی کو انعام دینے کا فرمان لکھا، ظاہر ہے قلم اور ہاتھ فرمان لکھنے کا ایک ذریعہ ہیں، انعام پانے والا اگر شکر ادا کرنا چاہے تو بادشاہ کا شکریہ ادا کرے گا وہ نہ قلم کا شکریہ ادا کرے گا نہ ہاتھ کا۔ کیونکہ قلم اور ہاتھ تو ایسے وسیلے ہیں جو خود مجبور ہیں، بادشاہ کے ارادے کے تابع ہیں دوسرا معاملہ یقین کا رزق سے ہے، یعنی رزق خدا کا وعدہ ہے وہ اپنے بندوں کو ضرور رزق پہنچاتا ہے، اس یقین کے بعد انسان معاش کی طلب میں نیک و بد، حلال و حرام کو فراموش نہیں کرے گا کیونکہ اُسے یقین حاصل ہو گیا ہے، اطاعت، فرمانبرداری اور دوسرے اچھے اخلاق پیدا ہوں گے تیسرے اس بات کا یقین کہ برائی کا نتیجہ اور ثمرہ برا ہی ہوتا ہے اور نیک کوششوں کا پھل نیک ہی ملتا ہے، اس یقین کے بعد انسان اپنی حرکات و سکنات کا خود ہی محافظ ہو جاتا ہے جس طرح وہ ذرا سے زہر کو موت کا سبب سمجھتا ہے، اسی طرح ذرا سے گناہ کو تباہی کا سبب جانتا

ہے اور معمولی برائیوں سے بھی بچتا ہے اور نیکی نیز اچھی باتوں کے لیے برابر کوشش کرتا ہے ، چوتھے اس بات کا یقین کہ خدا ہر وقت مجھ کو اور میرے حالات کو دیکھ رہا ہے وہ میرے دل میں گزرنے والے خیالات تک کو جانتا ہے، اس یقین کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی جلوت اور خلوت ، مجمع اور تنہائی میں زندگی یکساں ہو جاتی ہے ، بلکہ اس یقین کے بعد انسان اپنے باطن کی نگرانی اور بھی کرنے لگتا ہے کیونکہ جب اسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی ذات میرے باطن تک کے حالات کو دیکھ رہی ہے تو وہ برے خیالات تک سے شرمائے گا ، کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی کے دیکھتے ہوئے برائی کرنے سے شرماتا ہے یقین کا یہ مقام جب حاصل ہو جاتا ہے تو حیا، خوف ، تواضع ، انکسار اور دوسری پسندیدہ خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں ، پھر ان تمام پاکیزہ اوصاف کے حاصل ہونے کے بعد آدمی طاعات کی طرف چل پڑتا ہے گویا یقین ایک درخت ہے ، عمدہ اخلاق اس درخت کی شاخ ہے اور اس اخلاق سے حاصل ہونے والی طاعات وعبادت مثل اس درخت کے پھل پھول کے ہیں۔

علماء حق کی شان یہ ہونی چاہیے کہ ان کے ظاہری انداز سے ان کے باطن کی پاکیزگی نمایاں ہو۔ خدا نے کوئی لباس وقار اور فروتنی سے بڑھ کر اپنے بندوں کو نہیں پہنایا ہے اس لباس کا احترام اور اس کی حفاظت ضروری ہے حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے ''علم سیکھو علم کے لیے پہلے وقار اور حلم سیکھو، جس شخص سے سیکھتے ہو اس کے لیے تواضع اختیار کرو علماء جابر میں سے مت بنو، علماء جابر کا علم تو جہالت کے برابر بھی نہیں ہوتا'' پانچ عادتیں ایک عالم کی خاص نشانیاں ہیں یعنی اگر عالم میں کم از کم یہ پانچ عادتیں نہ ہوں تو وہ عالم نہیں اول خدا کا خوف ، دوم خشوع ، سوم فروتنی ، چہارم حسن اخلاق ، پنجم زہد وتقوی۔ یہ علماء حق کی شان ہے بعض دنیا دار علماء جو دنیاوی معاملات اور مقدمات ہی کے جاننے میں لگے رہتے ہیں ، وہ جس قسم کے مسائل سیکھتے ہیں وہ اول تو کم ہی واقع ہوتے ہیں اور اگر ہوں بھی تو دوسرے ان کو جاننے والے موجود ہیں مگر ان سیکھنے والوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر ممتاز اور

فائق رہیں لوگوں میں عزت حاصل رہے، ایسے علماء دنیا اور آخرت میں سعادت سے محروم رہتے ہیں، استاد میں تین صفات ہوں تو اس سے بہت سے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، صبر، تواضع اور خوش خلقی۔ اسی طرح شاگرد میں اگر تین چیزیں ہوں تو وہ استاد سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے عقل، ادب، سمجھ، بعض لوگوں کا قول رہا ہے جو کچھ ہم کو حضور ﷺ سے پہنچا ہے اس کو ہم بلا چون و چرا تسلیم کرتے ہیں، اور جو صحابہؓ سے ملا ہے اس میں سے بعض کو لے لیتے ہیں بعض کو چھوڑ دیتے ہیں، اور جو ان کے بعد کے لوگوں سے پہنچا ہے تو وہ بھی آدمی تھے ہم بھی آدمی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو محض مقلّد بن کر نہ رہنا چاہیے کیونکہ جب انسانوں نے سنی ہوئی باتوں میں تقلید ناپسندیدہ ہے تو کتابوں اور تصانیف پر تو اعتماد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کتابیں تو بہت بعد کی چیزیں ہیں، پہلے لوگ تو کتابوں کا لکھنا اور تصنیف و تالیف ہی کو برا سمجھتے تھے کیونکہ خطرہ تھا لوگ ان کتابوں پر اعتماد کر کے ذہن و حفظ سے کام لینا چھوڑ دیں گے ان کو یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر کتابوں کا اور لکھنے لکھانے کا رواج شروع ہو گیا تو لوگ قرآن کو سیکھنا اور پڑھنا چھوڑ دیں گے، لکھے ہوئے کو کافی سمجھنے لگیں گے چوتھی صدی ہجری میں کتابوں کی تصنیف کا عام رواج شروع ہوا۔ پھر تو بحث و مناظرہ اور لفظی جنگ و جدل کی خوب خوب کثرت ہوئی، قصے اور وعظ گوئی کا خوب چرچا ہوا، اس وقت سے علم میں یقین کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ باطن کا علم اور یقین ایک عجوبہ روزگار بن کر رہ گیا، لوگوں کے لیے غیر مانوس ہو کر رہ گیا، صرف چند لوگوں کو اس کا شوق رہ گیا، باقی عام لوگوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، اب عالم وہی کہا جانے لگا جو خوب خوب مناظرے کرتا ہو، علم کلام میں بڑھ چڑھ کر حصے لیتا ہو یا وعظ میں خوب چکنے چکنے دلنشین پیرائے میں قصے بیان کرتا ہو، سننے والے تو عوام ہی ہوتے ہیں، ان کو کیا تمیز کہ اصل علم کون سا ہے اور بناوٹی کون سا، اس لیے جس کو تقریر کرتے دیکھا یا جبہ و دستار میں جو بھی نظر آیا اسی کو عالم سمجھ لیا آخر کار علم باطن کی بساط ہی الٹ کر رکھ دی گئی، سوائے چند لوگوں کے باقی علم

حقیقی اور علم کلام کے درمیان فرق سمجھنے والے بھی نہ رہے، اب تو خوش خبری ان لوگوں کے لیے ہے جو خود کو عاجز اور خطا کار سمجھیں یعنی اپنے عیوب پر نظر رکھیں جس سے ان کا باطن سدھرتا ہو، لوگوں کو اُن سے کوئی تکلیف نہ پہنچے، دوسروں کی عیب بینی اور نکتہ چینی سے خود کو دور رکھیں اور خوشخبری ہے ان کے لیے جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہوں۔ کلام کے فتنوں سے آگاہ ہوں اور اکثر خاموش رہتے ہوں، اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ محض سیرت کی خوبی ہی تمام اعمال سے افضل قرار پائے گی، ایک زمانہ وہ تھا کہ علماء کی مرضی اور خواہش ان کے علم کے تابع تھی اور اب وہ دَور ہے کہ علم ان کی مرضی اور خواہش کے تابع ہے، لوگوں کی زندگیاں اس قدر صاف اور پاکیزہ ہوتی تھیں کہ وہ بلا وجہ کے سوالات کر کے شبہات میں نہیں پڑتے تھے۔ ان کے دل میں خواہ کیسے ہی خیالات آئیں جب تک صحیح علم اور دین سے اسکی تائید نہیں ملتی تھی وہ ان خیالات کو عمل میں نہیں لاتے تھے مگر اب تو خواہش کی اتباع عام ہے، بعض عارف لوگوں نے کہا کہ ابدال اب بھی دنیا میں موجود ہیں وہ عوام کی نگاہوں سے چھپ گئے ہیں اور زمین کے اطراف میں چلے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس دور کے علما سے بیزار ہیں اس لیے کہ یہ علما ان کے نزدیک خدا سے غافل اور عوام میں مشغول ہیں، ایسے علما کی اتباع نہیں کرنی چاہیے بلکہ ان کو عالم کہنا اور سمجھنا ہی غلط ہے، عوام بے عقل اور سیدھے سادے ان سے کہیں اچھے ہیں کیونکہ جاہل خدا سے ڈر کر گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے مگر برے علما اپنے غرور میں رہ جاتے ہیں۔ عقلمندوں کا کہنا ہے کہ ایسے وقت میں دین دار اور محتاط آدمی گوشہ نشین ہو جائے، کیونکہ لوگوں سے ملنے میں فتنے کا امکان بہت زیادہ ہے، لوگ نصیحت قبول نہیں کرتے اور بہت سی برائیاں گلے پڑ جاتی ہیں۔

عقل کا بیان

اس جگہ عقل کی حقیقت، عقل کی قسمیں اور اس کی عظمت کا بیان ہوگا، عقل کی شرافت اور بڑائی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ علم کا مرکز اور منبع یہی

عقل ہے اور یہی علم کی اصل ہے، پھر علم کی شرافت کے بعد عقل کی شرافت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ علم اور عقل میں وہی نسبت ہے جو پھل کو درخت سے یا نور کو آفتاب سے ہوا کرتی ہے۔ عقل کے مقابلے میں طاقت، دولت، عزت، کمال، حسن کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ایک مثال طاقت کی لیجئے، خونخوار شیر اپنی بے پناہ طاقت کے باوجود انسان کا تابع ہو جاتا ہے کیونکہ انسان کے پاس عقل ہے۔ بغیر عقل کے کسی نیکی، خوبی، کسی عبادت کا بھی اعتبار نہیں۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ انسان کو اس کی خوبیوں اور اس کے کمالات کا بدلہ اس کی عقل کے مطابق دیا جاتا ہے۔ انسان کی کمائی میں سب سے افضل کمائی عقل کا حاصل کرنا ہے، عقل کی تیزی ہی انسان کو ہدایت کی طرف لے چلتی ہے، ہلاکت سے روکتی ہے، جب تک انسان کی عقل مکمل نہیں ہوتی نہ اس کا دین مکمل ہوتا ہے نہ ایمان۔

انسان صرف اپنی خوش خلقی سے عابد کا درجہ پالیتا ہے اور خوش خلقی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس میں عقل کامل نہ ہو، انسان کی نیکی اور اس کی عبادت کا اعتبار اس کی عقل کے مطابق ہوتا ہے، انسان کو ہر قسم کی فضیلت عقل ہی سے حاصل ہوتی ہے، خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب بندہ وہ ہے جو خدا کی عبادت بھی کرتا ہو اور ساتھ ہی اس کی مخلوق کا خیر خواہ بھی ہو اور اس کی عقل بھی مکمل ہو، اپنے نفس کا محاسبہ اور اس کو نصیحت کرتا رہے۔ عقل کامل کا ایک معیار ہے کہ بندہ خدا سے ڈرنے والا ہو، جس بری چیز سے اسے روکا گیا ہے اس سے باز رہے اور جن اچھائیوں کا حکم دیا گیا ہے ان پر عمل کرے، اسکے بعد اگرچہ تقویٰ میں کم ہی ہو۔

عقل کی حقیقت

عقل کی تعریف اور اس کی حقیقت میں بہت اختلاف ہے اگرچہ وہ سارے اختلافات محض لفظی ہیں، کیونکہ یہ لفظ مختلف معنوں پر بولا جاتا ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے اور عام طور پر چار معنوں پر بولا جاتا ہے اول، عقل سے مراد وہ صفت ہے جو

انسانوں اور جانوروں کے درمیان فرق کرتی ہے اور وہ صفت یہ ہے کہ انسان کو ایک قوت نصیب ہوئی ہے جو جانوروں کو نہیں ملی ہے، وہ ظاہری چیزوں پر غور کر کے بہت سی چھپی ہوئی باتوں کو معلوم کر لیتا ہے۔ وہ ظاہری چیزوں کو ایک خاص ترتیب و تسلسل سے ملاتا ہے اور اس ترتیب سے بعض ان باتوں تک پہنچتا ہے جو بظاہر معلوم نہیں ہوتیں، اس کو کہتے ہیں علوم بدیہی سے علوم نظری کا پتہ لگانا، یہ قوت جانور کو نصیب نہیں ہوئی ہے، آپ کہیں گے کہ بعض آدمی تو بے وقوفی میں جانوروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ ہم کہیں گے طبعی طور پر ان کو بھی یہ صفت نصیب ہے، وہ اسے کام میں نہ لائیں تو اس سے یہ فرق تو نہیں مٹتا۔ تو انسان علوم نظری کو حاصل کرنے میں جو قوت صرف کرتا ہے اسی قوت کا نام عقل ہے، دوم۔ عقل سے مراد وہ علوم ہیں جو ہر انسان کو عام طور پر حاصل ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ ممکن چیزوں کو ممکن اور محال کو محال جانتا ہے مثلاً اس بات کو وہ عام طور پر جانتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ ہے یا ایک شخص ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں پایا جا سکتا، یہی وہ معنے ہیں عقل کے جو اہل کلام کے یہاں لیے گئے ہیں۔ سوم، عقل ان علوم کو بھی کہا جاتا ہے جو تجربات کی صورت میں انسان کو ملتے ہیں اور جو روزمرہ کے حالات و واقعات سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں اسی لیے تجربہ کار کو عاقل کہتے ہیں۔ چہارم عقل اس کو بھی کہتے ہیں کہ انسان کو فطری طور پر اتنی قوت حاصل ہو کہ وہ امور کے انجام و نتائج کا پتہ لگا لے اور تب وہ بری باتوں کی خواہش کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور اچھی باتوں کو اپنا لے تبھی وہ عاقل کہلاتا ہے یہی قوت انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے عقل ہر انسان کو عطا ہوتی ہے، اگر اس قوت کو کام میں نہ لایا جائے تو آہستہ آہستہ یہ قوت ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی ظاہری محرک اس فطری صلاحیت کو ظاہر کر دیتی ہے، جو شخص ذرا سا بھی عقل سے کام لے گا ممکن نہیں کہ حق بات کے علاوہ اور کوئی بات مانے۔ ہاں عقل میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے۔ دنیا کے انسانوں میں اس کی مثال ملے گی، کسی کی عقل زیادہ ہے، کسی کے پاس عقل کی کمی ہے بلکہ ایک ہی شخص میں عمر کے ابتدائی حصے میں عقل کم

ہوتی ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ عقل میں پختگی آتی رہتی ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ صوفیا عقل کے خلاف ہیں، وہ بھی اس عقل کو مانتے ہیں جو بصیرت اور معرفت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہاں متکلمین کی عقل کے وہ ضرور خلاف ہیں جس میں بحث ومناظرہ، جنگ و جدل کے سوا کچھ نہیں ہے۔

عقیدے کا بیان

عقیدے کی بحث میں سب سے پہلی چیز وحدانیت ہے، یعنی یہ جاننا کہ خدا اپنی ذات میں تنہا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں وہ، بے مثال ہے، اس جیسی کوئی ذات نہیں، وہ انسان کے خیال، گمان اور وہم سے بھی دور ہے، پھر بھی وہ اپنے بندوں سے بہت قریب ہے، وہ اپنی صفت میں بالکل مکمل ہے، کسی صفت میں اسے کسی تکمیل یا اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمام چیزوں سے واقف ہے۔ زمین کی تہہ سے لے کر آسمان کی بلندی تک ہر ذرہ اس کے علم میں ہے، وہ دلوں میں گزرنے والے خیالات اور باطن کے اسرار ورموز سب پر باخبر ہے، خدا ہماری طرح جسم وصورت والا نہیں ہے، وہ مکان وزمان کی قید سے باہر ہے وہ کسی آن وکسی زمان کا محتاج نہیں ہے، اس پر کسی حادثے یا عارضے کا نزول نہیں ہو سکتا۔ وہ درماندگی، عاجزی، غفلت وقصور، اس قسم کی تمام صفات سے پاک اور بلند ہے، موت وحیات، رزق وزندگی، سب خدا کے قبضہ واختیار میں ہے، وہ عالم ہے مگر اس کا علم قدیم اور ازلی ہے۔ وہ اپنے علم میں معلومات کا محتاج نہیں ہے، ہر شے کا صدور اور وجود خدا کی ذات سے ہے، خدا اپنے افعال میں حکیم ہے، اپنے احکام میں عادل ہے، نہ اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی ہو سکتا ہے نہ اس کے کسی فیصلے میں ظلم کا دخل ممکن ہے، اس کے کسی فعل کو ہمیں اپنے فعل پر قیاس نہیں کرنا چاہیے مثلاً وہ دیکھتا بھی ہے، وہ سنتا بھی ہے، وہ عالم ہے، وہ کھلاتا پلاتا ہے، وہ مارتا جلاتا ہے، مگر ان تمام افعال میں وہ اعضاء اور آلات کا محتاج نہیں مثلاً سننے کے لیے وہ کان کا یا دیکھنے کے لیے وہ آنکھ کا، کلام کے لیے وہ منہ اور زبان یا الفاظ

اور صورت کا غرض کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ان سب کے بغیر تمام افعال پر قادر ہے، پھر مثلاً ہر دیکھنے والا ایسی چیز کا محتاج ہے جو نظر آتی ہو مثلاً دنیا میں کوئی چیز نہ ہوتی تو کسی کو دیکھنے والا کیونکر کہتے، یا سننے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی آواز ہو جو سنی جائے ورنہ سننے والا ہو ہی نہیں سکتا، مگر خدا کو نہ کسی صورت و شکل کی ضرورت ہے جو نظر آئے، نہ کسی مسموع کی حاجت ہے، وہ کسی فعل میں ذرہ برابر کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ دوسری چیز خدا کا ارادہ ہے، اس بات کا مکمل یقین ہو کہ اگر تمام انسان اور دوسری تمام طاقتیں مل کر اس کے ارادے کے خلاف کرنا چاہیں یا اس کو اس کے ارادے سے روکنا چاہیں تو ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ ماننا کہ ہر چیز کا صدور اور ہر کام کا ہونا اسی کی طرف سے ہے اور ہر کام میں حکمت اور عدل موجود ہے۔ جو کام جس طرح اس نے کر دیا اسی میں حکمت و بہتری ہے۔

طہارت اور پاکی کا بیان

جہاں جہاں پاکی اور طہارت و نظافت کے بارے میں کچھ بتایا جاتا ہے وہاں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ پاکی یا صفائی صرف ظاہر کی مراد نہیں ہوتی بلکہ دل کی اور باطن کی بھی صفائی مقصود ہوتی ہے۔ پاکی اور صفائی کو جو نصیب ایمان بتایا گیا ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ صرف ظاہری صفائی یا پاکی ہی نصف ایمان ہے کیونکہ ایمان خود ہی صرف ظاہری باتوں کا نام نہیں ہے بلکہ قلب اور باطن کی صفائی نصف ایمان ہوسکتی ہے۔

طہارت کی چار قسمیں کہی جاسکتی ہیں۔ اول ظاہری بدن کو گندگی اور نجاست سے پاک کرنا دوم۔ اعضا کو گناہوں اور خطاؤں سے پاک کرنا۔ سوم۔ دل کو اخلاق بد اور ناپسندیدہ خصائل سے پاک کرنا، چہارم، باطن کو ماسوا اللہ سے پاک کرنا۔ ان سے باطنی پاکی اور صفائی کا حاصل کرنا ضروری ہے اور مشکل بھی ہے۔ اگر ظاہری طور پر آدمی اپنے آپ کو پاک وصاف رکھے مگر اس کا دل کینہ، حسد، غیبت، جھوٹ، دھوکہ دہی اور بداخلاقی و بدکلامی کی آماجگاہ ہو تو نہ اس کا ضمیر اس صفائی پر مطمئن ہوگا اور نہ یہ صفائی اور پاکی کسی قابل

سمجھی جائے گی۔ اسی طرح دل خواہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو اگر اس کی ظاہری حالت ایسی ہے کہ خدا کی مخلوق اس سے ملنے، اس کے پاس بیٹھنے سے بھی تکلیف محسوس کرے تو ہرگز اس کی قلبی صفائی و پا کی قابل لحاظ نہ ہو گی۔

زکوٰۃ کے فوائد

عام طور پر انسان کو مال سے بہت انس ہوتا ہے۔ اسی کو کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتا اس لیے زکوٰۃ میں ایک قسم کا امتحان ہے کہ خدا کے حکم کے مقابلے میں مال کی محبت کا اس پر کتنا اثر ہے اگر اسے اس مال کے جانے کا غم ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ خدا کی محبت کا جھوٹا دعوے دار ہے۔ پھر زکوٰۃ سے بخل کی عادت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بخل کا سب سے موثر علاج جو انسان پر بہت شاق گزرتا ہے۔ یہ ہے کہ انسان اپنا مال بغیر کسی فائدے کی امید کے خرچ کر ڈالے، یعنی کسی کو دے دے اور اس پر کوئی فوری فائدہ بھی اسے نہ حاصل ہو۔ اسی لیے زکوٰۃ کو پاک کرنے والا کہا گیا ہے کہ وہ بخل جیسے رذیل اخلاق سے انسان کو پاک کر دیتا ہے، کسی محسن کے احسان پر اس کا شکر ادا کرنے کے جہاں مختلف طریقے ہیں ان میں سے دو طریقے یہ ہیں کہ زبانی اس کا شکریہ ادا کیا جائے یا محسن جسے محبوب رکھتا ہو اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے۔ اب یہاں دیکھیے اللہ کی نعمت انسان کے جسم کے لیے بھی ہوتی ہے اور مال پر بھی، تو بدن کی نعمت تو یہ ہوئی کہ وہ بدن ہی سے عبادت کر کے اس کا شکر ادا کرے اور مال کا شکریہ ہو گا کہ اس کے دیے ہوئے مال میں سے اس کی مخلوق کی خدمت کی جائے۔

قرآن پاک پڑھنے کے آداب

اس سلسلے میں سب سے پہلے ابو امامہ باہلی کی رائے سننے کے قابل ہے ''قرآن کو جزدان میں لٹکا لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، تم اس کو پڑھو، سمجھو اور عمل کرو''۔ انسان کو

چاہیے کہ اس بات کا خیال رکھے کہ جو بات قرآن سمجھنے میں حجاب بنتی ہو ان سے دور رہے۔ مثلاً کوئی قرآن کے حروف اور ظاہری حسن ہی کی طرف متوجہ رہے، اچھے انداز پر پڑھنے کے لیے مہینوں قرأت ہی کی مشق کرتا رہے، یا اپنی عقل سے کام لینا ترک کردے، محض دوسروں کی تفسیر اور شرح پڑھ کر قرآن سمجھنے کی کوشش کرے اور یہ دماغ میں جما لے کہ بس ان قدیم تفاسیر و شرح کے علاوہ قرآن کے اور معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ جو مفسرین نے بیان کر دیا ہے وہی حرف آخر ہے۔

بعض لوگ قرآن کے معنوں کو صرف ظاہری تفسیر تک منحصر سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ فہم و تدبر والوں کے لیے قرآن کے معنوں میں بڑی گنجایش رکھی گئی ہے، پھر اگر قرآن کے معنی صرف وہ ترجمے ہی ہیں جو اوپر سے نقل ہوتے چلے آرہے ہیں تو اس قول میں کہ ''خدا اپنی کتاب کی سمجھ کسی کسی بندے کو عطا فرماتا ہے'' لفظ سمجھ سے کیا مطلب ہے۔ پھر اگر نقل در نقل تفسیر ہی قرآن کا سارا مفہوم ہے تو حضورؐ نے فرمایا ''قرآن کا ایک ظاہر ہے ایک باطن ہے'' اس کا کیا مطلب ہوا۔ اور حضرت علیؓ کا فرمانا کہ اگر میں چاہوں تو صرف سورہ الحمد کی اتنی تفسیریں لکھوں کہ ستر اونٹ نہ اٹھا سکیں اس کا کیا مطلب ہے۔

جسے واقعتاً علم کی تلاش ہو اور علم کے گہرے سمندر میں اترنا چاہے۔ اسے چاہیے کہ وہ قرآن کی بحث کرے مگر یہ بحث ظاہری تفاسیر سے متعلق ہو تو فائدہ نہ دے گی۔ قرآن میں خدا کی ذات، اس کی صفات، اس کے افعال کا ذکر ہے لیکن ان تینوں میں گھسنا اور ان کو پا جانا یہ قرآن سمجھنے پر منحصر ہے صرف پچھلی تفسیر و تشریح سے چمٹ کر نہ رہ جائے۔ بہت سے رموز و اشارات جو پہلے لوگوں پر نہ کھل سکے ہوں، فہم والوں پر آسان ہو سکتے ہیں اسی لیے حکم دیا گیا ہے ''قرآن کو پڑھو اور اس کے عجائبات کو تلاش کرو''۔

اختلافات و انتشار سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ بتایا گیا ہے کہ لوگ قرآن کو مضبوطی

سے تھام لیں اور اس پر عمل کریں۔ کچھ لوگ قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کرنے کو منع کرتے ہیں۔ اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ آدمی نے پہلے سے ایک رائے قایم کر لی، پھر قرآن کی آیتوں کو اپنی رائے اور نظریے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے یعنی کھینچ تان کر اپنی رائے سے ایسی تفسیر کرے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ مراد نہیں ہے مگر لوگوں کو دھوکے میں رکھنا چاہتا ہے یہاں اس تفسیر کا باعث اس کی پہلے سے بنی ہوئی رائے ہے، اگر رائے پہلے سے نہ بن گئی ہوتی تو یہ تفسیر بھی نہ ہوتی۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کا ایک صحیح مطلب ہوتا ہے، اس مطلب کے لیے قرآن سے ان آیتوں کو دلیل کے طور پر لایا جاتا ہے، جن آیتوں کا وہ مفہوم نہیں ہوتا مگر کھینچ تان کر اپنی رائے سے مطلب کے مطابق بنا لیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تفسیر واعظ لوگ اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، یہ قرآن کے معانی و مطالب کو اپنی رائے کے مطابق کرنا ہے۔ دوسری اہم شرط یہ ہے کہ تفسیر میں رائے کا اس کو اختیار ہے جو عربی زبان پر کامل قدرت رکھتا ہو۔ جب قرآن عربی میں ہے اور عربی کی وسعت اپنے دامن میں بہت سے پہلو رکھتی ہے تو کس طرح ممکن ہے کہ زبان میں شد بد رکھنے والا یا بالکل زبان نہ جاننے والا تفسیر پیش کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی تفسیر قرآن کے لیے ایک اور بنیادی شرط ہے کہ مختلف علوم پر گہری نگاہ ہو۔ اہل بصیرت نے تجربے کے بعد بتایا ہے کہ قرآن ستہتر ہزار دو سو علوم پر حاوی ہے تو آج کے دور میں اتنا وسیع علم نہ سہی، قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے ضروری علوم پر تو نگاہ رکھنی ہی ہوگی۔ قرآن میں جن جن علوم کا احاطہ ہے ان کی تفصیل میں جایئے، تو دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ مجملاً یہ سمجھنا چاہیے کہ تمام علوم پر پوری دستگاہ کے بعد ہی کسی آیت کا اصلی مفہوم سمجھا جا سکتا ہے یا ذہن و رائے کی استقامت کچھ نتیجہ دے سکتی ہے۔ اب جو شخص اپنی ہمت کو کام میں لائے اور اس طرح علم میں جدوجہد کر چکا ہو اسے حق ہے کہ وہ قرآن کے بارے میں قدیم مفسرین کی رائے سے الگ سوچ سکے اور ان کی رائے پر تبصرہ کر سکے۔

بہر حال قرآن فہمی میں مانع عام طور پر یہ چند صورتیں ہوتی ہیں، مثلاً پڑھنے والا ظاہری الفاظ وحروف کی درستگی وادائیگی، لب ولہجے کی عمدگی کی طرف اس درجہ مائل ہو جائے کہ قرآن پڑھنے کا اصل مقصد ہی اس کے ذہن میں نہ رہے یعنی وہی مثال صادق آنے لگے کہ بادشاہ یا حاکم کا کوئی حکم نامہ آیا، سارے لوگ دوڑ پڑے، ہاتھوں ہاتھ لیا، بوسہ دیا، سر پر رکھا اور پھر الفاظ کی خوبصورتی، جملوں کے حسن، ترکیب کی بندش وروانی غرض خط کے ادبی محاسن اور لفظی صنعتوں میں کھو گئے یہ بالکل بھول گئے کہ اس خط کے ذریعے بادشاہ نے حکم کیا دیا ہے کیا مطالبہ کیا ہے اور اچانک جب کہ وہ خط کے ظاہر میں گم تھے اس بلا میں پھنس گئے کہ اگر بادشاہ کے حکم پر عمل کر لیتے تو اس بلا سے محفوظ رہتے۔

دوسرے یہ کہ کسی مفہوم کو سن کر اس کا مقلد ہو جائے، دل میں اس کی تیچ صرف سننے سے جم جائے، بصیرت اور مشاہدے کا اس میں کوئی دخل نہ ہو، ایسا شخص اپنے اعتقاد کی زنجیر میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے ایسے شخص کے دل میں بجز اس کے اعتقاد کے کوئی چیز داخل نہیں ہوتی، اس کی نظر صرف سنی سنائی باتوں پر منحصر ہو کر رہ جاتی ہے اگر کوئی نئی بات اس کے سامنے آتی ہے تو نفس انکار کرتا ہے کہ یہ بات تو اکابر کے عقیدے کے خلاف ہے، اسی لیے صوفیا نے ایسے علم کو جس پر لوگ صرف تقلید کی وجہ سے پابند ہو گئے ہیں حجاب بتایا ہے یا وہ علم جس کو مذہب کے متعصب گروہ نے کلمات جدل کے طور سکھلا دیے ہیں انکو آفت بتایا ہے، ورنہ علم حقیقی تو کشف اور نور بصیرت کا نام ہے تیسرا حجاب یہ ہے کہ علما کے قلوب خواہشات نفسانی یا اقتدار کی ہوس میں مصروف ہوں، یہ چیزیں آئینہ دل پر مثل زنگ کے ہیں، جس پر بصیرت قرآنی کا عکس پڑ ہی نہیں سکتا۔ چوتھے یہ کہ کوئی شرح یا تفسیر پڑھ لی ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ بس اب قرآن کے خزانوں کا باب بند ہو چکا ہے، اب اپنی عقل و دانش کی ساری صلاحیت بجائے قرآن فہمی کے تفسیر اور شرح کے سمجھنے میں لگا دے تو یہ بھی بڑا حجاب ہے۔ خلاصہ یہ کہ کلام کی عظمت سے متکلم کی عظمت ہوتی ہے اور متکلم کی عظمت کے لیے غور و فکر کرنا

ایک ضروری شرط ہے، جس کے لیے کلام کے معنی و مطلب پر بصیرت کے ساتھ مطلع ہونا پڑے گا۔ اس موقعے پر کوئی یہ نہ کہے کہ اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کو منع کیا گیا ہے، کیونکہ رائے سے تفسیر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا کی دی ہوئی نعمت عقل وفہم کو زنگ آلود کر دے یا دوسروں کی رائے کا غلام بنا دے بلکہ رائے سے تفسیر جو منع ہے وہ اس صورت میں ہے جبکہ قرآن کی آیتوں کو فاسد خیالات اور غلط خواہشات کے موافق توڑ مروڑ کر کرلیا جائے جیسا کہ پیچھے مجملاً ذکر آچکا ہے لیکن اجتہاد صحیح اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔ یا وہ شخص تفسیر کی جرأت نہ کرے جو محض عربی زبان کے سہارے مطالب و معانی کے فہم کا دعویٰ کرے کیونکہ قرآن کے ظاہری معانی میں بھی بہت سی باریکیاں ہیں مثلاً کہیں حذف جملہ ہے، کہیں معانی محذوف ہیں، کہیں ایک لفظ دوسرے سے بدلا ہوا ہے کبھی ایک لفظ مکرر لایا گیا ہے تا کہ مختلف معنی بتا سکے، کہیں تقدیم وتاخیر سے معنی میں فرق کیا گیا ہے، غرض ان سب کا ماہر ہونا ضروری ہے۔

قرآن پڑھنا عام عبادت کی طرح ایک عبادت ہے مگر باب العلم میں تعلیم کی جو فضیلت ذکر کی گئی ہے وہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ علم خود بھی ایک عبادت ہے۔ عالم اور پڑھا لکھا آدمی ہر بات کی صحت و درستگی کو جان کر صحیح صحیح عمل کرتا ہے بعض اوقات جہالت کی وجہ سے ساری زندگی کا عمل بے معنی کوشش ہو کر رہ جاتا ہے مگر علم سے مقصود وہی علم ہے جو انسان کو شریف، مہذب، بااخلاق، متواضع بنا دے۔ طلب جاہ و مال کے لیے جو علم ہوتا ہے اس کو نہیں کہہ سکتے کہ یہ علم ذکر و عبادت سے بہتر ہے۔ عالم اگر اپنا سارا وقت عبادت میں لگا دے تو یہ اس کے لیے بہتر نہ ہوگا، وہ اپنے اوقات کو علمی مشاغل میں زیادہ خرچ کرے اور اس سے فارغ ہو تو غور و فکر کرے، غور فکر عالم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ وہ ایسی چیزیں سوچے جو علم میں اضافے اور بڑھوتری کا سبب ہوں اور علمی مشکلات کو وقت پر حل کر سکیں، عالم اگر چاہے تو تھوڑا وقت عبادت میں لگائے لیکن وقت کا

اکثر حصہ تعلیم و تعلم، تصنیف و تالیف، مطالعہ و کتب بینی میں گزار دے۔ اگر طالب علم ہے تو اپنی پڑھائی میں محنت کرنا۔ زائد عبادت سے بہتر ہے۔ اسی طرح اہل زراعت، اہل حرفہ و صنعت جو اپنے متعلقین کے لیے کما رہے ہیں انہیں ضروری نہیں ہے کہ عبادت میں زیادہ وقت لگا کر اپنے کام میں حرج کریں، ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی بھی ذریعہ آمدنی ہو کوئی بھی پیشہ ہو، اس میں انسان ذمہ داری، فرض، وقت اور کام کی پابندی اور دیانت داری سے غافل نہ رہے۔ اس کے لیے یہی عبادت ہوگی، اگر اس کی کوشش اور جدوجہد سے دوسروں کو فائدہ پہنچے تو اس سے بڑی عبادت کیا ہوگی اور خدا کی عبادت یہ بھی ہے کہ ہر کام دیانت داری اور ایمان داری سے کرے، حاکم اور ذمہ دار شخص کو اپنی ذمہ داری کو پوری طرح نبھانا ہی عبادت ہے، ضروری عبادت کے علاوہ انہیں اپنے کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ عبادت میں وہ عبادت سب سے بہتر اور افضل ہے جس کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہو۔

جلد دوم

اسلام کی اخلاقی تعلیمات

کھانے پینے کے آداب

اللہ کی رحمت اور اس کی رضا کا حاصل ہونا علم وعمل پر منحصر ہے، اور علم وعمل بدن کی صحت وسلامتی کے بغیر پوری طرح حاصل نہیں ہوا کرتے، اور اس کے لیے وقت پر معقول اور مناسب غذا نہایت ضروری ہے، اسی لیے کہا گیا ہے "کھانا بھی عبادت ہے"۔ اسی بات کو خدا نے اپنی مخلوق سے فرمایا ہے پاک چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو۔ اب جو شخص کھانے پینے کو نیکی بھلائی اور اچھی زندگی کے لیے ذریعہ سمجھتا ہے وہ گویا عبادت کر رہا ہے۔ اسے مناسب نہیں کہ کھانے پر چوپائے کی طرح ٹوٹ پڑے۔

انسان کو غذا پاک وصاف حاصل کرنی چاہیے غذا خود بھی پاک وصاف ہو اور حلال طریقے سے حاصل کی گئی ہو، دھوکہ دہی سے، ایک دوسرے کا مال ناحق طور سے، ناراضگی سے لڑ جھگڑ کر، چوری اور ڈاکے سے ان طریقوں سے ہرگز مال یا رزق نہ حاصل کرنا چاہیے، کھانے میں اور کھانے سے قبل ہر چیز میں صفائی، نظافت اور پاکی کا پورا خیال رکھنا چاہیے، کھانا اس وقت شروع کرے۔ جب بھوک زور پر ہو اور اس وقت ہاتھ روک لے جب بھوک باقی ہو جو شخص اس بات کی عادت ڈال لے گا۔ وہ طبیب یا دوا کا محتاج نہ رہے گا۔ جو کچھ کھانا سامنے آئے اس پر صبر شکر کرے' زیادہ لذیذ کھانوں کے لیے محنت نہ کرے' کھانے کی عزت کرنی چاہیے۔ نہ کھانے کی طرف پیر کرے اور نہ ٹیک لگا کر کھائے جس سے بے پرواہی ظاہر ہو۔ چھوٹا لقمہ لے اور خوب چبا کر کھائے تاکہ چبانے کا کام ہاضمے کو نہ کرنا پڑے' کسی قسم کا کھانا ہو کھانے کی برائی نہ کرے' کوئی عیب نہ نکالے' اچھا معلوم ہو تو کھالے ورنہ خاموشی سے چھوڑ دے۔ دستر خوان پر کھانا اپنی طرف سے کھائے لیکن میوہ ہو تو کسی طرف سے بھی لے سکتا ہے۔ بعض لوگ روٹی کا درمیانی حصہ کھا کر کنارا چھوڑ دیتے ہیں یہ بات ٹھیک نہیں ہے' کھانا گرم ہو تو اس میں یا پانی وغیرہ میں پھونک نہ مارے' اس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرلے۔ گٹھلی جو پھل کھا کر منہ سے نکالے اسے پھل

ساتھ جمع نہ کرے بلکہ الگ پلیٹ میں رکھے۔ پانی پیئے تو چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے اور پانی کے برتن میں سانس نہ لے بلکہ برتن سے منہ ہٹا کر سانس لے پھر دوسرا گھونٹ لے۔ جب تک دسترخوان اُٹھا نہ لیا جائے خود بھی نہ اُٹھے' اگر کسی نے دعوت کی ہے تو کھانا کھا کر زیادہ اس کے پاس نہ بیٹھے۔ شاید وہ کوئی اور کام کرنا چاہتا ہو اس لیے اگر اس کی خواہش ہو تو بیٹھے ورنہ اجازت لے کر اُٹھ جائے۔ کھانے کے بعد بہتر ہے کہ صابن یا کسی ایسی ہی چیز سے ہاتھ منہ صاف کرے تا کہ کسی قسم کی بُو اور چکنائی نہ رہ جائے اور ناخن وغیرہ پر کھانے کا اثر نہ رہ جائے۔ مجمع میں کھانے کے آداب یہ ہیں کہ مجلس میں اگر کوئی عمر کے لحاظ سے بزرگ اور قابل احترام ہو تو کھانا خود نہ شروع کرے لیکن اگر خود ہی سب سے بڑا ہے اور لوگ احترام کر رہے ہیں تو کھانا شروع کرنے میں دیر نہ کرے کہ لوگوں کو انتظار کرنا پڑے۔ کھانے کے وقت بالکل خاموش نہ رہے' عمدہ گفتگو کرے اور کھانے کے سلسلے میں دلچسپ باتیں کرے کبھی کھانے کی تعریف کر کے میزبان کا دل خوش کرتا رہے۔ ساتھ میں کھانا کھاتے وقت اپنے ساتھی کے ساتھ نرمی اور ایثار کا معاملہ کرے۔ یہ نہ چاہے کہ میں ہی زیادہ کھالوں۔ یہ خواہش کرے کہ میرا ساتھی یا پاس بیٹھنے والا زیادہ اور اچھی چیز لے لے۔ بعد میں خود میں لوں گا۔ اپنے ساتھی کو ہر حال میں اپنے اوپر ترجیح دے۔ ایک ایک بار میں دو دو چیزیں نہ اٹھائے نہ زیادہ زیادہ اٹھائے' مہمان کم کھائے تو محبت سے اصرار کر کے اُسے اور کھانے کو کہے مگر اس کی جان کو نہ آ جائے اور اس خلوص سے کہے جس سے اندازہ ہو کہ واقعی کھلانا مطلوب ہے محض رسم کے لیے نہیں کہہ رہا ہے۔ جب کسی ایسے دوست یا بھائی کو کھانا کھلاؤ جو رشتے دار عزیز نہیں ہے تو اس کے ساتھ دیر تک بیٹھو کیونکہ ایسے بھائی کو کھلانا ہی بڑی عبادت ہے۔ سفر میں عمدہ کھانا اس نیت سے رکھنا کہ راستے میں دوسرے بھائیوں پر خرچ کروں گا بہت بڑے کرم کی علامت ہے۔ خلوص کے ساتھ چند بھائیوں کا جمع ہونا' محبت کی باتیں کرنا' کھانا کھلانا نیک اور پسندیدہ لوگوں کا شیوہ ہے۔ اسی لیے

کہا گیا ہے کہ جب تمھارے پاس کوئی ملنے آئے تو اس کی تعظیم کرو اور تم لوگوں میں سے بہتر وہ شخص ہے جو دوسروں کو کھانا کھلائے۔ اگر کسی سے ملنے جانا ہے تو عین کھانے کے وقت نہ جائے اور اگر مالک خانہ کھانے پر بلائے تو فوراً نہ بیٹھ جائے کچھ تامل کرے، اگر یہ جان لے کہ یہ شخص تواضع، اخلاق اور محبت کے ساتھ دل سے کھلانا چاہتا ہے تو شریک ہو جائے اور اگر محض شرم اور رسم کی وجہ سے ہے تو خوبصورتی سے انکار کر دے۔ اگر مہمان آئے تو بلا تکلف جو کچھ حاضر ہو اس کو سامنے رکھ دے "تکلف نہ کرے" اگر کچھ نہ ہو اور پیسہ بھی نہ ہو تو تکلف نہ کرے اور قرض نہ لے اگر بلا تکلف جو حاضر ہے وہ پیش کر دے گا تو مہمان کے آنے سے کوئی زحمت محسوس نہ کرے گا۔ اگر میزبان دو کھانوں میں اختیار دے دے تو جو آسانی سے مہیا ہوتا ہو اس کی فرمائش کرے، کسی بزرگ نے کھانا کھلانے کے آداب میں سے یہ چیز بتائی ہے کہ اگر فقیر کو کھلاؤ تو اس کو اپنے اوپر ترجیح دو، ساتھیوں کو کھلاؤ تو کھیل کھیل کر، اور دنیا داروں کو کھلاؤ تو ادب کے ساتھ۔ مہمان سے فرمائش کرنے کو کہے اور اس کی فرمائش پوری بھی کرے مگر اس وقت جب کہ فرمائش سے جی خوش ہوتا ہو، ریاکاری یا دکھاوا نہ ہو۔ آنے والے سے دریافت نہ کرے کہ آپ کے لیے کھانا لاؤں، کھانا اگر موجود ہو تو لا کر رکھ دے، کھا لے تو، خیر، ورنہ اُٹھا لے، اگر کھلانا منظور نہ ہو تو بہتر ہے کہ کھانے کا ذکر ہی نہ کرے۔

ضیافت اور مہمان داری

اس سلسلے میں معلوم ہو چکا ہے کہ تکلف سے کام نہ لو ورنہ مہمان سے گھبرا جاؤ گے اور مہمان کو برا جاننے والا بہت برا ہوتا ہے۔ حج ایسی عبادت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ حجِ مقبول خوش کلامی اور مہمانوں کو کھانا کھلانے کا نام ہے، جس گھر میں مہمان نہیں آتے وہ اچھا گھر نہیں ہے، اس میں برکت نہیں ہوتی، اگر کوئی سمجھتا ہے کہ ہم نے مہمان کو کھانا کھلایا ہے تو یہ سخت بھول ہے۔ ہر شخص جب کہیں مہمان بن کر جاتا ہے تو اُس کا رزق اُس گھر میں پہلے

سے پہنچ جاتا ہے۔ دعوت صرف مالداروں ہی کی نہ کرے۔ فقرا اور غرباء کو بھی بلاتا رہے اور دعوت میں اپنے اعزا کو فراموش نہ کرے ورنہ وہ بدظن ہو جائیں گے اور تعلق منقطع ہو سکتا ہے اور دلوں کا توڑنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ دعوت' فخر جتانے کے لیے نہ کرے بلکہ خلوص اور محبت بڑھانے کے لیے آپس میں دعوت کرے۔

کوئی کسی کی دعوت کرے تو انکار نہ کرنا چاہیے' قبول کر لینا چاہیے مگر صرف مال داروں ہی کی دعوت قبول نہ کرے، غریب' کم حیثیت اور اپنے ماتحت لوگوں کی دعوت بھی قبول کر لے۔ اگر یہ احساس ہو یا کسی طرح معلوم ہو جائے کہ دعوت کرنے والا کھلانے میں گرانی محسوس کرتا ہے یا محض نام و نمود' فخر و نمائش کے لیے کھلا رہا ہے تو اس کی دعوت قبول کرنی ضروری نہیں ہے بلکہ حیلہ کر دینا بہتر ہے۔ اگر دعوت کرنے والے کا گھر دور ہو تو صرف دوری کی وجہ سے انکار کر کے اس کی دل شکنی نہ کرے۔ یہ بڑائی اور شرافت سے بہت بعید بات ہے' اسی طرح دعوت کرنے والا مفلس ہو' ذی وجاہت نہ ہو' آپ کا ملازم ہو۔ عزت میں آپ سے کم ہو تب بھی اس کی دعوت سے انکار نہ کرے' اگر نفلی روزہ رکھا ہے اور دن میں کسی نے دعوت کر دی ہے تو بھی انکار نہ کرے' ضرور چلا جائے' وہاں جا کر عذر کر دے لیکن صاحب خانہ اگر اصرار کر رہا ہے کہ میرے ساتھ کھانا کھالو' تو انکار نہ کرے روزہ افطار کر لے اور اس کے ساتھ کھانا کھائے۔ ایک شخص نے دعوت میں جا کر روزے کا عذر کیا۔ حضورؐ نے فرمایا ''تیرے ایک بھائی نے تیرے لیے تکلیف اُٹھائی اور تو کہہ رہا ہے کہ میرا روزہ ہے'' اپنے دوستوں کے لیے روزہ افطار کر لینا ہی بہت بڑی نیکی ہے اور خوش اخلاقی ہے دعوت قبول کرنے میں یہ نیت ہرگز نہ کرے کہ اس طرح اپنے گھر کا کھانا بچا رہا ہے بلکہ نیت درست رکھے کہ اپنے بھائی کا دل رکھنے کے لیے قبول کر رہا ہے۔ ہر کام کو نیت کی خوبی پاکیزہ بنا دیتی ہے' مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اچھی نیت سے کوئی بُرا کام کرے گا تو وہ بھی اچھا ہو جائے گا۔ بُرا کام بہر حال بُرا ہوتا ہے۔ کسی کے

یہاں دعوت میں جائے تو خود ہی صدر مقام پر نہ بیٹھ جائے۔ سادگی سے جہاں جگہ ملے بیٹھ جائے۔ دوسرے یہ کہ جانے میں وقت مقررہ سے تاخیر نہ کرے۔ نہ اس قدر جلد پہنچے کہ مالک مکان کو انتظام میں پریشانی ہو۔ زیادہ لوگ ہوں تو دوسروں کا خیال رکھے۔ صاحب خانہ کے انتظام میں دخل نہ دے۔ نہ صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے مہمان کی تواضع کرے۔ جہاں کھانا پک رہا ہو یا اُترنے کا انتظام ہو اس طرف بار بار نہ دیکھے' اس سے حرص ولالچ ظاہر ہوتی ہے' لوگوں کے آ جانے کے بعد جلد کھانا لے آئے۔ اس میں مہمان کی تعظیم ہے۔ کھانے میں شیرینی رکھنا بہت سے کھانے تیار کرنے سے بہتر ہے اور سبز چیزوں سے ضرور اپنے دستر خوان کو زینت دو۔ ان چیزوں سے دستر خوان کو زینت' آنکھوں کو فرحت اور صحت کے لیے مفید اجزا مل جاتے ہیں۔ جب تک تمام مہمان کھانے سے ہاتھ نہ کھینچ لیں دستر خوان نہ اٹھائے۔ نہ میزبان خود اُٹھے ورنہ مہمان حیا کریں گے' مہمان کو واپسی میں دروازے تک ضرور پہنچائے۔ یہ بڑی شرافت اور اخلاق کی بات ہے' جب کوئی مہمان یا عزیز آئے تو پورے وقت میں کشادہ رُو رہنا' اچھی اچھی باتیں کرنا' باتوں سے اُسے خوش رکھنا اس کی بڑی تعظیم ہے۔ مہمان کو چاہیے کہ اگرچہ اس کی خاطر میں کچھ کمی رہ گئی ہو لیکن جب کھانا کھا کر واپس ہو تو خوش دلی کا ثبوت دے۔ یہ سب سے بڑی خوش خلقی ہے۔ مہمان جب واپسی کا ارادہ کرے تو میزبان سے اجازت لے اور اگر کسی کے گھر پر ٹھہرنا ہے تو تین دن سے زیادہ نہ ٹھہرے ورنہ میزبان کے اُکتا جانے کا خطرہ ہے۔ پچھلے لوگوں سے کچھ آداب اس طرح منقول ہیں۔

بازار میں چلتے پھرتے نہ کھانا چاہیے۔ جو زیادہ عمر کا خواہاں ہے اُسے چاہیے کہ دن کا کھانا سویرے کھائے اور شام کو کم کھائے' اپنے ذمے قرض کا زیادہ بوجھ نہ لے۔ بغیر مرض کے دوا نہ پیئے۔ غذا خوب چبانی چاہیے۔ غذا پر پانی نہ پیے۔ دن کے کھانے کے بعد سونا' آرام اور رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرنا نہایت مفید ہے۔ سوتے وقت سُرمہ

اگائے۔ سبزے کو اکثر دیکھے لباس صاف رکھے اس سے روح کو فرحت اور بینائی کو قوت حاصل ہوتی ہے۔

نکاح کے فوائد

امور خانہ داری یا گھر کا انتظام جو ایک بڑا مسئلہ ہے مرد کو اس سے فراغت رہتی ہے اور وہ علم و عمل اور دوسرے مفید کاموں میں مصروف رہ سکتا ہے پھر نکاح سے انسان کو اپنے نفس پر مجاہدہ اور ریاضت کرنے کا موقع ملتا ہے وہ صبر کرنے کا عادی ہو جاتا ہے گھر کی رعایت، گھر والوں کے حقوق کی ادائیگی ان کی عادتوں اور طبیعتوں کے خلاف بہت سی پیش آنے والی باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ پھر ان کی اصلاح کی فکر ہوتی ہے ان کی خاطر حلال رزق میں کوشش کرنی پڑتی ہے پھر اولاد کی تربیت کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے اور یہ سب امور ریاضت اور محنت کے طالب ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص محض اپنے نفس کی اصلاح میں لگا ہوا ہے اس سے بہتر وہ شخص ہے جو دوسروں کی اور اپنے متعلقین کی اصلاح کی فکر کرتا ہے۔ جو شخص عیال دار ہو کسی سے کچھ نہ مانگتا ہو رات کو اٹھ کر اپنے بچوں کو ننگا دیکھے تو ان کو کپڑے اڑھا دے تو اس کا یہ عمل ہزار عبادت سے بہتر ہے۔

آدابِ معاشرت

عورتوں کے ساتھ خوش خلقی اور نرمی سے پیش آنا چاہیے اگر ان سے کوئی ناسمجھی کی بات پیش آ جائے تو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ اللہ نے حکم دیا ہے عورتوں کے حقوق کی تعظیم کرو اور اپنی رفیق زندگی کے ساتھ نیکی کرو۔ ان کو بہتر سے بہتر تعلیم دو تا کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت اچھی طرح سے کر سکیں کیونکہ اگر عورت خود ہی مؤدب نہیں ہوگی اس کو اچھی تعلیم و معاشرت حاصل نہ ہوگی تو اپنے بچوں کو کیا ادب سکھائے گی۔ عورت سے کوئی خطا ہو جائے تو اس کو برداشت کرے نہ صرف یہ کہ برداشت کرے بلکہ اسے معاف کر کے ان

سے ہنسی مذاق کرتا رہے تاکہ اسے احساس افسردگی نہ ہو۔ کامل ترین اخلاق اُس شخص کا ہے جو اچھے اخلاق رکھتا ہو اور اپنے گھر والوں کے ساتھ ملایم ہو۔ انسانوں میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے حق میں نرم ہو۔ عقلمند کی نشانی ہی یہ ہے کہ اپنے بچوں میں بچوں کی طرح رہے اور قوم کے جماعت کے درمیان مرد کی طرح رہے۔ عورت پر عام طور پر بد گمانی نہ کرے نہ اس کے باطن کی جستجو کرے۔ مرد کو یہ مناسب نہیں کہ خود عمدہ کھانے کھائے اور اہل و عیال کو خراب کھانے کھلائے' جب کھانا کھانے بیٹھے تو بیوی بچوں کو ساتھ بٹھا لے۔ بچوں سے محبت کرے اور اولاد میں لڑکی کا زیادہ خیال کرے' انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرے' بازار سے جو کچھ خریدے اس میں بے انصافی نہ کرے' جو چیز لڑکے کے لیے خریدے وہی لڑکی کے لیے بھی خریدے۔

کسبِ معاش کا بیان

یہ دنیا محنت اور کمائی کی جگہ ہے' دنیا اور معاش بھی نیکی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ کہا گیا ہے "دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔" دنیا میں پھنس کر آخرت سے غافل نہ ہو' نہ زہد و عبادت میں دنیا کو چھوڑ بیٹھے۔ خدا نے رات آرام اور عبادت کے لیے اور دن معاش حاصل کرنے کے لیے بنایا ہے' طلب رزق میں سفر کرنا' بلند ہمتی کے ساتھ دور دراز جانا' پوری جدوجہد اور کوشش کرنا پسندیدہ ہے۔ کہا گیا ہے "زمین پر پھیل جاؤ اور خدا کا فضل تلاش کرو۔" اور کہا گیا ہے "جو شخص دنیا کو حلال طریقے سے کمائے تاکہ وہ سوال کی ذلّت سے بچے' اپنے اہل و عیال کی خدمت کرے، ہمسائے پر خرچ کرے تو ایسے شخص کا چہرہ منوّر اور چمک دار ہوگا۔" اور کمائی میں سب سے بہتر ذریعہ تجارت ہے کیونکہ اس میں دس حصے رزق میں سے نو حصے رزق کے رکھ دیے گئے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ عبادت کر رہا ہے۔ آپ نے اُس سے پوچھا تیرا کفیل کون ہے۔ اُس نے جواب دیا میرا بھائی میری ضرورتیں اور اپنے بچوں کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ جدوجہد

کرتا ہے۔آپ نے فرمایا وہ تجھ سے زیادہ عابد ہے۔رزق کو اچھی طرح حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ رزق طلب کرنا' تلاش کرنا کوئی بیکار بات ہے' ابراہیم نخعی نے عابدِ مخلص اور سچے تاجر میں سے سچے تاجر کو ترجیح دی ہے اور فرمایا کہ سچا تاجر گویا ہر وقت جہاد کرتا ہے۔

جہاں تک ہو سکے ہر معاملے میں' تجارت اور پیشے کے بارے میں بنیادی علم کا ہونا ضروری ہے پچھلے ذمے دار لوگ مثلاً خلیفہ دوم حضرت عمرؓ بازاروں میں یہ تاکید رکھتے کہ خرید وفروخت اور دوسرے معاملات وہی شخص کامیابی حاصل کرسکتا ہے جسے تجارت کا پہلے سے علم ہو۔

تجارت کے تین ارکان ہوتے ہیں' نمبر اول عاقد یعنی معاملہ کرنے والا اس میں تاجر کو چاہیے کہ بچے' مجنون' پاگل اور اندھے وغیرہ سے معاملہ نہ کرے کیونکہ ان کا اعتبار نہیں ہے۔ان سے معاملہ' معاملہ نہیں سمجھا جائے گا۔کیوں کہ اس میں دھوکے کا بہت امکان رہتا ہے۔دوسرا رکن وہ معاملہ اور وہ چیز ہے جس کی بیع ہو رہی ہے۔وہ مال چوری کا' چھینا ہوا یا ناقص نہ ہو' تیسری بات یہ ہے کہ جس کا مال ہو اس کی اجازت سے فروخت کیا جائے ایسا نہیں کہ مال کسی اور کا ہو اور بغیر پوچھے ہوئے کوئی فروخت کردے۔کوئی چیز بیچتے یا خریدتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھے کہ کھوٹا یا خراب سکّہ نہ دے' یہ ایک طرح کا دھوکا ہے جس کا اثر پورے معاشرے پر پڑتا ہے۔معاملات میں عدل سے کام لینا ظلم سے بچنا ضروری ہے' ظلم کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملے سے کسی کو نقصان نہ پہنچنا چاہیے۔

کسی نے غلّہ جمع کیا اور اس نیت سے فروخت نہیں کر رہا ہے کہ جب خوب گرانی ہوگی تب فروخت کرے گا' یہ سخت دلی اور غیرانسانی حرکت ہوگی' ویسے عام طور پر اس حرکت کی سخت ممانعت ہے لیکن جب غلّہ مہنگا یا بازار میں کم ملتا ہو تب تو ہرگز یہ فعل نہ کرنا چاہیے' اسی طرح دوسرا ظلم وہی ہے یعنی کھوٹے سکّے کو رواج دیا جائے اس کا ضرر اور فساد عام ہوتا چلا

جائے گا‘ یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ دوسروں کے لیے وہی بات پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو‘ تو ایسا کون شخص ہے جو کھوٹا سکّہ لینا پسند کرے گا‘ تجارت میں عدل کا خیال رکھے عدل کا مطلب یہی ہے کہ اپنے بھائی کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچائے۔ جو بات ایسی ہو کہ کوئی تمھارے ساتھ کرے تو ناپسند و ناگوار ہو تو وہ بات خود بھی دوسروں کے لیے نہ کرے‘ حوصلہ اتنا ہو کہ دوسروں کا مال اور اپنا مال اپنی نگاہ میں برابر ہو‘ اس کے لیے اس بات کا خیال رکھے کہ دوسروں کا پیسہ لینے کے لیے سامان میں جو خوبی نہ ہو اُسے ہرگز بیان نہ کرے اور سامان میں جو عیب ہو اس کو کھول کر بیان کر دے۔ نرخ اور بھاؤ نہ چھپائے صاف اور صحیح صحیح بتا دے۔ کاریگر کے لیے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ کل پرسوں کا وعدہ کرتا رہے اور گاہک پریشان ہو‘ سامان میں جو عیب ہو اُسے کھول کر بیان کر دے‘ عیب چھپا کر بیچنے والا سخت دل اور ظالم ہے جو چند پیسوں کی خاطر اپنے بھائی کو دھوکے دے رہا ہے۔ کپڑے کا اچھا رُخ سامنے رکھنا اور بُرا تھان کے اندر لپیٹ دینا دغابازی ہے‘ ایسے ہی سامان کو اندھیرے میں دکھانا یا اچھا سامان دکھلا کر بُرا دینا سخت دغابازی ہے۔ اور اپنے بھائی کے ساتھ دغا و فریب حرام ہے‘ غلّے میں اچھا حصّہ اوپر رکھنا اور بُرا نیچے یا اندر والا حصّہ بھگو دینا کہ تول میں کم چڑھے گا‘ یہ سب بے ایمانی اور بد دیانتی ہے‘ ایمان کی سب سے بنیادی اور پہلی شرط یہ ہے کہ دوسروں کے جان و مال کو اپنی جان و مال کی طرح سمجھے اور دغا و فریب دینے سے بچے‘ یہ بات اسی وقت پیدا ہو گی جب اس کو اس بات کا یقین ہو کہ عیب کو چھپا کر سامان بیچنے سے‘ یا لوگوں کو دھوکا دے کر‘ میں اپنے کاروبار کو نفع نہیں پہنچا سکتا بلکہ نقصان ہی میں رہوں گا‘ پچھلے لوگ اپنے سامان کے بکنے کا یا نفع حاصل ہونے کا اتنا خیال نہیں رکھتے جتنا ایک بھائی کو دھوکا دینے سے اور اس کو جھوٹ بول کر لوٹنے سے گھبراتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی انسان کو دھوکا دے کر مال بڑھانے کا وبال ہمیشہ ہماری گردن پر رہے گا۔ ایمان داری‘ سچ کا نفع۔ مال کے نفع سے زیادہ ہے۔ چند پیسوں کے عوض اس دولت کو چھوڑنا سخت

نادانی ہے۔ جب لوگ اس قسم کی نادانی کرنے لگیں اور پھر اپنے مسلمان ہونے کا بھی دعویٰ کریں تو ان کا اعتبار نہ کرو۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں' ان کے دل خدا کے خوف سے خالی ہیں' وہ حرام چیزوں سے نہیں بچتے۔ کیونکہ ایک بھائی کو دغا اور فریب دینا سب سے بڑا جرم ہے مگر اس کی انھیں پرواہ نہیں ہے' حالانکہ اسلام کی تعلیم ہے کہ اپنے ہر بھائی کی خیر خواہی کی جائے۔ کاریگر کو ہرگز یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے کام میں سستی کرے۔ اسے یہ خیال کرنا چاہیے کہ اگر کاروبار اس کا اپنا ہوتا اور کوئی ملازم کاریگر اپنے کام میں سستی کرتا تو اُسے کس قدر دکھ ہوتا' اس لیے اُسے اپنا کام ایمان داری' دیانت داری اور محبت و محنت سے کرنا چاہیے' چیز یا مال کی مقدار میں کسی قسم کی دغا بازی نہ کرے' تولتے وقت اس بات کا پورا پورا خیال رکھے۔ اس قسم کے حقوق کی پابندی کی جو بار بار تاکید ہے وہ اس لیے ہے کہ یہ بندوں کے حقوق ہیں' خدا انھیں معاف نہیں کرے گا اور اگر عادت ہی پڑ گئی تو ہزاروں لوگوں کے حقوق ہوں گے کس کس کو یاد رکھے گا۔ کس کس سے معافی مانگے گا۔ بعض بزرگ خدا کے حکم کے خلاف گناہ کرنے سے ڈرتے تھے' بچتے تھے مگر اس سے اس قدر حیران و پریشان نہیں ہوتے تھے جس قدر مخلوق کے حقوق اور تکلیف سے کیونکہ اس کا تو معاف ہونا بھی مشکل ہوتا ہے۔

ایک صورت معاملات میں احسان کرنے کی ہے۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایسا کام کر جائے جس میں دوسرے کا نفع زیادہ پیشِ نظر ہو۔ اگرچہ وہ کام اُس پر ضروری نہ ہو مگر حُسنِ سلوک کے طور ہی سہی اس کے نفع کا کام کرے۔ یہ بہترین شرافت اور اخلاق کا معاملہ ہے۔ یعنی نفع ضرور لے' تجارت بلا نفع کے بے معنی ہے' مگر حتی الامکان زیادہ نفع نہ لے' دوسرے بھائی کا خیال رکھے۔ کسی ضرورت مند کو معمولی نفع پر کوئی چیز دے دینا بھی احسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے تجارت کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ تھوڑا منافع لینے والا چند ہی دن میں چمک جاتا ہے۔ بس ذرا ہوس کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اتنی ہوشیاری رہے کوئی دھوکا نہ دے سکے اور نہ خود کسی کو دھوکا دے۔ کرم اور اخلاق اس قدر بلند

ہو کہ کسی بھائی کو دھوکا دینے کا تصور بھی نہ آئے اور عقل اس قدر بیدار ہو کہ کوئی دھوکا دے ہی بھی نہ سکے۔ کسی سے قیمت اور قرضہ وصول کرنے میں بھی احسان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے بظاہر تین طریقے ہیں (۱) جس قدر قرض دیا ہے اس میں سے کچھ معاف کر سکے تو معاف کر دے (۲) قرض مال لینے والے کو قیمت کی ادائیگی میں مہلت دے دے اور وقت میں توسیع کر دے۔ ممکن ہے وعدے پر وہ پریشان رہا ہو۔ اگر وہ تھوڑے تھوڑے کر کے پیسے دینا چاہتا ہے تو اسے مجبور جانے اور اسی طرح قبول کر لے۔

قرض دینا بڑی اچھی بات اور بھائی چارے کی علامت ہے بلکہ صدقہ تو محتاج اور غیر محتاج دونوں کو مل سکتا ہے مگر قرض وہی لیتا ہے جو بہت زیادہ محتاج اور حالات سے پریشان ہو جاتا ہے۔

قرض ادا کرنے میں احسان کی صورت یہ ہے کہ حق والے کا حق اس کے پاس پہنچا دے۔ یہ نہ ہو کہ اس کو تقاضے کے لیے تکلیف کرنی پڑے۔ جس طرح اور جہاں لین دین طے ہوا ہے اس کا خیال رکھے اور ادائیگی میں یا قرض دینے میں شرافت اور وقار کا خیال رکھے۔ کسی غریب اور فقیر کو کچھ دیتے ہوئے بہتر ہے کہ یہ ارادہ کر لے کہ اگر یہ نہ واپس کر سکا تو میں معاف کر دوں گا۔ اب اگر وہ دے سکے تو واپس لے لے اور دینے کے قابل نہ ہوا تو نہ اُسے انتظار رہے گا نہ تکلیف ہوگی۔ اس قسم کے معاملات کرنے والے لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ''جس کی تعریف محلّے کے پڑوسی، سفر کے رفیق اور بازار میں اہل معاملہ کریں وہ سب سے بڑا دیندار اور شریف انسان ہے۔'' تجارت اپنے دوسرے بھائیوں کی مدد کا بہترین ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر انسان کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے ذرا اپنے ارادے اور نیت کا جائزہ لے لے، مثلاً وہ سوچے کہ اپنے اس کاروبار سے ایک طرف میں دوسروں کا دستِ نگر ہونے سے، دوسروں سے سوال کرنے سے بچ سکوں گا تو دوسری طرف اپنے اہل وعیال، اور دوسرے تمام انسانوں کی خیر خواہی کر سکوں گا۔ کم قیمت پر مال دے

کران کی ضروریات میں آسانی پیدا کروں گا' چنانچہ کبھی دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں اپنے مفاد' اپنی پسند ہی کو سب کچھ نہ سمجھ لے بلکہ دوسروں کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

اپنی صنعت اور کاروبار کو محض دنیاداری یا مال جمع کرنے کا ذریعہ ہی نہ بنالے بلکہ صدق دلی سے یہ خیال کرے کہ یہ ایک فرض کفایہ ہے کیونکہ اگر تمام لوگ صنعت اور کاروبار چھوڑ دیں تو معاش کا کاروبار ٹھپ ہوجائے۔ دنیا کا نظام ایک دوسرے کی معاونت اور مدد سے ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر تمام لوگ ایک ہی طرح کی صنعت یا کاروبار شروع کردیں تب بھی معیشت پر اثر پڑسکتا ہے۔ اس لیے معاشرے کے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے الگ الگ صنعتوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔

سوال یہ ہے آدمی کے پاس کہیں سے کچھ مال آئے تو کیا اس کی تحقیق و جستجو کرنی چاہیے یا نہیں؟ تو تحقیق ضرور کرے مگر جہاں مال میں یا مال والے کے بارے میں کچھ شبہ ہو وہاں تحقیق کرسکتا ہے۔ بہرحال عام حالات میں کسی پر بلاوجہ شبہ نہ کرنا چاہیے بلکہ انسان کے حالات کو اچھے گمان پر محمول کرنا چاہیے' ہوسکتا ہے تحقیقِ حال یا جستجو سے کسی کے دل کو تکلیف پہنچے' اور کسی کے دل کو تکلیف پہنچانا بڑے عذاب کا کام ہے۔ قرآن نے صاف منع کیا ہے۔ ''بہت زیادہ تہمتوں سے بچتے رہو کیونکہ بعض تہمت گناہ ہے اور نہ ایک دوسرے کے بھید تلاش کرو، نہ کسی کو پیٹھ پیچھے بُرا کہو۔''

اگر صاحب مال کے ظاہری حالات ایسے خراب ہوں جس سے اس کی فطری لاپرواہی اور عام بدعنوانی ثابت ہوتی ہو اور اُس سے کوئی مال مل رہا ہے تو اُسے لینے میں دو باتیں ہوسکتی ہیں یا تو قبضہ اور ملکیت کا اعتبار کرے اور کہے کہ مجھے اس کے عام حالات سے کیا بحث' میں یہ بدگمانی کیوں کروں کہ عام حالات خراب ہیں اسلیئے اس نے مال لینے

میں بھی بے احتیاطی کی ہوگی۔ مجھے تو اس کے قبضے سے اس کی ملکیت سے ایک چیز ملی ہے اور قبضہ وملکیت اصل ہے' اس لیے اس کا اعتبار کرتا ہوں اور مال بالکل ٹھیک ہے' تو یہ کہنا بھی صحیح ہوگا اور مال لے سکتا ہے۔ دوسری صورت احتیاط کی ہے اور وہ یہ ہے کہ عام حالات کا اعتبار کرے اور سوچے کہ جب یہ شخص اتنا بڑا ہے تو اُس کے قبضے کا کیا اعتبار' اس کی بُرائیاں اصل ہیں اور قبضہ ایک ثانوی اور ضعیف چیز ہے اس لیے اس کا مال لینا درست نہیں ہے کیونکہ حکم بھی یہی ہے ''جو چیز دل میں کھٹکے اُس کا لینا درست نہیں ہے۔''

دوستی اور تعلّقات کا بیان

خلوص کے ساتھ کسی سے بے غرض محبت اور دوستی کرنا بہترین عبادت ہے۔ اُلفت' محبت اور دوستی ہمیشہ خوش خلقی سے پیدا ہوتی ہے اور بد خلقی سے نفرت اور جدائی پیدا ہوتی ہے جس میں جس درجے کی خوش خلقی ہوگی اس کے اتنے ہی دوست ہوں گے۔ خوش خلقی کی مذہب میں اہمیت ہے اور انسانوں میں بڑی قابل قدر چیز ہے' اچھے اخلاق کی تعریف یوں کی گئی ہے ''جو تجھ سے دور ہونا چاہے اس سے محبت کر' جو تجھے کچھ نہ دے تو اس کی ضرورت پر جان ومال دونوں سے کام آ۔'' جب دوستی کی بنیاد خلوص ومحبت پر ہوتی ہے تو خدا کی رحمت اور اس کا فضل ساری مخلوق پر عام ہو جاتا ہے۔ اللہ کے لیے خلوص کے ساتھ کسی انسان سے محبت کرنے والے کا درجہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک بہت ہی بلند ہے۔

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے اگر کسی شخص کو کوئی مخلص اور سچا دوست اور بھائی مل جائے تو اسے مضبوطی سے پکڑ لے' کیونکہ ایسے آدمی کم ہی ملا کرتے ہیں' محبت اور شفقت سے کسی بھائی پر نظر ڈالنا بڑی عبادت ہے۔

کسی انسان سے محبت کی ایک قسم تو یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے محض اس کی ذات کے لیے محبت کرے' یعنی جب وہ اسکو دیکھے تو اُسے خوشی حاصل ہو۔ بعض اوقات

دو آدمیوں میں دوستی اور محبت ہوتی ہے اگر چہ کوئی ظاہری وجہ محبت کی‘ مثلاً مال‘ جمال‘ یا کمال نہیں ہوتی۔ تو اس وقت ان دونوں کے درمیان باطنی مناسبت ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی روح کا ملاپ کرتی ہے‘ تجربہ شاہد ہے کہ باہمی مناسبت ہو تو باہمی الفت بھی ہوتی ہے۔ کسی مجلس میں بہت سے افراد جمع ہوں‘ وہاں دو شخص آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور وہ وہی دو شخص ہوں گے جن میں باہمی مناسبت ہوگی‘ اکثر یہ کشش غیر شعوری ہوتی ہے‘ خود ملنے والوں کو علم و احساس نہیں ہوتا مگر طبیعت کھنچتی ہے۔ یہ بات جانوروں تک میں پائی جاتی ہے۔ دو غیر جنس کے پرندے کبھی ساتھ نہیں اڑتے۔ دو آدمیوں میں دوستی ہوتی ہے‘ ساتھ رہتے ہیں۔ اور پھر جدا ہو جاتے ہیں کیونکہ مزاجوں کا اختلاف ان کو زیادہ دن جمع نہیں رہنے دیتا۔ خلاصہ یہ کہ کبھی انسان کو انسان کی ذات سے باطنی مناسبت کی وجہ سے محبت ہوتی ہے اسی قسم میں حُسن اور خوبصورتی کی محبت شامل ہے بشرطیکہ اس میں کوئی غلط مطالب شامل نہ ہو‘ کیونکہ حسین اور اچھی چیز خود اپنی ذات سے لذت بخش ہوتی ہے مثلاً پھول‘ باغ‘ آبِ رواں‘ ساحل کا کنارا‘ سمندر‘ جھیل اور فطرت کے حسین نظارے‘ ان سب سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے‘ یہ محبت فطری ہے۔ دنیا کے ہر شخص کو حاصل ہے‘ دوسری قسم کی محبت وہ ہے جو کسی غرض کے لیے ہو‘ اس وقت اصل مقصد وہ غرض ہوتی ہے اور محبت اُسی غرض کا وسیلہ اور ذریعہ ہوتی ہے۔ جیسے سونا چاندی روپے پیسے سے لوگوں کو محبت ہوتی ہے‘ حالانکہ یہ چیزیں خود کسی کام نہیں آتیں نہ لوگ ان چیزوں سے ان کی ذات کے لیے محبت کرتے ہیں‘ بلکہ ان سے سینکڑوں کام نکلتے ہیں۔ آج بھی کسی قسم کے مال کا چلن بند ہو جائے‘ ان سے کام کا نکلنا موقوف ہو جائے تو وہ چیزیں لوگوں کے لیے ایک ڈھیر بن جائیں گی اور لوگ اُن سے محبت کرنا چھوڑ دیں گے تیسری قسم یہ ہے کہ کسی چیز یا انسان سے محبت ہو اور وہ محبت کسی غرض کے لیے ہو مگر وہ غرض نیک ہو‘ اعلیٰ ہو۔ تو یہ محبت خدا کے لیے ہے۔ جیسے شاگرد استاد سے محبت کرتا ہے تو اس محبت کے پیچھے ایک غرض ہوتی ہے مگر وہ غرض

بہت اچھی اور نیک ہے یعنی علم کا حاصل کرنا۔ تو ایسی محبت غرض کے باوجود خدا کے لیے مانی جائے گی۔ ایک شخص دوسروں کو بہت کھانا کھلاتا ہے اور یہ کھلانا محض نیک نیتی سے ہے۔ اس وقت اگر وہ اپنے باورچی سے محبت کرتا ہے تو یہ محبت بھی بہت پاکیزہ اور مقبول قسم کی شمار ہوگی۔ انسان اپنے ملازم اور خدمت گار سے اس لیے محبت کرے کہ یہ میرا کام کر کے میرا وقت بچاتا ہے اور اس وقت میں، میں اور اچھے اچھے مخلوق کی خدمت کے کام کرتا ہوں تو یہ محبت بھی بہت پاکیزہ اور مقبول ہوگی۔ ان صورتوں میں اگرچہ محبت غرض کے لیے ہے مگر خود یہ غرض چونکہ بہت عظیم اور پاکیزہ ہے اس لیے اس کا اثر محبت پر بھی پڑتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ خدا کی محبت اور اس کی رضا میں فنا ہو۔ اب اگر وہ کسی غیر سے محبت کرے گا تو اس کی یہ محبت خدا ہی کے لیے ہوگی کیونکہ وہ خدا کی محبت میں اس قدر گرفتار ہے کہ جس شے سے بھی محبت کرے گا اس میں اسے خدا کا جمال نظر آتا ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی چیز میں بھی خدا کی مناسبت اور اس کا جلوہ نہ تلاش کر لے۔ ایسے ہی لوگ وہ ہوتے ہیں جو دنیا کو حاصل کرتے ہیں، استعمال کرتے ہیں مگر خدا کو نہیں بھولتے کیونکہ ہر چیز خدا کے لیے اور خدا کے حکم کے ماتحت ہوتی ہے۔ خدا کے لیے محبت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائے۔ دنیا اور آخرت تو ایک دوسرے سے قریب ہیں، ایک آج کی حالت ہے جو دنیا ہے۔ دوسری کل کی حالت ہے جسے آخرت کہتے ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے کل کو محبوب رکھے اور آج کو چھوڑ دے۔

دنیاوی محبت دو قسم کی ہے۔ ایک محبت وہ جس میں آدمی کا نقصان ہوتا ہو۔ ان سے ہر عقلمند دور رہتا ہے۔ اگر بادشاہ کے دستر خوان پر نفیس قسم کا کھانا چنا ہوا ہے مگر اس کے کھانے سے جان کا خطرہ ہوگا تو کوئی شخص ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ ان کھانوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ دوسری محبت وہ ہے جو کسی لحاظ سے مضر نہیں ہے جسے سب نے اپنایا ہے اس میں نکاح، شادی، کمائی وغیرہ آتی ہے۔ اس قسم کی دنیاوی محبت منع بھی نہیں ہے۔

غلبہ محبت کی تاثیر یہ ہے کہ محبت' محبوب کی ذات سے بڑھ کر محبوب کی ہر چیز تک پہنچتی ہو۔ مثلاً محبوب کی چیزوں' محبوب کے خادم' مکان' لباس' اور محبوب کی تعریف کرنے والے سے' اور جو اس محبوب کی رضا حاصل کرنے میں لگا ہوا اُس سے بھی محبت ہو جاتی ہے مگر یہ اُس وقت ہوتا ہے جب محبت میں غلبہ اور شدت ہو جائے۔ اسی طرح جب خدا کی محبت کا دل پر غلبہ ہوتا ہے تو ساری کائنات' ہر انسان' خدا کی تمام مخلوق سے محبت اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ہر قسم کی تکلیف اور نقصان میں عاشق کو لذت ملتی ہے کیونکہ اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ بھی میرے خدا کی طرف سے ہے اور اس کی ہر چیز مجھے محبوب ہے۔ ایسے لوگوں سے دنیا والے بھی محبت کرتے ہیں اور دنیا والوں کا ایسے لوگوں سے محبت کرنا ہی ان کے لیے عبادت ہے کیونکہ دنیا والوں کی محبت ان کے ساتھ محض خدا کے لیے ہے۔ ایسے لوگوں سے نہ کوئی نفع پہنچنے کی امید ہوتی ہے نہ کوئی فائدہ یہی وجہ ہے کہ ایسے بزرگ لوگ پاس ہوں یا دور ہوں' مر چکے ہوں یا زندہ ہوں' لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچتے ہیں۔ اور یہی اللہ کے لیے محبت کی علامت ہے۔

دوست کیسے بنائیں

''انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔'' اس اصول کے بعد ضروری ہے کہ دوست بنانے سے پہلے خوب دیکھ بھال کر لیں۔ پہلی بات تو یہ کہ عقلمند کو دوست بناؤ۔ اس سے کبھی کوئی گزند پہنچنے کا خطرہ نہ رہے گا۔ ہر برائی میں تمھیں روک سکے گا۔ اچھائی کی طرف چلنے میں معاون ہوگا۔ خوش خلق ہو، اُس سے ہر وقت مل کر تمھیں خوشی ہوگی۔ وہ پریشانیوں میں تمھارے لیے مداوا اور سکون و اطمینان کا سبب بنے گا۔ بدکار نہ ہو ورنہ اپنے ساتھ تمھاری عزت خراب کرے گا۔ اُس پر تو لوگوں کی اُنگلیاں اُٹھیں گی' تمھیں بھی لوگ کہیں گے کہ یہ فلاں شخص کا دوست ہے' دنیا کا حریص نہ ہو ورنہ وہ موقع پڑنے پر تمھیں بھی نہ چھوڑے گا اور دنیا حاصل کرنے کے پیچھے تمھیں بھی داؤ پر لگا دے گا اور اس کی دوستی میں کوئی نہ کوئی

دنیاوی غرض شامل ہوگی بلکہ انسان کو اگر مفید اور مخلص دوست نہ ملے تو اُس کا تنہا رہنا بہت بہتر ہے۔

دوستی کے حقوق

محبت اور دوستی ایک معاملہ ہے' اس معاملے کا حق ادا کرنا نہایت ضروری ہے' دو دوستوں کا حق ایک دوسرے کی ذات پر' مال پر' خدمات پر' جاہ وعزت ہر چیز پر ہوتا ہے' اور معاونت یا رفاقت اسی وقت پوری ہوتی ہے جب ایک دوست دوسرے کی ان میں سے ہر اعتبار سے خدمت کر سکے' اتحاد اور باہمی تعلق کا تقاضا یہ ہے کہ ہر چیز میں دونوں ایک ہوں۔

مالی خدمت میں ایک درجہ تو یہ ہے کہ جب دوست کو ضرورت ہو بلا اس کے مانگے ہوئے اس کی خدمت کی جائے اگر دوست کو مانگنا پڑے تو یہ کوئی بہت اونچی بات نہ ہوئی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس کو بالکل اپنے جیسا سمجھے' اپنے مال میں اس کا حصہ سمجھے اور اس کو فراخ حوصلے کے ساتھ آدھا یا آدھے سے زیادہ مال دیتا رہے۔ جیسے پہلے لوگ تھے کہ اگر ایک چادر خرید لی تو اس کے دو ٹکڑے کیے۔ آدھی خود رکھی' آدھی دوست کو دے دی۔ تیسرا اور افضل درجہ یہ ہے کہ دوست کو اور اس کی ضرورت کو اپنے اوپر ترجیح دے۔ بزرگوں میں دو دوستوں میں سے ایک کو خلیفہ کے دربار سے قتل کا حکم ہوا تو دوسرے نے بضد ہو کر خود کو پیش کیا کہ عمر کے آخر حصے میں یہ سعادت میں حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ خود کو ترجیح دے کر دوست کو بچالوں۔ اگر ان تینوں میں سے کوئی درجہ حاصل نہیں ہے تو دوستی رسمی ہے اور وقتی ہے۔ انتظار کرو جلد ہی یہ دوستی ٹوٹ جائے گی۔ فتح موصلی ایک عظیم صوفی و عالم اپنے دوست کے گھر گئے۔ وہ گھر پر موجود نہ تھے' ان کی باندی سے ان کا بکس مانگا' اپنی ضرورت کی چیز لی اور چلے آئے۔ جب دوست واپس ہوا تو باندی نے سارا قصہ سنایا۔ دوست نے کہا اگر واقعی

تو اپنے کہنے میں سچّی ہے اورانھوں نے ایسا کیا ہے تو اس سے بڑی خوشی میرے لیے کیا ہے۔اس خوشی میں تجھے آزاد کرتا ہوں (باندی آزاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کسی قیمتی چیز کو چھوڑ دیا جائے)

حضرت حسن بصریؒ کہا کرتے تھے کوئی کتنا ہی بڑا صوفی و عالم ہو اگر وہ اپنے بھائی کو ایک درہم نہ دے سکتا ہو تو اُس سے دین سیکھنا بیکار ہے۔

پہلے لوگ حسرت کیا کرتے تھے کاش ساری دنیا ہمارے ہاتھ میں ہو اور ہم دوستوں کے دامن میں اُلٹ دیں۔ جب کہ وہ ہر وقت اپنا سب کچھ دوستوں کے اوپر خرچ بھی کرتے تھے۔ دوستوں پر خرچ کرنا۔ ان کو کھلانا پلانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ فقیروں اور غریبوں کو کھلایا جائے مگر یہ یاد رہے دوستوں کو محض خلوص کے لیے کھلائے۔ اُن سے کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ دو آدمی جب ساتھ ہوتے ہیں تو دونوں سے خدا کے نزدیک زیادہ محبوب اور پسندیدہ وہ ہوتا ہے جو دوسرے کے لیے زیادہ نرم دل اور مہربان ہوتا ہے۔

دوست کی ضرورت کا پورا خیال رکھنا چاہیے' اپنی حاجت پر ان کی ضرورت کو مقدم سمجھے۔ ان کی ضرورت کا ایسا خیال رکھے کہ ان کو سوال کی یا اظہار کی ضرورت نہ پڑے اور اگر دوست سوال کر ہی دے تو اس کی ضرورت کو کشادہ پیشانی اور انبساط کے ساتھ پوری کرے اور آخر میں ندامت اور معذرت پیش کرے کہ اس کی خبر گیری میں اس قدر کوتاہی ہوئی۔ دوستوں کی غیر موجودگی میں اُن کے گھر کا۔ اُن کے بچوں کا پورا پورا خیال رکھو۔ بازار کی' محلّے کی اور دوسری ضرورتیں پوری کرو۔ اگر تمھارے کسی دوست کا انتقال ہو گیا ہے تو ایسے بن جاؤ کہ یتیم بچوں کو اپنی یتیمی یا باپ سے بچھڑنے کا احساس تک نہ ہو اور اس کے گھر کی ضرورت کا ایسے خیال رکھو جیسے اس کی زندگی میں رکھتے تھے۔ یاد رکھو! خدا کی زمین پر خدا کے کچھ برتن ہیں' سب سے زیادہ پسندیدہ برتن وہ دل ہے جو دوسروں کے لیے نرم ہو اور گناہ سے صاف ہو۔

کسی شخص سے ملنا' اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا' پھر اس کے بارے میں یہ کہنا کہ میں اس کا صورت شناس تو ہوں نام نہیں جانتا' سخت بے وقوفی اور دوست کے حقوق کی حق تلفی کی بات ہے۔ چاہیے یہ کہ دوست کا نام' اُس کے باپ دادا کا نام تک معلوم ہو۔ انسان کو اس میں بڑی جاذبیت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی اس کا نام جانتا ہو یا نام لے کر پکارے۔

اگر دوست نے کچھ راز کی باتیں کی ہیں تو یہ طے کر لے کہ انھیں سینے میں لے کر مر جاؤں گا' کسی کے سامنے اظہار نہیں ہوگا بلکہ شرافت تو یہ ہے کہ اگر کبھی اخوت اور دوستی کا رشتہ منقطع بھی ہو جائے تب بھی احترام آدمیت اور انسانیت میں اس کا کوئی راز اس کی کوئی برائی کسی سے نہ کرے۔ دوست کے اعزا' احباب اور رشتے دار پر کبھی زبان طعن دراز نہ کرے نہ ان کی کسی قسم کی برائی کرے۔ کسی نے دوست کو بُرا کہا ہے یا گالی دی ہے تو تم دوست کے سامنے اس کی نقل نہ کرو۔ یہ تو ایسا ہوا گویا تم نے گالی دی ہے۔ ہاں کوئی تعریف کرے تو اس کو نہ چھپاؤ کیونکہ سن کر پہلے سرور تمھاری طرف سے ہوگا پھر تعریف کرنے والے کی طرف سے۔ کوئی ایسی بات نہ کرو' جو دوست کو بُری لگے لیکن اگر کسی بُرائی سے منع کرنا یا اچھی بات بتانا اُسے بُری لگے تو پرواہ نہ کرو' کیونکہ یہی اس کے ساتھ حُسنِ سلوک ہے اگر دوست کی طرف سے بُرائی ذہن میں آئے تو دو باتوں کا دھیان کرو۔ اوّل اپنے احوال پر غور کرو۔ تم میں کوئی بُرائی ہے تو دوست کی بُرائی کا اس قدر احساس کیوں ہے' یہ سوچ لو کہ جس طرح میں بُرائی کرنے پر مجبور اور ترک پر عاجز ہوں اسی طرح میرا دوست بھی تو انسان ہے اور اگر تم یہی چاہتے ہو کہ تمھارا دوست تمام عیوب سے پاک ہو تو بہتر ہے کہ تنہائی اختیار کرو۔ دنیا میں بُرے بھلے ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے اگر کسی دوست میں برائیوں کے مقابلے میں خوبیاں زیادہ ہوں تو اُسے غنیمت جانو اور اُس سے ضرور دوستی کر لو۔ بھائیوں اور دوستوں کے قصور کو معاف کرنا ہی جوانمردی کی بات ہے' دوستوں کے لیے بدگمانی بھی نہ کرنی چاہیے جب تک ممکن ہو دوست کے عمل کو اچھائی پر محمول کرو۔ بدگمانی

کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آدمی دوسروں کے عیوب تلاش کرتا ہے' خفیہ طور پر اس کی حرکت کی ٹوہ میں لگ جاتا ہے۔ حالانکہ کہا گیا ہے "ایک دوسرے کا بھید مت تلاش کرو' باہم لڑتے مت رہو اور اللہ کے بندے باہم بھائی بن جاؤ۔" آدمی دوسروں سے یہی چاہتا ہے کہ میرے عیب کو چھپائیں اگر اس کے خلاف ہو جاتا ہے تو بڑا غصہ آتا ہے تو یہ بڑی حیرت کی بات ہے خود چشم پوشی کی توقع رکھے اور دوسروں کے عیوب نہ چھپا سکے۔ یہ بات کسی قدر تو سچی ہے کہ "احمق کا دل منہ میں ہوتا ہے اور عاقل کی زبان دل میں ہوتی ہے۔" یعنی احمق اپنے دل کی بات بھی نہیں چھپا سکتا مگر عقلمند راز کو سینے میں دفن رکھتا ہے' راز کو اس طرح چھپانا چاہیے کہ اس کا بھی احساس نہ ہو کہ کوئی راز چھپا رہا ہے۔ انسان وہ ہے جو غصے اور نفرت میں راز کو چھپالے' محبت میں تو ہر ایک راز چھپاتا ہے۔

اسی طرح کسی کی بات بھی نہیں کاٹنی چاہیے۔ بات کاٹنے والا یا تو بات کرنے والے کو جاہل اور احمق سمجھتا ہے یا اس کی بات کی اہمیت نہیں جانتا اور اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس پر غور کیا جائے اور یہ دونوں باتیں گفتگو کرنے والے کی توہین اور دل توڑنے والی ہیں۔ دوستی میں یہ عادت کہ دوست کی بات کاٹی جائے بہت خطرناک ہے' دوست سے اس کے مزاج کے مطابق گفتگو کرنا عین اخوت کی دلیل ہے۔ اگر کسی دوست سے محبت ہو جائے تو اس کا اظہار بھی کرے' اس سے محبت میں پختگی ہوتی ہے' اور دونوں طرف بڑھوتری ہوتی ہے۔ دوست کی خوب تعریف کرو جس سے وہ خوش ہو مگر تعریف میں جھوٹ یا مبالغہ بالکل نہ ہو' دوست اگر حسنِ سلوک کرے تو پوری طرح شکرگزار ہونا چاہیے بلکہ اگر دوست حسنِ سلوک کی نیت بھی کرے تو خواہ وہ عمل نہ کر سکے اس کا شکریہ ادا کرے۔ وہ حقوق جو تمھاری اپنی ذات سے متعلق ہوں اس میں اگر دوست سے کوتاہی ہو جائے تو اُسے نظر انداز کر دینا چاہیے' لیکن اگر دوست کوئی ایسی حق تلفی کر دے جس سے ترک تعلقات کا خطرہ ہو تو تنہائی میں اظہار خفگی اس سے بہتر ہے کہ تعلقات منقطع کیے جائیں۔ دوستی کرتے وقت نیت یہ

رکھے کہ ہمیشہ دوست کی مدد اور اُس سے ہمدردی کرنی ہے' اپنا کوئی مفاد سامنے نہ رکھے۔ جب تمھارے دوست یا بھائی کے حالات بدل جائیں۔ اچھی زندگی سے بُرائی کی طرف آ جائے تو اُسے چھوڑ دینا ظلم ہوگا۔ آدمی کبھی سیدھا ہوتا ہے کبھی غلطی کرتا ہے اور اب تو اُسے اور بھی تمہاری مدد' رفاقت اور دستگیری کی ضرورت ہے۔ ابراہیم نخعیؒ کہا کرتے تھے ''آج تمھارے بھائی سے گناہ ہوگیا ہے تو گناہ کی وجہ سے بھائی کو مت چھوڑو کیونکہ کل وہ توبہ کرلے گا اور پاک ہو جائے گا''۔ نفرت کی چیز گناہ اور برائی ہے۔ گناہگار یا بُرے آدمی سے نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ بگڑے ہوئے دوست کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس کا صالح دوست اُسے سمجھاتا رہے' راہِ راست پر لائے' یہی اصل دوستی اور وفاداری ہے' جب بگڑا ہوا دوست یا کوئی شخص دیکھے گا کہ مجھ سے سب نفرت کرنے لگے حتیٰ کہ میرا جگری دوست مجھ سے دور ہوگیا ہے تو اس کی طبیعت میں بغاوت پیدا ہو جائے گی اور وہ سب کچھ کر گزرے گا' برخلاف اس کے جب وہ دیکھے گا کہ میری برائیوں کے باوجود میرے احباب مجھ سے محبت کرتے ہیں اور بغیر کسی غرض کے مجھ کو نصیحت کرتے ہیں' راہ راست پر لانا چاہتے ہیں تو اُسے شرم آئے گی' اپنے دل میں نادم ہوگا اور راہِ راست پر آ جائے گا اور ایک انسان کا سُدھر جانا بھی بڑی کامیابی ہے' پھر ایسی حالت میں دوستی کیوں توڑی جائے۔ اس کے علاوہ دوستی میں ضرورت اور حاجت میں دوست کے کام آنا بڑی سعادت ہے' اور اس سے بڑی حاجت اور کیا ہوگی کہ آدمی صحیح راہ سے بھٹک گیا ہے' اب اُسے راستہ دکھانا ہے۔ حضرت ابودرداءؓ سے کہا گیا آپ فلاں دوست اور بھائی سے ملتے ہیں نفرت نہیں کرتے وہ تو گناہ کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا میں اس کے اُن گناہوں سے نفرت کرتا ہوں بھائی سے نفرت کیوں کروں۔ انسانی بھائی چارہ' آپس میں اتحاد و اتفاق' اور محبت اسلام کا مقصد اولین ہے اور دوستی قطع کرنے میں اس مقصد پر ضرب پڑتی ہے اس لیے اس سے برا کام کوئی نہیں ہے اور جہاں تک ممکن ہوا گناہ وخطا کے باوجود اس سے بچایا گیا ہے

۔دوست کی کسی خطا کا پتہ بھی چل جائے تو پہلے بہت سے عذر اپنی طرف سے کرے پھر بھی دل نہ مانے تو دل کو ملامت کرے کہ دل ہی بُرا ہے' دوست کی کوئی خطا نہیں ہے اور اگر دوست خود خطا کر کے عذر کرے تو کبھی اس کے عذر کی چھان بین نہ کرے کہ عذر سچا ہے یا جھوٹا' فوراً مان لے۔ غصہ آنا بہر حال فطری امر ہے مگر شان یہ ہونی چاہیے کہ غصہ دبائے' فوراً معاف کرے' قرآن پاک نے اچھے لوگوں کی تعریف میں یہ نہیں کہا ہے کہ انھیں غصہ آتا ہی نہیں' ہاں یہ کہا ہے کہ وہ غصے کو دبا لیتے ہیں دوست کی خطا پر غصہ کرنے سے بہتر ہے کہ اس پر صبر کرے' اور ترک تعلق کا خطرہ ہو تو بہتر ہے کہ غصہ کر لے لیکن دوست کی غیبت کا خطرہ ہو تو بہتر ہے اُس سے ترک تعلق کر لے مگر غیبت نہ کرے۔ دوستی متوسط انداز میں ہونی چاہیے، شاید دوست کبھی دشمن ہو جائے اور دشمنی بھی معتدل انداز میں ہونی چاہیے شاید دشمن کبھی دوست بن جائے۔ دوست کے لیے چپکے چپکے اس کی لاعلمی میں ہر قسم کی بھلائی چاہو اور خدا سے اس کی بہتری کی دعا مانگو۔

دوستی میں وفا اور خلوص بے حد ضروری ہے' دوست کی زندگی میں اس کی دوستی کو قایم رکھے اور مرنے کے بعد اس کے عزیز و اقارب کا خیال رکھے۔ زندگی میں بھی دوست کے عزیز و اقارب کا حال' ان کی خیریت و کیفیت پوچھتا رہے۔ اس سے دوست کو خوشی ہوتی ہے کہ میرے تمام خاندان کا میرے دوست کو خیال ہے' دو مخلص دوست کبھی آپس میں حسد نہیں رکھتے اور حسد ہو بھی نہیں سکتا۔ جب کہ ہر دوست خود کو دوسرے کے لیے حاضر رکھے اور اس کو اپنے سے بڑھ کر جاننا اور دیکھنا چاہتا ہے' دوستی کی بنیاد ایسی ہونی چاہیے کہ ان کے دلوں میں کوئی غرض نہ ہو' جب کہ غرض ہی حسد کا سب سے بڑا سبب ہے' وفا کی ایک علامت یہ ہے کہ مال و جاہ کے کسی بھی مرتبے پر پہنچ جائے دوست کے لیے ہرگز نہ بدلے' نہ اُنھیں محسوس ہونے دے کہ ان کے تعلق میں کوئی کمی آ گئی ہے' اخوت' محبت اور دوستی کا ایک حق یہ ہے کہ دوست کو کسی قسم کی تکلیف نہ دے نہ اس سے کوئی تکلف کرے'

اُس پر اپنا کوئی بوجھ نہ ڈالے۔اس سے کوئی ایسی فرمائش نہ کرے جس میں اُسے تکلیف ہواُس کے جاہ وجلال یا مال سے مدد کا خواستگار نہ ہواُس سے خبر گیری اور تواضع کا مطالبہ نہ کرے اس پر ادنیٰ سا بھی کام کا بوجھ نہ ڈالے آدمیوں میں پھوٹ پڑنے کا سبب تکلّف ہے ایک دوست دوسرے کے پاس جاتا ہے وہ اس کے لیے تکلّف کرتا ہے اور یہی تکلّف ترکِ دوستی کا سبب بن جاتا ہے جب دو دوستوں کو ایک دوسرے کے لیے تکلّف کرتا ہوا پاؤ تو جان لو یا تو ان میں رشتہ دوستی پوری طرح استوار اور مضبوط نہیں ہے یا اور کوئی نقص دونوں دوستوں کے قلوب میں ہے۔

دوست اُسے بناؤ کہ اگر نیکی کرو تو دوست کی نگاہ میں اُس نیکی کی وجہ سے تمھارا کوئی مرتبہ نہ بڑھے اور اگر کوئی گناہ کرو تو اس کے دل سے تمھارا مرتبہ کم نہ ہو۔اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُسے تمھاری ذات سے تعلق ہے نہ تمھاری نیکی سے مطلب ہے نہ بدی سے' اور دوستی کے لائق ایسا ہی مخلص ہے۔اپنے معاملات میں دوستوں سے مشورہ کرو اور اُن کے مشورے کو مانو۔

دوست کے ساتھ ایسے رہو کہ وہ تمھارے دل کی خوشی تمھارے اعضا سے محسوس کر سکیں یعنی جب وہ تم سے ملیں تو آنکھوں میں خوشی جھلکتی ہو' ہاتھ پیر ان کی خدمت کے لیے بے چین ہوں۔ باتوں سے مٹھاس اور محبت کا پتہ چلتا ہو۔ان کی خوبیوں پر نگاہ رکھو اور عیوب سے آنکھیں بند رکھو۔دوستوں کے سامنے چیخ کر' زور سے بات نہ کرو' نہ بالکل گُم سُم رہو۔نہ اُن کے آنے پر بے حسی اور سرد مہری برتو' ان سب سے بدگمانی پیدا ہوسکتی ہے۔اگر دوست کوئی بات کہے تو غور سے سنو جس سے اس کو اپنی ذات کی اور اپنی بات کی اہمیت محسوس ہو' تجربہ بتاتا ہے کہ جہاں انسان کی بات غور سے سُنی جاتی ہے وہاں اُس کا بہت جی لگتا ہے۔دوست کا ادب بھی کرے اور محبت بھی ۔ان دونوں کے ملاپ سے ایک اچھی کیفیت پیدا ہوگی جس سے تعلقات کو مضبوط رکھنے میں مدد ملے گی ۔ یہ ظاہری آداب اسی

وقت سہل ہوں گے جب دل میں خلوص ومحبت ہوگی۔

عام انسانوں کے ساتھ معاملہ

ایک انسان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں ہے کہ وہ عام انسانوں میں اخلاق ومحبت، ہر دلعزیزی کے ساتھ اور ان میں گھل مل کر شگفتہ روئی کے ساتھ زندگی گزارے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دوست اور دشمن سب سے کشادہ دل ہو کر ملے۔ کسی کو نہ ذلیل سمجھے اور نہ کسی کا مذاق اُڑانے کی کوشش کرے، عام آدمیوں میں وقار کے ساتھ رہنا بہتر ہے مگر ایسا نہیں کہ تکبر تک پہنچ جائے۔ اور تواضع اختیار کرو مگر اتنا نہیں کہ ذلّت تک پہنچادے۔ چلتے ہوئے دائیں بائیں زیادہ مت دیکھو نہ بار بار مُڑ کر کسی کو دیکھو۔ کسی مجمع کے پاس مت کھڑے ہو، کسی کے پاس بیٹھو تو اطمینان سے، ایسا محسوس نہ ہو کہ ابھی اٹھ کر بھاگنا چاہتے ہو، اچھی بات پر کان لگاؤ، کسی کی بات پر زیادہ تعجب اور حیرت مت ظاہر کرو۔ جو دوست صرف تندرستی کا ساتھی ہے اُس سے بچو۔ وہ دشمن سے زیادہ بُرا ہے، مجمع میں آدمیوں کے اوپر سے پھلانگ کر مت جاؤ، جگہ جہاں ملے بیٹھ جاؤ۔ راستے میں دوکان پر یا سڑک کے کنارے مت بیٹھو، اور بیٹھنا ہی پڑے تو نگاہ نیچی رکھو، کسی راہگیر کو مت گھور گھور کر دیکھو۔ اس میں خود تمھاری ذلّت ہے، کسی پر آواز مت کسو، مظلوم کی مدد کرو، فریادی کا ساتھ دو، اس سے بڑی بہادری اور پہلوانی کوئی نہیں ہے۔ کمزوروں کو سہارا دو، بھولے ہوئے کو راہ بتاؤ اور اس طرح بتاؤ کہ کچھ دور اُس کے ساتھ چل کر راستے پر لگادو، اچھی بات لوگوں کو بتاتے رہو بُری بات سے لوگوں کو رُوکتے رہو مگر نہ بار بار روکو نہ روکنے میں شدّت اختیار کرو، عوام کے پاس بلاوجہ نہ بیٹھو۔ اگر بیٹھنا ہی پڑے تو ان کی بات میں دخل مت دو، وہ کوئی بُرا لفظ کوئی مسخرہ جملہ کہیں تو اُس سے تغافل برتو۔ ہنسی ٹھٹّھا عوام سے بہت سختی سے منع ہے، جب کہ عاقلوں سے بھی منع ہے۔ اس سے آبرو عزت ختم ہو جاتی ہے۔ بنی آدم باہم دوستی اور محبت میں ایک جسم کی طرح ہیں۔ جب جسم کا کوئی حصّہ درد کرتا ہے تو سارا جسم متاثر ہوتا ہے، کسی کو

اپنے کلام یا اپنی بات سے تکلیف نہ پہنچاؤ۔

ایک جگہ بتایا گیا ہے کہ "اگر تجھ سے کچھ بن نہ پڑے تو اتنا ہی کر' لوگوں کو تکلیف نہ پہنچا۔" اس سلسلے میں کہا گیا ہے۔ "بہترین مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے" ایک مسلمان کی چغلی دوسرے سے نہ کھاؤ' جو تجھ سے کسی کی چغلی کر رہا ہے ضرور ہے کہ وہ تیری چغلی کسی سے کرتا ہوگا۔ اس تمیز کے بغیر کہ کون احسان کے قابل ہے کون نہیں ہے ہر ایک کے ساتھ اخلاق واحسان کا معاملہ کرنا چاہیے۔ ایمان کے بعد سب سے بڑی عقلمندی یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ دوستی کی جائے اور تمام مخلوق سے احسان اور نیک سُلوک کا معاملہ کیا جائے۔ لوگوں سے خوش خلقی کے ساتھ ان کی لیاقت کے مطابق گفتگو کرو۔ جاہل سے مشکل تقریر نہ شروع کرو' بوڑھے ضعیف کی عزت اور بچوں پر شفقت کرنی چاہیے۔ حضرت ابن عمر کہا کرتے تھے "نیکی تو بہت معمولی عمل کا نام ہے"۔ "خندہ پیشانی اور نرم گفتاری۔"

ہر شخص کے مرتبے کے مطابق اس کی عزت کرنی چاہیے اور کسی بھی قوم وملت کا بڑا آدمی تم سے ملے تو اس کا احترام ضروری ہے' دل سے تمام انسانوں کو ایک جیسا سمجھے مگر اس کے ساتھ ساتھ فرق مراتب کا خیال رکھے مثلاً بادشاہ' وزیر' سپاہی ہر ایک کی عزت واحترام ان کی شان کے مطابق کرو۔ سب کو ایک صف میں نہ رکھے' جو جس حیثیت کا ہے اس کی حیثیت کا خیال رکھے لیکن ان کی خدمت' آرام' مہمان داری وغیرہ میں کمی نہ کرے۔ اگر تمھارے پاس کوئی سائل آیا اور تم نے اُسے روٹی بھیج دی۔ پھر ایک معزز سوار آیا اُسے اپنے ساتھ بلا کر بٹھالیا تو یہ طریقہ بالکل درست ہے۔ خدا نے انسانوں کا ایک مرتبہ بنایا ہے ہمیں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے' اسی طرح مجلس میں اگر پہلے سے بہت سے لوگ ہیں' کوئی بڑا آدمی آگیا تو اس کی حیثیت کے مطابق اس کو عزت کی جگہ بٹھانے میں' اس کا احترام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے' جب خدا نے اُسے عزت عطا فرمائی ہے تو ہم کو بھی

حوصلے کے ساتھ اس کی عزت کرنا چاہیے اگر یہ خیال ہو کہ مجلس کے اور لوگوں کو ناگواری ہوگی تو اس کا خیال نہ کرے' اس میں اپنی ہی قوم ضروری نہیں' کسی بھی قوم کا بڑا آدمی تمھارے پاس آئے تو اس کی عزت کرو۔ دو آدمی لڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ دو دلوں میں صلح کرانا سب سے زیادہ افضل کام ہے اور دو دلوں میں نفاق ڈالنا سب سے بدترین کام ہے بلکہ دو دلوں میں صلح کرا دینا بہترین صدقہ ہے۔ انسان کو چاہیے کہ دوسروں کے عیب بھی چھپائے اور خود اپنے عیوب بھی دوسروں پر ظاہر نہ کرتا پھرے۔ خدا نے جب اس کی پردہ پوشی کی ہے تو وہ خود کیوں اپنی پردہ دری کر رہا ہے۔ تہمت کی جگہوں سے حتی الامکان دور رہنا چاہیے ورنہ لوگ بدگمان ہوں گے' غیبت کریں گے اور ممکن ہے وہ خود گناہ میں گرفتار ہو جائے۔ اگر کسی بڑے' بااثر شخص سے تیری ملاقات اور جان پہچان ہے اور کوئی ضرورت مند خواہش کرے تو اس کے پاس اس کی سفارش ضرور کر دے یعنی کسی کی سفارش کرنے میں بخل سے کام نہ لے۔ سفارش کرنا اپنے بھائی کی مدد ہے۔

کسی بداخلاق اور جاہل سے واسطہ پڑ ہی جائے تو کوشش کر کے خوش اخلاقی اور شرافت سے اس کو ٹال دے۔ خود بداخلاقی کا مظاہرہ نہ کرنے لگے' بداخلاق سے جب تک اللہ پاک اُس کے شر سے بچنے کا راستہ نہ نکال دے' اخلاق سے پیش آنا ہی دانش مندی ہے اور موقع ملتے ہی اس سے دور ہو جائے۔ زیادہ تر مال داروں کے پاس ان کی مجلس میں نہ رہے' غرباء' مساکین نیز چھوٹے لوگوں سے ملتا رہے۔ کہا گیا ہے جس سے مساکین اور غرباء راضی ہیں یہ علامت ہے کہ اس سے خدا راضی ہے۔ ہر ایک کی خیر خواہی' بہتری کا خیال رکھو۔ تم میں سے اس وقت تک کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ چیز نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے' کسی بھائی کے کام کے لیے دو قدم چلنا بھی بڑی عبادت ہے' اللہ اُس شخص سے بہت خوش ہوتا ہے جو کسی غمزدہ کے کام آئے اور کسی مظلوم کی مدد کرے۔ خدا کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ یہ بات لگتی ہے کہ کوئی شخص خدا کی مخلوق کو ستائے'

اس سے بڑھ کر کوئی خصلت نہیں کہ کوئی اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچائے۔ کوئی بھائی بیمار ہو تو اس کی مزاج پرسی کرنی چاہیے مگر بیمار کے پاس زیادہ دیر تک نہ بیٹھے' اس سے سوالات نہ کرے' اس کی تندرستی کی دل سے تمنا کرے اور دعا مانگے۔ اگر مریض کا کمرہ' بستر اور عام حالت کچھ خراب ہو تو ناگواری کا احساس نہ ہونے دے۔ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھنا چاہیے تم کیسے ہو؟ پھر اس کو ڈھارس دے کہ گھبراؤ مت' جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد معاشرت کے اور آداب یہ ہیں کہ تم کسی قابل ہو جاؤ اور لوگ تمھاری عزت کریں تو تم خدا کا شکر کرو جس نے تمھیں اس قابل بنا دیا اور لوگوں کے دل تمھاری طرف مائل کر دیے۔ اگر لوگ تمھاری غیبت کریں' ان کی کسی شرارت کا پتہ چلے' تم کو کسی کی ذات سے تکلیف پہنچے تو صبر کرو' بدلہ لینے کی نہ سوچو لوگوں کی آمیزش سے بچو کیونکہ لوگ کسی کی خطا اور لغزش کو معاف نہیں کیا کرتے۔ نہ عیب چھپاتے ہیں' نہ خوبی کی تعریف کرتے ہیں حسد اور انتقام میں تیز ہوتے ہیں۔ انصاف کرنے میں پیچھے رہتے ہیں۔ ذرا سی بھول چوک ہوئے تو مواخذہ لینے میں تیز اور معاف کرنے میں کمزور ہوتے ہیں۔ غرض عام لوگوں میں حوصلہ اور ظرف نہیں ہوتا کہ وہ دوستی کے تمام تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ بغیر ایک مدت تک آزمائے ہوئے بغیر طویل تجربے کے کسی پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔

ہمسائے کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی خواہ کسی قوم اور کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس کا حق ثابت ہے' مسلم و غیر مسلم دونوں قسم کے پڑوسی سے حُسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے' ایک انسان سچا مومن جبھی ہو سکتا ہے جب وہ اپنے پڑوسی کے لیے اچھا ہو' کوئی بندہ اگر اپنے ایمان دار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اپنے اس دعوے میں اس وقت تک جھوٹا ہے جب تک اس کا پڑوسی اس کی آفتوں سے محفوظ نہ ہو۔ حضورؐ نے فرمایا ہے "اگر تو نے اپنے پڑوسی کے کتے کو بھی پتھر وغیرہ کھینچ کر مار دیا تو تو نے پڑوسی کو ایذا پہنچائی۔" پڑوسی کو ستانے والا خواہ کتنے ہی نیک

اعمال دن رات کرتا رہے اس کا سارا عمل بیکار اور ضایع ہے۔ ہمسائے کو تکلیف دینے سے بچا جائے' یہ تو کوئی بڑی بات نہ ہے۔ یہ بات تو پڑوسی کے اینٹ پتھر کو بھی حاصل ہے کہ وہ نہ کسی کو ستاتے ہیں نہ ایذا پہنچاتے ہیں' اس سے بڑھ کر یہ چاہیے کہ اگر ہمسایہ تکلیف پہنچائے تو صبر کرے اور صبر ہی نہ کرے بلکہ ان کے باوجود ہمسائے سے خوش اخلاقی اور تواضع سے پیش آئے تب جا کر انسانیت' شرافت' اور ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ ابن مقنع کو خبر لگی کہ اُن کا پڑوسی قرض ادا کرنے کے لیے اپنا مکان بیچنا چاہتا ہے' ابن مقنع اس کے مکان کے سائے میں بیٹھا کرتے تھے، دیوار کے سائے میں بیٹھنے کا حق ادا نہ کر سکنے کا سخت افسوس ہوا اور جا کر اس کا قرض ادا کر دیا، مکان بیچنے سے روک دیا۔ پڑوسی کا یہاں تک خیال رکھے اس سے زیادہ دیر گفتگو نہ کرے، مبادا اس کو زحمت ہو۔ اس کے حالات و معاملات کے بارے میں زیادہ کھود کرید نہ کرے، مبادا اسے ناگوار گزرے۔ جب وہ بیمار ہو تو اس کی مزاج پرسی کرے، اس کی دوا کا اور اس کے گھر کی تمام ضرورت کا خیال رکھے۔ بازار سے لا کر دے۔ مصیبت میں اس کو تسلی دے اس کا ساتھ نہ چھوڑے، خوشی میں مبارک باد دے اور اس کے ساتھ خوشی کا اظہار کرے، اس کی کوتاہیوں اور خطاؤں کو معاف کرتا رہے۔ چھت پر سے اس کے گھر میں نہ جھانکے۔ اس کی دیوار میں سوراخ کر کے دیوار پر کڑی وغیرہ رکھ کر، صحن میں مٹی ڈال کر، گھر میں پرنالہ بنا کر، پانی کا راستہ نکال کر اس کو تنگ نہ کرے۔ اگر وہ کچھ اپنے گھر میں لے جا رہا ہے تو اس پر تاک نہ لگائے، اس کا کوئی عیب معلوم ہو تو چھپا لے۔ اس پر کوئی حادثہ گزرے تو فوراً دستگیری کرے۔ جب وہ گھر پر نہ ہو تو اس کے گھر بار، بیوی بچوں کا پورا پورا خیال رکھے۔ اس کے بچے سے نرمی اور محبت کا معاملہ کرے، جو بات اسے نہ معلوم ہو وہ بتاتا رہے۔ وہ مدد چاہے تو اس کو مدد دے، وہ قرض چاہے تو قرض دے، کسی بھی قسم کا کام آ پڑے اس کو پورا کرے، کوئی آگ وغیرہ لگ جائے یا کسی وجہ سے محلّہ چھوڑ کر بھاگنا پڑے تو اکیلا نہ بھاگے محلے اور پڑوس کے بچوں، عورتوں اور ضعیفوں کا خیال رکھے، ان کو بھی

سہارا دے۔کوئی چیز تمہارے گھر پر آئے تو پڑوسی کو دے کر کھاؤ اور اگر پڑوسی کو دینے کے قابل نہیں ہے۔یعنی بہت کم ہے تو ایسی کوشش کرو کہ پڑوسی کو، اس کے بچے کو خبر نہ ہو۔ ورنہ بڑے دکھ کی بات ہوگی۔ اپنے بچوں کو وہ چیز پھل، مٹھائی وغیرہ دے کر باہر مت بھیجو ورنہ پڑوسی کے بچے دیکھیں گے روئیں گے، ضد کریں گے تو ماں باپ کو تکلیف ہوگی۔ ہانڈی اور سالن بھوننے بگھارنے کی خوشبو پڑوسی کے گھر تک جانے سے روک سکو تو روک لو۔ اور ظاہر ہے ایسا نہیں ہوسکتا اس لیے جو چیز پکاؤ خواہ وہ کتنی ہی معمولی ہو، پڑوسی کے یہاں ضرور بھیجو، حضرت ابن عمرؓ کا ایک پڑوسی یہودی تھا۔ آپ نے زندگی بھر اس کا ہر حال میں خیال رکھا۔ پڑوس ہونے میں جس کا دروازہ اپنے دروازے سے قریب ہو وہ زیادہ مستحق ہے یعنی اگر چیز کم ہو تو قریب والے کو بھیج دی جائے۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے اپنے صاحبزادے عبدالرحمٰنؓ سے کہا تھا ''میاں پڑوسی کے ساتھ سختی مت کرنا۔ آدمی چلا جاتا ہے اس کی باتیں دنیا میں یاد کی جاتی ہیں''۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے مت بنو کہ لوگ برائی کے ساتھ یاد کریں۔ عمل کے مقبول یا مردود ہونے کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ پڑوسی جس کو اچھا کہہ دے وہ اچھا ہے اور جس کو برا کہہ دے وہ برا ہے۔ اگر کوئی بہت ہی نیک، متقی اور زہد مشہور ہے لیکن پڑوسی اس سے نالاں ہیں تو نہ اس کے نیک اعمال کا اعتبار ہے اور نہ وہ اعمال مقبول ہیں۔

پڑوسیوں کی طرح رشتے داروں کے حقوق ہیں، سب سے اچھا انسان وہ ہے۔ جو عزیز و اقارب کے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے حقوق ادا کرتا ہو، ان کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہو۔ اچھے لوگ وہ ہیں کہ لوگ اور عزیز انہیں چھوڑ دیں مگر وہ سب کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کریں۔ اور سلوک وحق کی یہی ادائیگی ہے کہ لوگ کسی کو چھوڑ رہے ہوں اور وہ لوگوں کو محبت پیش کرے۔

آپس میں صلہ رحمی اور قرابت والوں کے حقوق کی ادائیگی سے آپس کے بڑے بڑے اختلافات اور باہمی جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں اور خیر و برکت ظاہر ہونے لگتی ہے کیوں

کہ اتحاد و محبت میں بڑی برکت ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کی راہ میں کچھ مال تقسیم کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ پہلے اپنے اقارب اور رشتے داروں کا خیال رکھے کیوں کہ پہلے وہی مستحق ہیں، بہترین عطا و بخشش اپنے رشتے داروں میں سے ان کو دینا ہے جن سے کسی وجہ سے کچھ رنجش ہو اور جو دل میں تمہارے لیے کچھ عداوت رکھتا ہو۔

پھر رشتے داری جس قدر قریبی ہو گی حقوق اسی قدر زیادہ ہوں۔ اس لحاظ سے والدین (ماں باپ) اور اولاد کا حق زیادہ ہے، والدین کے ساتھ حسن سلوک کو تمام اعمال سے افضل بتایا گیا ہے، ماں باپ کے ملنے والے بھی اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ ادب و احترام کیا جائے، ماں باپ کی اجازت کے بغیر، کسی عبادت حج وغیرہ اور حصول علم کے لیے نکلنا صحیح نہیں ہے۔

اپنے ماتحت اور ملازمین کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرے، ان کی خوراک، پوشاک، قیام و طعام، آرام و راحت وغیرہ کا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھے۔ طاقت سے زائد ان سے کام نہ لے، ان سے تکبر اور حقارت کا معاملہ نہ کرے، کوئی خطا ہو جائے تو تحمل، بردباری اور ضبط سے کام لے اور ان کو معاف کرتا رہے اور سوچے کہ وہ بھی انسان ہیں ان سے انسانیت کا معاملہ کرنا چاہیے۔

گوشہ نشینی کی بحث

بعض لوگ کہتے ہیں تنہائی انسان کے لیے مفید ہے اور بعض کہتے ہیں کہ لوگوں سے ملنا جلنا بہتر ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ کسی کے لیے تعلقات کو ترک کرنے میں فائدہ رہتا ہے، اور کسی کو کسی سے ملنے جلنے میں فائدہ ہوتا ہے، دراصل اس کا فائدہ طباع کے اختلافات اور مزاج کے تنوع پر ہے اس لیے جہاں جو چیز مناسب ہو وہی حکم دینا چاہیے، تنہائی میں انسان بہت سی برائیوں سے بچا رہتا ہے، غور وفکر کا خوب موقع ملتا ہے، علمی توجہ کا موقع ملتا ہے، غیبت، جھوٹ، چغلی، لوگوں سے حسد، کینہ

ان سب سے بچنے کا موقع ملتا ہے، پھر آدمی تنہائی میں جی لگا کر اپنا کام کر لیتا ہے، دنیا اور اس کے تعیشات کی طرف توجہ کم رہتی ہے۔ اسی لیے صاحب دل لذت اور خوشی تنہائی میں پاتے ہیں۔ اختلاط اور میل جول سے جو گناہ ہو جاتے ہیں انسان ان سے محفوظ رہتا ہے۔ لوگوں سے مل کر برائی دیکھتا ہے، منع کرتا ہے تو لوگ دشمن ہو جاتے ہیں اور چپ رہتا ہے تو اپنی ذمہ داری سے غفلت کرتا ہے۔ اختلاط ہی سے ریاکاری جنم لیتی ہے۔ ملنے جلنے میں کبھی آدمی مالدار سے ملتا ہے، ان کے عیش کو دیکھتا ہے تو خدا کی شکایت سے پناہ رہتی ہے۔ لوگوں کی جان اور دین محفوظ رہتے ہیں۔ پھر لوگ گوشہ نشین ہو کر اس بات سے محفوظ رہیں گے کہ کسی کو ان کی ذات سے تکلیف پہنچے، کسی پر مذاق، استہزاء کا موقع نہیں ملتا۔ کسی کے لیے بدگمانی اور برائی دلوں میں نہیں آسکتی، جس قدر ملنے والے کم ہوں گے دل اور دین کدورت سے محفوظ رہے گا اور لوگوں کے حقوق اپنے اوپر کم سے کم ہوں گے۔ ایک بزرگ کا قول ہے جس کو پہچانتے ہو اس سے اجنبی بن کر رہو اور جس کو نہیں پہچانتے اس سے آشنائی مت پیدا کرو۔ کسی سے تم کو کوئی لالچ نہ ہو گا نہ تم سے کوئی لالچ رکھے گا"۔

پہلی بات یہ ہے کہ لوگوں کو تم سے کوئی طمع اور لالچ نہ رہے یہ اچھی بات ہے کیونکہ لوگ لالچ کثرت سے کریں اور تم پورا نہ کر سکو گے تو لوگوں کو شکایت ہوگی لوگوں کی غمی اور خوشی میں برابر شریک رہو گے لیکن کہیں کسی مجبوری کی وجہ سے نہ جا سکنے میں سینکڑوں شکوے شکائتیں پیدا ہوں گی کیونکہ سب کے حقوق کو پورا پورا ادا کرنا، یہ ناممکن ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ عزلت نشینی اختیار کر لے۔ دوسری صورت یہ کہ تمہاری امیدیں اور تمہارا لالچ لوگوں سے منقطع رہے گی۔ اس میں بھی بڑا فائدہ ہے، دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے والا عام طور پر نامراد و ناکام ہی دیکھا گیا ہے۔ پھر وہ اپنے وقار اور خودداری کو بھی داؤں پر لگاتا ہے۔ دنیا کی طمع اور لالچ عام طور پر اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ طرح طرح کے لوگوں سے ملا جائے، ان کے سامان اور ان کے عیش پر نگاہ پڑے، گوشہ نشینی سے اٹھے تو فقیروں اور

مسکینوں کے پاس بیٹھے، اس سے شکر کی شان پیدا ہوگی، قناعت اور دل کی بیداری نصیب ہوگی عوام میں اکثر کم عقل اور معترض قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کم آمیزی کی وجہ سے ان سے احتیاط رہتی ہے۔ جالینوس نے کہا ہے ''احمق لوگوں کو دیکھنا ہی روح کے لیے بخار ہے۔''

اب تھوڑا سا بیان عزلت اور گوشہ نشینی کے نقصانات کے سلسلے میں ہوگا۔ تاکہ پڑھنے والا فیصلہ کر سکے کہ دونوں میں سے کس کا پلہ بھاری ہے۔

نیکی اور بھلائی، خدمت خلق کے بہت سے امور ایسے ہیں جو مل جل کر انجام پاتے ہیں۔ گوشہ نشینی سے وہ سب ختم ہو جائیں گے، تعلیم و تعلم، وعظ و نصیحت رفاہ عام کے دوسرے کام، ادب دینا اور سیکھنا، دوسروں کا انس حاصل کرنا، دوسروں کے لیے انیس و رفیق بننا، حقوق کی ادائیگی تجربات حاصل کرنا، تواضع سیکھنا اور کرنا، لوگوں کے حالات و واقعات سے عبرت حاصل کرنا۔ یہ سب فائدے جو اختلاط اور ملنے جلنے سے حاصل ہوتے ہیں، سب بند ہو جائیں گے۔ سب سے بڑا نقصان سلسلۂ تعلیم کا ختم ہونا ہے جس کے بغیر خیر اور بھلائی کی ساری بنیادیں بیکار ہیں۔ کسی کا صحیح قول ہے ''پہلے عالم بنو، پھر زہد اختیار کرو'' کیونکہ علم ہی دین اور تقوٰے کی اصل ہے۔ جاہل شخص دین، ایمان، عقیدے اور انسانیت سب کا دشمن ہوتا ہے۔ اگر علم و حکمت سے توانائی حاصل ہو چکی ہے تو تنہائی کی عبادت اور غور و فکر بھی فائدہ دے گی اس لیے عزت کا حق بھی عالم ہی کو ہوتا ہے، پھر بہتر اور اچھا آدمی وہ ہے جس سے دنیا میں لوگوں کو نفع پہنچے، بعض لوگوں سے ملنے کے نقصان کے خوف سے فائدے اور نفع کو منقطع کر دینا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمت سے کام لے۔ لوگوں سے مل کر بھی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ پھر لوگوں سے ملنے ملانے میں تجربات کے علاوہ ذہن اور دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے جو ایک مفید اور نیک کام کرنے کے لیے معاون ہے، وہ دماغ کو آرام اور سکون پہنچا کر مزید کام کر سکتا ہے۔ لوگوں کی غمی اور خوشی میں شریک نہ ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے ہاں اگر دکھاوے کے لیے یہ سب کرے گا تو

دوسروں کی شکایت کا ڈر رہے گا، انسان اگر کسی اچھے مقام اور نیکی پر پہنچنا چاہتا ہے تو اختلاط اس میں مانع نہیں ہوگا کیونکہ میعار یہ مانا گیا ہے کہ ''معرفت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک دو چیزیں حاصل نہ ہو جائیں ایک تو لوگوں سے ملے مگر اس کا ملنا، معاملہ کرنا سب خدا کے لیے ہو جائے، دوسرے اس کا نفس اس کی نظر میں اس طرح ہیچ ہو جائے کہ اسے پرواہ نہ رہے کہ لوگ اسے کیا کہہ رہے ہیں''۔ دیکھئے یہ معیار بغیر اختلاط کے ممکن نہیں ہے۔ باقی لوگوں کے اعتراض اور طعنے کا ایک ہی جواب ہے۔ جب حضرت موسیٰ نے دعا مانگی اے خدا لوگوں کے طعنے اور اعتراض کی زبان جو میرے حق میں دراز ہے اسے روک دے تو جواب ملا: اے موسیٰ جو بات میں نے اپنے لیے پسند نہیں کی اس کی دعا تو کیوں مانگتا ہے۔

پھر گوشہ نشینی کی آفت یہ بھی ہے کہ آدمی تمام تجربات سے محروم رہتا ہے۔ سارے کام عقل ہی کی روشنی میں انجام نہیں پاتے۔ تجربہ بھی ضروری ہے۔ اپنے نفس اور اخلاق کا جائزہ لینے کے لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی گوشہ نشینی سے باہر آئے۔ مخالفتوں کا مقابلہ ہو اور تب برداشت اور خوش اخلاقی پیش کرے۔

اگر کوئی گوشہ نشینی اور عزلت اختیار کرنا چاہے تو اس کے چند آداب ہیں۔ یہ سوچے کہ میری برائیاں دوسرے تک نہ پہنچیں اور میں خود دسروں کی شرارت سے محفوظ رہوں۔ تنہا رہ کر علم و تعلم، ذکر وفکر میں غور کرے، کام کرے اور وقت ضایع نہ کرے۔ دنیا کے شور و شغب سے، رسائل و مسائل، تعریف و تنقیص، شماتت ہمسایہ اور دوسری باتوں سے خود کو دور رکھے، کسی نیک اور پاکیزہ سیرت شخص سے ملتا بھی رہے تاکہ تنہائی کی وحشت سے محفوظ رہے، امیدوں اور آرزوؤں کو مختصر رکھے، اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے نفس کے خلاف جہاد کرتا رہے۔

سفر کے آداب

سفر میں اخلاق و عادات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتے ہیں، چونکہ طبیعت

کے خلاف بہت سی باتیں سفر میں پیش آتی ہیں اس لیے صبر و برداشت کا بھی امتحان ہو جاتا ہے، سفر میں طرح طرح کی باتیں پیش آتی ہیں اس لیے تجربات بھی خوب حاصل ہوتے ہیں۔

کوئی بڑا سفر درپیش ہو تو نکلنے سے قبل حقوق کی ادائیگی کر دے، قرض ادا کر دے، ذمہ داروں کو خرچ دے دے، امانت واپس کر دے، زادراہ اس قدر اپنے ساتھ لے کہ محتاج نہ رہے، سفر میں خوش اخلاقی برتے، خود پر دوسروں کو ترجیح دے، دوسروں کے آرام کا خیال رکھے۔ چاہے خود کو تھوڑی سی تکلیف اٹھانی پڑے۔ نرم گفتگو کرے، مکارم اخلاق ظاہر کرے۔ سفر کلفت اور تکلیف کی جگہ ہے۔ جو شخص سفر میں خوش اخلاق رہا فطرتاً وہی با اخلاق مانا جائے گا۔ انسان کا مکمل اخلاق اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب سفر کے ساتھی اس کی تعریف کریں، ساتھیوں کے آرام کا خیال رکھتا ہو، کرایے اور اجرت میں جھگڑا نہ کرے، ساتھیوں کو جس چیز کی ضرورت ہو اس کو دینے میں دریغ نہ کرے، رفیقوں اور دوستوں کو ہنسی مذاق سے خوش رکھے تاکہ سفر کا بوجھ محسوس نہ ہو۔

سفر کے لیے ممکن ہو تو ایک ساتھی چن لے، ایک ذمہ دار ساتھ ہو تو سفر آسان رہتا ہے۔ بشرطیکہ ذمہ دار کی اطاعت کرتا رہے، سفر سے پہلے دوستوں سے ملے، ان سے نیک تمنائیں لے کر نکلے۔ کوشش کرے کہ سفر کے لیے صبح سویرے کوچ کرے۔ اگر کوئی مہمان سفر کر رہا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس کو کچھ دور رخصت کرنے جائے۔

اگر کوئی جانور سواری کے لیے ہے یا سامان لادنے کے لیے ہے تو اس پر نرمی کرے، زیادہ سامان نہ لادے اور اس کو زیادہ نہ مارے۔ منہ پر نہ مارے جانور پر نہ سوئے۔ سونے سے بوجھ بڑھ جاتا ہے، سواری والے سے معاملات صحیح صحیح اور کرایہ پہلے سے طے کر لے تاکہ بعد میں جھگڑے کا خطرہ نہ رہے، افراد کی تعداد اور سامان کی مقدار بتا کر اجرت طے کرے تاکہ جھگڑے کا امکان نہ رہے اور جس قدر سامان یا افراد طے کیے گئے

ہیں اس سے زائد نہ کرے، سفر سے واپسی پر گھر میں اچانک نہ داخل ہو اور نہ خالی ہاتھ آئے، بچے بڑی حسرت سے دیکھ کر رہ جاتے ہیں۔

راگ، سماع اور وجد کے آداب

راگ کان کے ذریعے براہ راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور دل میں اچھی بری جو خصلت ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دیتا ہے، راگ اور سماع کے کچھ آداب و شرائط ہیں، راگ سے جو حالت دل پر ہوتی ہے اس کو وجد کہا جاتا ہے جس سے بدن کے اعضا کو حرکت ہوتی ہے۔ اگر یہی اعضا کی حرکت موزوں اور مرتب طریقے سے ہے تو اسی کو رقص کہہ دیا جاتا ہے اور اس میں موزونیت نہ ہو تو وہ اضطراب یا تڑپ ہے۔ راگ اور سماع کو بعض لوگ صحیح خیال کرتے ہیں، بعض اس کو برا سمجھتے ہیں اور منع کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ تفصیل کے بعد دونوں پہلو سامنے آجائیں گے۔

دراصل راگ اچھی آواز کو کہتے ہیں۔ وہ آواز جو موزوں ہو اور اس کے معنی کچھ سمجھ میں آتے ہوں، وہ دل پر اثر کرتی ہو۔ اس تعریف کے بعد جو آواز بھی ایسی ہوگی وہی راگ کہلائے گی۔ یہ اچھی آواز جب موزوں ہو اور معنی بھی سمجھ میں آتے ہوں تو وہی اشعار ہیں، اور اگر صرف اچھی آواز تو ہو موزوں نہ ہو اور معنی نہ ہوں تو وہ بعض خوش گلو پرندوں کی آواز ہے۔ اب اگر کوئی اچھی آواز کو پسند کرتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا یہ برا کیوں ہوگا۔ بلبل اور قمری کے چہچہے کا پسند آنا یہ تو ایک فطری بات ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اچھی آواز میں صرف قرآن پڑھا جائے تو سننا ٹھیک ہے ورنہ نہیں۔ تو جناب یہ پرندے کون سا قرآن پڑھتے ہیں، پھر بھی ان کی آواز ہمیں پسند آتی ہے۔ یہ ہماری فطرت ہے، اسی طرح اگر کوئی حکمت اور سچے معنی کو اچھی آواز میں پیش کرتا ہے تو اس کا سننا کون سا گناہ ہو گیا۔ اشعار اگر اچھی آواز سے گائے جا رہے ہیں تو ان کا برا ہونا قطعی نا سمجھی کی بات ہے۔ انسان کے گلے سے نکلی ہوئی آواز اگر اچھی ہے اور اس کو سننا برا نہیں ہے تو اگر اس آواز میں کچھ موزوں اور

بامفہوم کلام سنایا جائے تو اس کا سننا کیسے برا ہوسکتا ہے یعنی نہ اچھی آواز کوئی ناپسندیدہ چیز نہ کلام مفہوم کوئی بری چیز، نہ موزوں کوئی ممنوع چیز، تو ان سب کو ایک جگہ کر دیا جائے تو وہ کیوں بری ہوگئی۔ ہاں اگر کوئی بری اور مکروہ چیز یا مضمون شعر میں پیش کیا جارہا ہے تو اس کا سننا واقعی بری بات ہوگی۔ مگر اس میں اشعار کا کیا قصور۔ یہ چیز تو شعر اور نثر دونوں میں یکساں بری سمجھی جائے گی۔ جب شعر بغیر نغمے کے پڑھا اور سنا جاسکتا ہے تو نغمے کے ساتھ سننے میں کیا حرج ہے۔ کیا انسان جانور کے احساسات سے بھی کم ہے۔ اونٹ کو حدی کی آواز سے جو سرور ہوتا ہے اس کی برق رفتاری سے ظاہر ہوتا ہے۔ تو کچھ خدا کا بھید ہے کہ نغمہ موزوں کا روح سے ایک تعلق ہے اور وہ نغمہ موزوں روح میں اثر کرتا ہے اور اس طرح اثر کرتا ہے کہ بعض نغمہ سرور کرتا ہے بعض غم عطا کرتا ہے کوئی جگاتا ہے کسی سے نیند آتی ہے۔ اسی طرح بعض نغموں سے اعضا بدن متحرک ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے جس شخص کو موسم بہار، شگوفے اور نغمے حرکت نہ دیں وہ طبعاً بیمار اور ناقص ہے۔ نغموں کے مفہوم و مطالب کا سمجھنا ہی ضروری نہیں ہے۔ بچوں کو لوری دو تو ان کو نیند آجاتی ہے۔ اونٹ غبی جانور ہے مگر حدی سن کر دوڑ پڑتا ہے اور اس قدر مستی میں بھاگتا ہے کہ بعض اوقات ہلاک ہو جاتا ہے۔ ہاں راگ اور سماع بعض مواقع پر ممنوع بھی ہیں۔ وہ ایسی چند جگہیں جہاں فتنے، گناہ اور برائی کا خطرہ ہو۔ مثلاً اخلاقی لحاظ سے گرا ہوا ہو، محفل سماع میں وہ ساز ہوں جن کا بجانا اور سننا ممنوع ہے، شعر میں کسی عورت کا سراپا اس انداز میں کھینچا جائے کہ اس کی بے پردگی ہو۔ گانے والی کوئی حسین عورت ہو جس کی طرف دیکھنے سے فتنے کا خطرہ ہو وغیرہ۔

سننے والے کی نیت خراب ہو۔ طبیعت میں آوارگی اور شرارت ہو۔ نیز خطرہ ہو کہ شعر و نغمے سے اس کی طبیعت میں شراب و کباب اور پھر غیر مناسب حرکتوں کا داعیہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ ایسی صورتوں میں راگ اور سماع سے پرہیز بہتر ہے، یا پھر ہر وقت اسی مشغلے میں لگا رہتا ہو تو اسے بھی احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ کوئی چیز کتنی ہی اچھی اور صحیح ہو زیادتی اس کی بھی بری ہوتی ہے۔ مثلاً گال پر ایک تل حسن کا سبب ہے مگر سارے

منہ پر تل ہی تل بدنمائی ہے، معلوم ہوا حسن وخوبی کی زیادتی بھی کبھی مصیبت بن جاتی ہے۔

دوسرا مقام وجد ہے۔ وجد اس وقت طاری ہوتا ہے جب مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور سننے والا کلام کو اپنے مطلب پر ڈھالتا ہے۔ بعض صوفیا کہتے ہیں کہ دل کا حق کی طرف مائل ہونا وجد ہے کچھ کہتے ہیں سماع میں ایک مخصوص حالت پیدا ہوتی ہے جس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہے وہ وجد ہے۔

بہر حال سماع روح کے لیے غذا ہے، اعمال میں سے بہت لطیف اور پر اثر عمل ہے۔ اس کے اہل وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا دل پاک وصاف ہوتا ہے اور وہی سماع سے رقت قلب حاصل کرتے ہیں۔ وجد کے بارے میں بعض صوفیا نے یہ بھی کہا ہے کہ انسان کے دل پر حضرت حق کی طرف سے کچھ مکاشفات وارد ہوتے ہیں، اسی کا نام وجد ہے۔ سالک پر جب وجد کا نور چمکتا ہے تو اس پر سے شکوک وشبہات اٹھ جاتے ہیں۔ یہ اقوال وجد اور سماع کے بارے میں صوفیا کے تھے۔ اس سلسلے میں حکماء اور دانشمندوں نے جو تجزیہ کیا تو نئے نئے پہلو نکالے۔ ایک حکیم نے کہا۔

دل میں ایک عمدہ فضیلت تھی جس کو قوت گویائی ظاہر نہ کر سکی تو نغموں نے اسے باہر نکال دیا اور جب وہ ظاہر ہوئی تو نفس بہت خوش ہوا اور طرب میں آ گیا، بعض کا خیال ہے کہ سماع میں یہ قوت ہے کہ کمزور رائے والا مستعد اور عزم راسخ کا مالک ہو جاتا ہے، فکر سے خالی ذہن سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، فکر پیدا ہو جاتی ہے۔ کند ذہن چالاک ہو جاتا ہے، درماندہ چست ہو جاتا ہے، خیال اور رائے میں بجلی کی سی سرعت پیدا ہو جاتی ہے، سچائی اور نیکی پیدا ہو جاتی ہے۔ علم، فکر پر معلومات کا خزانہ کھولتا ہے اور سماع دل پر روحانی عالم کا در کھولتا ہے۔ غم نفس کا نور بجھا دیتا ہے اور خوشی سے نفس کا نور چمک اٹھتا ہے اس لیے غمزدہ کو ضرور سماع سننا چاہیے۔

سماع کے آداب میں یہ بات خیال رکھنے کی ہے کہ وقت موزوں ہو مثلاً کھانے کا، لڑائی جھگڑے کا، نماز کا وقت نہ ہو ورنہ دل نہ لگے گا، مجلس موزوں ہو مثلاً عام راستہ نہ ہو،

کوئی بری جگہ نہ ہو جہاں دل نہ لگے، اکھڑا اکھڑا سا رہتا ہو، ارباب مجلس با ذوق ہوں، کوئی بدمذاق سماع کا منکر، زاہد خشک لطائف سے خالی اور آداب مجلس سے بے بہرہ سطحی مذاق والا شخص نہ ہو۔ ایسے شخص کی موجودگی گرانی کا سبب ہوگی، کوئی متکبر دنیا دار نہ ہو ورنہ اسی کی خاطر و لحاظ میں دل الجھا رہے گا۔ صوفی جو سر پٹکتا، کپڑے پھاڑتا ہو، ناچنے لگتا ہو، اس سے بھی پرہیز کرے، ایسا مبتدی جو سماع کی باریکیوں اور حقیقتوں سے ناواقف ہو اس کے سامنے بھی سماع نہ سننا چاہیے۔ ممکن ہے ایسے مبتدی کے حق میں سماع مضر ہو اور اس کو راہ حق سے روک دے۔ یا مبتدی آداب سماع سے تو واقف ہے مگر علم کی تحصیل نہیں کر سکا ہے تو وہ بھی سماع کو خدا کی محبت پر نہیں ڈھال سکے گا۔ پھر پڑھنے والا جو کچھ پڑھے اس کو غور سے دل لگا کر سننا چاہیے۔ ادھر ادھر نہ بھٹکے، لوگوں کی حرکتوں کو نہ دیکھے خود پر دھیان رکھے، دل کی نگرانی رکھے۔ بدن کو وقار کا پابند رکھے، بہکنے اور تھرکنے نہ دے گردن نیچی رکھ کر فکر کی حالت میں رہے۔ اس کا خیال نہ کرے کہ لوگ سخت دل کہیں گے اس لیے وجد کرنا ضروری ہے، اکابرین صوفیا ذرا سی حرکت فرماتے پھر ساکت وصامت باوقار رہتے تھے جن لوگوں کی حالت ہمہ وقت مشہود باری تعالیٰ رہتی ہے وہ حال یا وجد میں یکساں رہتے ہیں، صبر وضبط کو برقرار رکھتے ہیں، اگر نفس پر قابو ہو تو سماع میں کھڑا نہ ہو، زور سے نہ روئے، نہ جھومے، آہ یا واہ نہ کرے، ہاتھ نہ پھینکے، دل کی کیفیت نگاہ سے ظاہر ہو اور بس۔

اگر کسی سچے، صاحب دل عاشق کو وجد آ گیا، وہ کھڑا ہو گیا اور ساری مجلس کھڑی ہوگئی تو خود بھی کھڑا ہو جائے تاکہ محفل کی موافقت حاصل رہے، صحبت کا ادب اور حسن معاشرت یہی ہے۔ کہا گیا ہے جو قوم جس انداز کی ہو اس سے اسی طرح ملو یعنی لوگوں سے ان کے اخلاق و عادت پر ملو۔

اچھی باتیں بتاؤ بری باتوں سے روکو

اگر یہ سلسلہ نہ ہوتا تو تباہی عام ہوتی، گمراہی کا رواج ہوتا۔ اس کا خیال رہے کہ ہر شخص کا یہ منصب نہیں ہوتا نہ ہر ایک کے لیے یہ ضروری ہے، یہ ایک نیک کام ہے اس میں خوف اور مصلحت اندیشی کی ضرورت نہیں ہے، برائی برائی ہے چاہے جس سے سرزد ہو۔ اسے روکنا ہی چاہیے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ جابر و ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہہ دی جائے۔

یہ کام وہی کرسکتا ہے جو ایک طرف علم و حکمت سے مزین ہو اور دوسری طرف خود باعمل، بُرائیوں سے بچنے والا اور بااخلاق ہو، تاکہ نرمی اور ملائمت سے بات کرسکے اور صحیح باتیں بتاسکے، ممکن ہے اس سلسلے میں لوگوں کی طرف سے سختی و مصیبت اٹھ کھڑی ہو تو اس کو بھی برداشت کرسکتا ہو، عوام کو کوئی بات سختی سے بتاؤ گے یا کسی بُرائی سے روکو گے تو یقیناً ان میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا اور اس سے مقصد فوت ہو جائے گا۔

بعض باتیں جن سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے یہ ہیں ___ اپنے مکان سے متصل ستون یا چبوترہ نہ بنائے جس سے دوسروں کو تنگی ہو۔ چھجہ، برآمدہ وغیرہ راستے میں نہ نکالے کہ راستہ تنگ ہو جائے، راستے میں سامان، لکڑی، کوڑا کرکٹ نہ ڈالے، جانور راستے میں نہ باندھے ورنہ لوگوں کو تنگی بھی ہوگی اور کپڑے بھی گندے ہوں گے۔ ان باتوں سے منع کرسکتا ہے۔ جانوروں پر کانٹا اس طرح نہ لادے کہ خود جانوروں کو بھی تکلیف ہو اور راہ چلنے والوں کے کپڑے پھٹ جائیں۔ جانور پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادے۔ گھر یا دوکان کے سامنے جانور ذبح کرکے سڑک، گلی اور نالی خون آلود نہ کرے کہ دوسروں کو نفرت ہو، کوڑا، گندہ پانی سڑک پر نہ بہائے کہ لوگ پھسلیں یا کپڑے خراب ہوں، تنگ راستے میں نالی نہ نکالے، راستے میں کلی نہ کرے، ان سب باتوں سے روکے اور منع کرے، اگر بادشاہ، امراء اور سلاطین کو نصیحت کرنی ہے تو سختی اور اصرار نہ کرے، اچھے انداز، پرخوش اسلوبی سے

کام نکالے۔ بہتر یہ ہے کہ نہ اُن کا خوف دل میں ہو نہ کوئی لالچ، تب نصیحت اثر بھی کرے گی۔ رعیت کو بادشاہ سے خرابی آتی ہے اور بادشاہ کو علما سے خرابی پہنچتی ہے اور علما مال کی محبت میں گمراہ ہوتے ہیں۔ مال کی محبت میں گرفتار یا عزت ووقار کے طالب گار علما کبھی نصیحت نہیں کر سکتے۔

جلد سوم

اسلام کی اخلاقی تعلیمات

قلب کا بیان

قلب کے لیے دو لشکر بطور معاون کے ہیں' ایک ظاہری لشکر مثلاً ہاتھ' پیر' زبان' کان وغیرہ دوسرا وہ جسے صرف عقل محسوس کر سکے۔ یہ سب لشکر عقل کے تابع ہیں' عقل کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں' قلب کا اصل کام نیکی اور راہ ہدایت کی طرف چلنا ہے' اس بلند مقصد کے لیے قلب کو کوئی سواری یا کوئی قیام کی جگہ چاہیے اس لیے بغیر جسم انسانی کے سہارے کے یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اب جسم کو اس عظیم سفر کے لیے سواری سمجھیں' علم کو زادِ راہ اور نیک اعمال اور اچھی باتوں کو اس زادراہ کو حاصل کرنے کا ذریعہ۔ چونکہ قلب کا نیک راستوں پر چلنے کا بظاہر مطلب بندے کا چلنا ہے لہٰذا بدن کی سلامتی اور تندرستی بندے کے لیے ضروری ہوئی تاکہ وہ اس نیک مقصد کے لیے مستعد رہ سکے اور اس بڑی منزل کے لیے دنیا اور اس کی ضرورتیں گویا چھوٹی چھوٹی منزلیں ہیں جن کو طے کرنا ضروری ہے۔ چونکہ بدن ہی وہ سواری ہے جس کے ذریعے قلب انسانی اپنے کام کرتا ہے اس لیے بدن کی حفاظت اور اس کی کفالت بھی ضروری ہوئی اور بدن کی حفاظت یہی ہے کہ اس کو موافق غذائیں دی جائیں اور مہلک غذاؤں سے بچایا جائے۔

انسانی قلب کی خاصیت

اعضا اور حواس انسانوں کی طرح دوسرے حیوانوں کو بھی ملے ہیں۔ یہ حیوان میں احساس ہی کی علامت تو ہے کہ بکری بھیڑیے کی آنکھ میں جھانک کر ایک خاص قسم کی

عداوت محسوس کر لیتی ہے' اس لیے اب کچھ خاص چیزیں ایسی ہونی چاہئیں جو قلب انسانی کے لیے مخصوص ہوں اور جو حیوان میں نہ پائی جائیں۔ یہ ہیں علم اور ارادہ۔ علم کا مطلب ہے دینوی اور اُخروی امور کا علم' عقل کی اصلیت کا' اس کی حقیقت کا علم۔ اور ارادے کا مطلب ہے کہ انسان کسی کام کو سوچے' اُس کام کے نتیجے کو اپنے لیے بہتر سمجھے۔ اُس وقت اُس کے دل میں اس نتیجے کو حاصل کرنے کے لیے جو شوق پیدا ہوگا اسی کا نام ارادہ ہے' انسان کی ہر خواہش کو ارادہ نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً بیماری کے بعد لذیذ کھانوں کی خواہش کا ہونا ارادہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہر عاقل آدمی اپنی خواہش کو رد کرے گا کیونکہ اسے اپنے لیے بہتر نہیں سمجھتا۔ خلاصہ یہ کہ خاصیت انسانی اور انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کرنے والی چیزیں یہی علم و ارادہ ہیں۔ انسان کے لیے کامل سعادت اسی میں ہے کہ اس کا مقصد خدا کی رضامندی حاصل کرنا ہو اور وہ قلب اور اعضاء بدن کو اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ذریعہ اور خادم سمجھے۔ ادراک اور سمجھ کی قوت' جس سے وہ اچھے اور برے میں تمیز کرتا ہے اس کو اپنا حاکم جانے جس کا دارالسلطنت قلب ہے' پھر اس کے دماغ میں ایک قوت ہے جس کو قوت خیال کہتے ہیں۔ یہی قوت خیال قلب کے لیے قاصد ہے۔ دنیائے محسوسات کی ساری خبریں اسی قوت کے پاس جمع ہوتی ہیں۔ وہاں سے قوت حافظہ میں پہنچتی ہیں' یہ خزانچی کی طرح اُنھیں محفوظ رکھتی ہے' زبان حاکم کی ترجمان ہے اور بدن کے تمام اعضا اُس کا بادشاہ یا حاکم "قوت خیالی" کے لیے مثل محرر کے ہیں۔ اور حواس خمسہ جاسوس کا کام کرتے ہیں' آنکھ دنیائے رنگ پر مقرر ہے' کان دنیائے آواز پر' ناک خوشبو لیتی ہے' غرض جن اعضاء کو جس قسم کی قوت دی گئی ہے وہ اپنی اپنی خبریں قوت خیالی کو دیتے رہتے ہیں۔ قوت خیالی ان کو حافظے کے سپرد کر دیتی ہے' حافظہ ان کو جمع رکھتا ہے اور وقت پر قوت مدرکہ تک پہنچاتا ہے' قوت مدرکہ یا قلب ان چیزوں کو لے لیتا ہے جو انسانی سعادتوں اور نیک بختیوں کے لیے ضروری ہوتی ہیں جن سے انسان کو ہدایت ملتی ہو یا دنیا کے خطرات سے حفاظت رہتی ہو

اور دنیاوی فائدے کے لیے مفید ہو۔ قلب کے لیے یہی کامیابی کا راستہ ہے' اب اگر قلب ان چیزوں سے کام نہ لے یا کام تو لے مگر محض دنیاوی لذتوں کا کام لے تو یہ بڑی بدبختی کی بات ہوگی۔ اسی کو کہا گیا ہے اگر بدن میں قلب صالح ہے تو تمام اعضاء اور اُن کے اعمال صالح ہوں گے اور اگر قلب فاسد ہوگیا تو تمام اعضاء اوران کے افعال فاسد ہوں گے۔ قلب کو خدا کا برتن کہا گیا ہے اس میں سب سے اچھا برتن وہ ہے جو نرم اور صاف بھی ہو اور سخت بھی ہو' یعنی بھائیوں کے ساتھ نرم' یقین میں صاف مثل آئینے کے اور اپنے مذہب وعقیدے میں سخت ہو' شک وشبہات سے بالاتر ہو۔

قلب کی مثال

انسان جو علم حاصل کرتا ہے اس کا محل اور مرکز قلب ہی ہوتا ہے۔ قلب کی مثال یوں سمجھیے کہ وہ ایک آئینہ ہے' جس طرح چیزوں کی صورت آئینے میں آجاتی ہے اسی طرح قلب پر بھی منعکس ہوتی ہے' ظاہر ہے آئینہ ایک الگ چیز ہے' انسان کا چہرہ یا اور کوئی چیز کا آئینے میں منعکس ہونا یہ بالکل الگ فعل ہے۔ اسی طرح قلب الگ ایک شے ہے۔ مادّی یا معنوی صورتیں جو قلب پر آتی ہیں وہ الگ چیزیں ہیں اور قلب پر صورتوں کا منعکس ہونا یہ ایک الگ فعل ہے۔ اب یہ ممکن ہے کہ شے اور اس کی حقیقت موجود ہو اور قلب بھی موجود ہو مگر قلب کو اُس چیز یا اُس کی حقیقت کا علم نہ ہو' کیونکہ اس حقیقت کے دل میں منعکس ہونے کا فعل یہاں نہیں پایا جا رہا ہے پھر جس طرح آئینے میں انسان کی شکل یا چیزیں خود نہیں پہنچتیں بلکہ ان کی حقیقت پہنچتی ہے یہی حال قلب کا ہے۔ مثلاً قلب کو آگ کا علم ہوا تو آگ بعینہٖ قلب میں نہیں جائے گی ورنہ تو قلب خاکستر ہو جائیگا۔ ہاں آگ کی حقیقت کا علم دل کو ہوگا۔ اگر آئینہ اچھا نہ ہو' اس کے جوہر میں نقصان ہو تو اس میں صورت اچھی طرح نظر نہیں آئے گی' اسی طرح اگر قلب میں نقصان ہے' اُس کی صلاحیت کو کسی وجہ سے نقصان پہنچ گیا ہے تو قلب پر چیزوں کا پوری طرح انکشاف نہ ہوگا یا آئینہ خود تو اچھا ہو مگر اس پر کسی

خارجی وجہ سے کدورت آ گئی ہو تب بھی صورتیں صاف نظر نہ آئیں گی' اسی طرح قلب خود تو صالح ہو مگر خارجی بُرائیوں اور گناہوں کی کدورت کا میل برابر اُس پر پڑتا ہو اور وہ گندہ ہو چکا ہو تب بھی چیزوں کی حقیقت اس پر پوری طرح منکشف نہ ہوگی۔ انسان کا چہرہ یا کوئی چیز اگر آئینے کی پُشت کی طرف ہو تو ظاہر ہے آئینے میں اس کا عکس نہیں آئے گا۔ اسی طرح قلب کے سامنے اگر اللہ کی رضا اور نیک مقصد نہ ہوگا تو کس طرح قلب پر اس کا عکس پڑ سکتا ہے اُس وقت تو دنیاوی خواہشیں فانی لذتیں اور جو غیر ضروری امور قلب کے سامنے ہوں گے اُنھیں کا عکس اُس پر پڑے گا۔ اسی طرح اگر آئینے اور مطلوبہ چیزوں کے درمیان کوئی رکاوٹ ہو تو ظاہر ہے وہ چیز آئینے میں نظر نہیں آئے گی اسی طرح کوئی نیک شخص چیزوں کی حقیقت کو باوجود کوشش کے نہ پا سکے تو تلاش کے بعد پتہ چل سکتا ہے کہ کوئی چیز اُس کے قلب اور چیز کی حقیقت کے درمیان مانع اور حجاب بن رہی ہے' کبھی تو یہ حجاب اس کے آباو اجداد کے دور کا تقلیدی ذہن ہوتا ہے جو امر حق کے منکشف ہونے میں مانع ہوتا ہے' کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ظن و گمان کے ذریعے کسی بات کا خاص اعتقاد قلب پر جما لیتا ہے اور سمجھتا رہتا ہے کہ یہی حقیقت اور امر حق ہے۔ پھر اصل حقیقت کی تلاش میں یہ اعتقاد رکاوٹ بن جاتا ہے۔ چنانچہ جب ایک ذہن تقلیدی اعتقاد سے ہٹ کر سوچنے کو تیار نہیں ہوتا تو صحیح اور سچی بات میں یہی بات رکاوٹ بن جاتی ہے۔ پھر جس طرح آئینے میں چیزوں کو دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو صحیح سمت اور صحیح ترتیب سے رکھا جائے تاکہ ان کا عکس آئینے پر پڑ سکے اسی طرح حقیقتوں یا امر حق کے قلب پر انکشاف کے لیے ضروری ہے کہ کچھ ظاہری مقررہ اصولوں کو صحیح انداز پر تسلیم کیا جائے' حقیقت تک پہنچنے کے لیے جو قابل تسلیم دلائل ہیں ان کو تسلیم کیا جائے تب قلب پر وہ حقیقت منکشف ہوگی۔ اگر ضد یا لاعلمی کی وجہ سے ان ظاہری اور بنیادی باتوں ہی کا انکار کر دیا جائے تو اصل مقصد کا پتہ چلنا مشکل ہے' خلاصہ یہ کہ ان وجود سے قلب کو آئینے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اگر مذکورہ

خارجی اسباب مانع نہ ہوں تو ہر قلب میں فطری طور پر حقیقت کو پا لینے کی صلاحیت عطا کی گئی ہے۔ انسان کا قلب تو بہت اشرف اور اعلیٰ چیز ہے' خدا کا گھر ہے۔ اچھے اعمال اور نیک باتوں پر عمل کرنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان کا دل صاف اور نرم ہو جائے۔ پھر اس میں خدا کا نور بھی سما سکے گا اور اچھی باتوں کو قبول کرنے کی گنجایش بھی پیدا ہو سکے گی قلب میں ہدایت اور یقین حاصل ہونے کے تین درجے ہیں۔ ایک ایمان ویقین عوام کا ہے جس کی بنیاد صرف تقلید پر ہوتی ہے۔ دوسرا ایمان متکلمین کا ہے۔ جن کے یہاں کچھ نہ کچھ دلیل اور حجت ہوتی ہے' تیسرا ایمان عارف اور کامل لوگوں کا ہے جو پختہ یقین سے مزین ہوتے ہیں' تینوں درجے ایک مثال سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ زید گھر کے اندر موجود ہو تو اس کو جاننے کی تین صورتیں ہیں۔ کسی نے یہ بات لوگوں کو بتائی کہ زید گھر میں ہے اور لوگوں نے مان لیا۔ یہ عوام کا تقلیدی ایمان ہوا۔ سنِ تمیز کو پہنچنے کے بعد لوگ جو کچھ اپنے ماں باپ اور ماحول سے سنتے ہیں بلا چون و چرا مان لیتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ زید کی آواز خود گھر کے اندر سُن رہے ہوں۔ ظاہر ہے اُن کی تصدیق پہلے کے مقابلے میں قوی ہے کیوں کہ انھوں نے لوگوں سے سن کر فوراً فیصلہ نہیں کیا بلکہ ایک تو خود زید کی آواز سنی پھر اُس پر دلیل قایم کی کہ یہ واقعی زید ہی کی آواز ہے' ایسا تو نہیں کہ کسی نے زید کی آواز کی مشق کر لی ہو اور بول رہا ہو۔ تیسری صورت یہ کہ کوئی گھر کے اندر جا کر زید کو دیکھے۔ یہ عارف اور کامل لوگوں کی تصدیق ہے۔ اسی کا نام مشاہدہ حقیقی اور معرفت یقینی ہے۔ اس میں غلطی کا امکان تو نہیں ہوتا ہاں علم اور کشف کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے مثلاً گھر کے اندر جا کر بھی اگر دن کی روشنی میں زید کو دیکھا ہے تو اس کا علم زیادہ ہوگا اور رات کے اندھیرے میں دور سے دیکھ کر آگیا ہے تو اس کا علم کم ہوگا۔

قلب کو حاصل ہونے والے علوم کا بیان

یہ تو معلوم ہو چکا کہ قلب ہر وقت ہر قسم کے علوم کو حاصل کرنے کے لیے تیار رہتا

ہے۔ جو علوم قلب کو حاصل ہوتے ہیں وہ عموماً دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک علم نقلی، دوسرا علم عقلی۔ علوم عقلی میں بعض تو وہ ہوتے ہیں جن کے بارے میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کب اور کس طرح عقل میں آ گئے، بس وہ ہمیشہ قلب میں موجود رہتے ہیں، مثلاً اس بات کو ہر ایک جانتا ہے کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں دو مکان کے اندر موجود نہیں رہ سکتا یہ بات کس نے سکھائی، کب سکھائی اس کا کسی کو پتہ نہیں۔ اور بعض علوم عقلی وہ ہوتے ہیں جو سیکھنے سکھانے سے بتانے سے، غور فکر سے حاصل ہوتے ہیں۔

اور علوم نقلی وہ ہیں جو بزرگوں اور عقلمندوں کے بتانے سے حاصل ہوتے ہیں اور قلب اپنے کمال کو اسی علم کے ذریعے پہنچتا ہے۔ قلبی امراض اور نقائص کو بھی یہی علم دور کرتا ہے۔ مثلاً سلامتی بدن کے لیے اور یہ علم طلب وغیرہ میں نقلی علوم بھی ضروری ہیں اور ان علوم کو سمجھنے، ان کو سمجھ کر عمل میں لانے کے لیے علم عقلی کی بھی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقل بدون سننے سنانے کے اور سننا سنانا بغیر عقل کے بیکار ہے۔ اب اگر کوئی سنتا ہے اور عقل سے کام نہیں لیتا بلکہ محض تقلید جامد کرتا ہے، عقل کے دروازے بند رکھتا ہے تو یہ جہالت ہوگی اور کوئی شخص صرف اپنی عقل پر کامل بھروسہ کر لے، پچھلی باتوں سے کان بند کر لے۔ ان سے کوئی سبق اور روشنی نہ حاصل کرے تو یہ بھی غرور اور جہالت ہوگی۔ علوم عقلی اگر غذا کی طرح ہیں تو علوم نقلی دوا ہیں۔ اگر قلب بیمار ہو، جہالت کا مرض لاحق ہو تو غذا اور دوا دونوں اس کے لیے ضروری ہوں گے تاکہ وہ صحت مند بھی رہ سکے اور توانا و تندرست بھی۔ بعض لوگ علوم نقلی یا علم شریعت اور علوم عقلی کو الگ الگ مانتے ہیں، ان دونوں کا جمع ہونا محال سمجھتے ہیں۔ یہ قطعی غلط ہے۔ جن لوگوں کو معاش اور معاد دونوں علوم کی طرف توجہ ہوتی ہے، علوم عقلی اور علوم نقلی دونوں کو جاننے والے ہوتے ہیں ان کو دنیا اور آخرت دونوں نصیب ہیں

صوفیا اور علما ظاہر نیز الہام اور تعلیم و تعلّم کا فرق

بعض علوم وہ ہیں جو ظاہر اور بدیہی نہیں ہیں قلب پر کبھی کبھی وارد ہوتے ہیں، ان

کا دل میں آنا کئی طریقوں سے ہوتا ہے، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بے خبری میں کسی نے دل پر ڈال دیا ہے، اسی کو الہام جاتا ہے، کبھی سمجھ کر دلیلوں سے حاصل کیا جاتا ہے اسی کو استبصار (بصیرت حاصل کرنا) کہتے ہیں، الہام صوفیا اور اولیا کے لیے مخصوص ہے اگر الہام والی صورت میں اُس علم کا ذریعہ معلوم ہو جائے تو وہ وحی ہے جو نبیوں کے لیے مخصوص ہے، اور جو علم کسب و دلائل سے حاصل ہو وہ علما کا حصہ ہے۔ صوفیا عام طور پر الہامی علوم کی طرف مائل رہتے ہیں۔ وہ کتابیں نہیں پڑھتے۔ بحث و مباحثے میں نہیں پڑتے وہ اس کے قائل ہوتے ہیں کہ ریاضت اور مجاہدے سے قلب کو مذموم صفات سے پاک کر لیا جائے، خود کو دینا سے الگ کر لے اور پوری طرح خدا کی طرف لگ جائے۔ جب یہ چیز حاصل ہو گی تب خدا اس کی طرف توجہ فرمائے گا۔ ایسے قلب پر خدا کا سایہ ہوگا۔ اس میں خدا کا نور چمکنے لگے گا۔ سینہ اسرار و رموز کے لیے کھل جائے گا۔ قلب پر سے حجابات دور ہو جائیں گے۔ بندے کا کام صرف یہ ہے کہ نیک ارادے اور سچی نیت کے ساتھ خدا کی تلاش میں خود کو لگا دے اور خدا سے کسی بدلے کا لالچ نہ رکھے، کوشش یہ رہے کہ سوائے خدا کے باقی چیزوں سے دل فارغ رہے، جلوت اور خلوت میں ہر جگہ خدا کا دھیان رہے، دل خدا کی یاد اور اس کے ذکر میں اس قدر محو ہو جائے کہ اگر زبان بند بھی ہو جائے تب بھی دل خدا کا نام لیتا رہے، حتیٰ کہ قلب پر سے اس لفظ اللہ کی صورت اور ہیئت بھی محو ہو جائے اور قلب اس کے معنوں میں ڈوب جائے۔ بس انسان یہی کر سکتا ہے اور زیادہ کوشش کرے گا تو غیر اللہ سے خود کو دور رکھے گا مگر خدا کی رحمت کو کھینچ کر اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا، اس لیے اب خدا سے رحمت کی امید رکھے، اگر اُس نے قلب میں خدا کی رحمت کے لیے صلاحیت اور اہلیت پیدا کر لی ہے اور یہ سارے کام نیک نیتی کے ساتھ انجام دے لیے ہیں تو امید ہے خدا ضرور اُسے نوازے گا کیونکہ وہ بندوں کے خلوص اور محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ پھر اوّل اوّل ممکن ہے کہ ایک بجلی سی کوند جائے اور اس میں قرار اور ٹھہراؤ نہ ہو۔ پھر دوبارہ بھی یہی صورت ہو سکتی

ہے بعض اوقات خدا کی رحمت اور اس کی تجلّی شروع ہو کر بند ہو جاتی ہے اور درمیان میں طویل وقفہ ہو جاتا ہے ان چیزوں سے مایوس نہ ہو۔ یہ ہے صوفیا کی تقریر کا خلاصہ کہ تزکیہ نفس اور قلب کی جلا بندے کا کام ہے اور لیاقت وصلاحیت حاصل کر لینے کے بعد خدا کی رحمت کا امیدوار رہنا چاہیے۔ علمائے ظاہر اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ صوفیا اس طریقے سے مقصد تک پہنچ تو سکتے ہیں مگر یہ راستہ مشکل اور دیر طلب ہے۔ علمائے ظاہر کے نزدیک اس راستے کے آداب وشرائط کا حاصل ہونا ہی ایک مشکل امر ہے کیونکہ دنیا سے اس درجہ بے پرواہ ہونا تقریباً ناممکن ہے اور بالفرض کسی کو حاصل بھی ہو جائے تو ذرا سا وسوسہ پھر اس مقام کو کھو دینے کو کافی ہوگا۔ اس کے علاوہ کی ومجاہدے کی وجہ سے آدمی میں بدمزاجی اور چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بداخلاقی کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ کوئی صوفی اگر پہلے سے علم وحکمت کی حقیقتوں سے مزین نہ ہو اور ان کے ذریعے تہذیب نفس نہ کر چکا ہو تو دل پر صدہا قسم کے فاسد خیالات حملہ کریں گے، نفس اُن میں غرق ہو جائے گا۔ وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اُنھیں سمجھ نہ سکے گا اور ساری عمر اسی چکر میں گرفتار رہے گا۔ بہت سے صوفیا کسی فاسد خیال میں برسوں ٹکریں مارتے رہتے ہیں۔ اگر اُنھیں علمی بصیرت حاصل ہوتی تو اُس خیال کا فساد اور التباس اُن پر واضح ہو جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ راہ ہدایت کے لیے تعلیم کا طریقہ پسندیدہ اور محفوظ ہے اس لیے سب سے پہلے علم کا حاصل کرنا ضروری ہے، پھر علما کے اقوال اور اصولوں سے معانی ومطالب کو صحیح صحیح سمجھے۔ اُس کے بعد یہ مقام آتا ہے کہ اس بات کا انتظار کرے کہ جو باتیں علما نہیں سمجھا سکے وہ مجاہدہ۔ وریاضت سے سمجھ میں آجائیں گی تب مجاہدہ وریاضت مفید ہو سکے گا۔

الہام کے ذریعے یا بے خبری میں دل پر اگر کوئی حقیقت ظاہر ہو جائے تو یہ طریقہ اور ذریعہ غلط نہیں کہا جا سکتا۔ کسی کو یہ درجہ کبھی حاصل نہ ہوا ہو تب بھی اسے یہ بات مان لینی چاہیے۔ کیونکہ معرفت ہر طبیعت اور ہر قلب کا فطری عمل ہے۔ ہر قلب معرفت کی طرف

ضرور چلتا ہے اسی خیال کو صوفیا نے بیان کیا ہے کہ علم یہ نہیں کہ کتابیں یاد کر لی جائیں اور جب وہ ذہن سے نکل جائے تو پھر جاہل رہ جائے' جو بغیر حفظ اور درس کے حاصل ہو۔ اس دلیل سے اور بہت سے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کا انحصار صرف تعلیم و تعلّم ہی پر نہیں ہے بلکہ ایک ذریعہ علم کا مکاشفہ اور مجاہدہ بھی ہے۔

قلب بدلتا بھی رہتا ہے

قلب پر مختلف احوال اور آثار آتے رہتے ہیں' کبھی وہ خیر کی طرف چلتا ہے' کبھی شر کی طرف بڑھتا ہے' کبھی شک میں پڑ جاتا ہے کبھی یقین کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے' اگر قلب بُری عادتوں سے دور ہو چکا ہے تو اُس پر خیر و بھلائی نازل ہوتی ہے' پھر عقل انسانی ان بھلائیوں کی چھان بین کرتی ہے اور جب عقل پر وہ بھلائیاں واضح ہو جاتی ہیں تو وہ قلب کو ترغیب دیتی ہے کہ یہ کام بہتر ہے' اس کو ضرور کرنا چاہیے۔ اس طرح نیک کام کا کرنا انسان کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور اگر قلب بُرائی سے بھرپور ہے اس وقت کوئی بُرا کام کرنے کی خواہش کے آتے ہی دل کھٹکتا ہے اور عقل سے رائے لیتا ہے۔ اگر عقل پہلے ہی سے نفسانی خواہشات سے مغلوب ہے۔ اور وہ قلب کو اسی نفسانی خواہش کے مطابق رائے دیتی ہے تو بُرے کام کے لیے سینہ کُھل جاتا ہے اور تاریکی پھیلنے لگتی ہے یہاں تک کہ یقین و نیکی کا چراغ بجھنے لگتا ہے' ایسے میں کوئی امر حق سُجھائے بھی تو نہیں سوجھتا۔ تیسرا قلب وہ ہے کہ ہوائے نفسانی اس کو شر پر آمادہ کرتے ہیں مگر نیکی کی طاقت اس کو روکتی ہے۔ اس وقت عقل خیر کی قوت کی مدد کرتی ہے اور نفس کو سمجھاتی ہے کہ یہ کام جہالت و نادانی کا ہے۔ انسان عقل کی نصیحت پر عمل کر کے خیر کی طرف آمادہ اور بُرائی کو چھوڑنے پر تیار ہو جاتا ہے مگر نفسانی خواہش پھر حملہ آور ہوتی ہے۔ اور سمجھاتی ہے کہ یہ کیا خشک اور زاہدانہ باتیں ہیں' اپنی خواہش مت روک' دیکھ دنیا کی لذت دوسروں کے ہاتھوں میں ہے تیرے حصے میں محض بدنصیبی آئی ہے' فلاں عالم بھی تو یہ کام کرتا ہے۔ تو بھی کر لے۔ انسان اس کش مکش میں

پھر برائی کی طرف جھک پڑتا ہے۔غرض قلب اس طرح دو طاقتوں کے درمیان رہتا ہے اور جو طاقت غالب آ جاتی ہے اعضا اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

ریاضتِ نفس اور تہذیب اخلاق

دین اسلام کی مکمل تعریف ایک لفظ میں بیان کی گئی ہے "خوش اخلاق ہونا" اور خوش اخلاقی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے "جو تم سے کٹنا چاہے اس سے مل، جو تم کو نہ دے اس کو عطا کرو اور جو تم پر ظلم کرے اس کو معاف کر دو" سب سے زیادہ بڑی بات آدمی کا بد اخلاق ہونا ہے: ہمیشہ ہر جگہ لوگوں کے ساتھ خوش اخلاق رہنا سب سے بڑی نیکی ہے اور سارے اعمال و کردار میں سب سے زیادہ افضل عمدہ اخلاق ہے، ایسا عابد جو سارے دن عبادت کرتا ہو، ہر وقت خدا کو یاد کرتا ہو مگر خدا کی مخلوق اور ہمسائے اُس سے عاجز و پریشان ہوں اُس کے لیے قطعی کوئی بھلائی نہیں ہے۔ایک انسان دوسرے انسان پر مال، جمال، کمال کسی چیز پر فخر نہیں کر سکتا، فخر کی بات اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ اس کے اخلاق عمدہ اور پسندیدہ ہوں۔بد خلقی تو سارے اعمال کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے، بزرگوں کا کہنا تھا کہ خدا نے انسان کو تمام مخلوق میں حسین بنایا ہے تو انسان کو لازم ہے کہ اپنے اخلاق کو بھی حسین بنائے۔ جس انسان کو خدا توفیق دیتا ہے وہ صرف اچھے اخلاق کی بدولت بڑے بڑے عابد و زاہد کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔اسی لیے حضورؐ برابر اپنے لیے یہ دعا مانگا کرتے تھے "اے اللہ مجھ کو اچھے اخلاق کی ہدایت کر، اور بد اخلاق لوگوں سے مجھے بچا، تیرے سوا کون مجھے اُن سے دور رکھے گا۔" بد اخلاقی ایسا سخت گناہ ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح بدظنی ایسی سخت برائی ہے کہ اُس سے دوسری برائیاں جنم لیتی ہیں، لوگ ایسے بدکار اور بدعمل کو ساتھ رکھنا پسند کرتے تھے جس کا اخلاق اچھا ہو اور ایسے عابد سے دور رہتے تھے جو بد اخلاق ہو۔حُسنِ اخلاق ہی ایک ایسی صفت ہے کہ علم و تحمل اور عبادت ہر کمی کو پورا کر دیتی ہے۔انسان کی انسانیت اور ایمان کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ خوش خُلق ہو۔اور تصوف سوائے

عمدہ اخلاق کے اور کچھ نہیں ہے، بدخُلقی ایسی مصیبت ہے کہ اچھے اعمال کو غارت کر دیتی ہے، دنیا میں جس کو کوئی بڑا رتبہ حاصل ہوا ہے وہ اسی حُسنِ اخلاق کی بدولت حاصل ہوا ہے۔

خوش خُلقی اور بدخُلقی کی حقیقت اور اُس کا معیار

اچھے اخلاق کی تعریف یہ ہے کہ ''انسان دوسروں کو تکلیف دینے سے باز رہے' کشادہ رُو ہو اور ضرورت مندوں پر دولت خرچ کرتا ہو' نہ خود کسی سے لڑائی کرے' نہ اُس کے لوگ دشمن ہوں یعنی اُس کے اچھے برتاؤ کی وجہ سے سب اُس سے محبت کرتے ہوں' مفلسی ہو یا مالداری خدا کی مخلوق کو راضی رکھتا ہو' مشکلات میں صبر و برداشت کا عادی ہو' بردبار ہو' کسی سے بدلہ نہ لے۔ ظالم پر بھی رحمت و شفقت کا معاملہ کرے' خدا کے اوپر خدا کے بندوں کے حق میں کمی نہ کرے۔'' اصل یہ ہے کہ جس طرح ظاہری شکل و صورت میں اعتدال کو حُسن کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نفس' روح اور باطن میں اگر اعتدال ہو تو اُسے حسنِ اخلاق کہیں گے' نفس میں اعتدال اور میانہ روی اس قدر راسخ ہو چکی ہو کہ بلا اختیار اُس سے پسندیدہ افعال صادر ہوں' راسخ ہونے کی شرط اس لیے ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص وقتی طور پر کسی ضرورت سے بہت سا مال خرچ کر لے تو یہ اچھے اخلاق کی صفت نہ کہلائے گی۔ راسخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ طبیعت میں اخلاق کا ملکہ پیدا ہو جائے کوئی وقتی یا ہنگامی فعل نہ ہو۔ دوسری بات کہی گئی ہے کہ ''بلا اختیار اس سے پسندیدہ افعال صادر ہوں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بہت غور و فکر اور تامل کے بعد تکلّف کے ساتھ مال خرچ کرتا ہو تو یہ بھی اخلاق کی صفت نہ کہلائے گی۔ یہاں چار چیزوں کا لحاظ رکھنا ہو گا' اول۔ اچھا یا بُرا فعل اسے اخلاق کی صفت نہیں کہہ سکتے' بہت سے آدمی طبعاً بخیل ہوتے ہیں مگر نام و نمود کی خاطر فیاضی سے خرچ کر دیا کرتے ہیں تو ان کا یہ فعل سخاوت میں شمار نہ ہو گا۔ دوم' اچھے یا بُرے افعال کی صلاحیت' محض صلاحیت کا کسی کے اندر ہونا بھی اخلاق کی صفت نہیں ہے کیونکہ اچھی یا بُری صلاحیت طبعی طور پر ہر انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ جب تک ان صلاحیتوں کا

اظہار نہ ہوا خلاق کا مظاہرہ نہ ہوگا۔ سوم' اچھائی کو جان لینا' پہچان لینا' یہ بھی اخلاق نہیں ہے ۔اب ایک چوتھی صورت باقی رہ جاتی ہے۔ یعنی باطن اور نفس میں ایسی ہیت اور ایسے ملکہ کا پایا جانا جو نفس کو باطنی طور پر سخاوت پر مستعد کر دے۔ اخلاق نفس کی اسی ہیت اور باطنی صورت کا نام ہے۔ جس طرح حُسن ظاہری میں تمام اعضا کے ساتھ اس میں اعتدال ضروری ہے۔ اسی اعتدال سے حُسن پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح باطن میں چار قوتوں علم' غضب' خواہش اور عدل کے اندر اعتدال پایا جانا ضروری ہے۔ ان قوتوں میں سے علم کا کام یہ ہے کہ انسان اسی کے ذریعے سچ جھوٹ' اعتقاد کا حق و باطل ہونا اور دوسرے اچھے بُرے معاملات میں تمیز کرتا ہے اور اسی کے نتیجے میں انسان میں حکمت حاصل ہوتی ہے' پھر قوت غضب اور قوت خواہش کی خوبی یہ ہے کہ دونوں حکمت کے ماتحت رہیں یعنی ان کا عمل حکمت کے ماتحت ہو' ادھر قوت عدل کا کام یہ ہے کہ قوت غضب اور خواہشات کو عقل اور طبعیت سلیم کا پابند رکھے۔ جس شخص کے اندر یہ چاروں قوتیں اعتدال پر ہوں گی اُسے خوش اخلاق کہا جائے گا۔ قوت غضب اگر اعتدال پر ہوگی تو اس کا نام شجاعت ہوگا' خواہش کے اعتدال کو عِفت اور پاک دامنی' پاکیزگی اور طہارت کا نام دیں گے۔ اب اگر یہی قوت غضب اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ تہور ہے اور اعتدال سے کم ہو تو بزدلی اور جُبن ہے' اسی طرح قوت خواہشات اعتدال کی حدوں سے بڑھ جائے تو حرص و شرارت اور اعتدال سے کم ہو تو جمود اور طبیعت کا بستہ ہونا ہے اور حکمت کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اس کو غلط مطلب کے لیے استعمال کیا جائے تو مکر و فریب ہے اور حکمت میں کمی ہو جائے تو یہی بے وقوفی اور ناسمجھی ہے۔

محنت و ریاضت سے اخلاق کی تبدیلی

بعض لوگ نفس کی بُرائیوں کو جانتے ہوئے بھی یہ کہتے ہیں کہ ریاضت اور محنت کے ذریعے اخلاق کا سدھار ممکن نہیں ہے' ایسے لوگ وہی ہیں جو اس راستے پر نہیں لگنا چاہتے

ان کا کہنا ہے کہ طبیعت بدلا نہیں کرتی، جس طرح ظاہری نقائص، درازی قد، بونا پن، بدصورتی وغیرہ کی تبدیلی ناممکن ہے، اسی طرح باطنی بُرائیوں کو بھی بدلا نہیں جا سکتا۔ لاکھ ریاضت کیجیے نتیجہ کچھ نہ ہوگا۔ ایسے اشخاص کو شاید معلوم نہیں کہ ریاضت اور مسلسل جدوجہد سے انسان تو کیا جانور تک بدل جاتے ہیں۔ جنگلی جانوروں پر محنت کر کے اُنھیں مہذّب اور مودّب بنایا جاتا ہے اور اُنھیں سکھایا جاتا ہے۔ اور وہ سیکھ جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی نہیں تو کیا ہے۔ دراصل بعض چیزیں تو وہ ہیں جو فطرتاً مکمل ہوتی ہیں یعنی ان میں ہر ضروری چیز موجود ہے۔ آدمی کے اختیار اور کوشش کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا اور بعض چیزوں میں تبدیلی کی استعداد اور لیاقت موجود ہوتی ہے، ذرا سی محنت سے ان میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے، اس کے لیے کچھ قاعدہ ہوتا ہے، جیسے آم کی گٹھلی، نہ خود پھل ہے نہ درخت ہے مگر اس میں لیاقت ہے کہ ذرا سی محنت سے درخت بن سکتی ہے۔ اس میں درخت بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ مگر اُسے پھل کی صورت میں بدلنا چاہیں تو یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ صلاحیت رکھی ہی نہیں گئی ہے۔ تو ایک بے جان چیز جب تبدیل ہو سکتی ہے تو غضب اور خواہش کا محنت سے بدل جانا کیوں ممکن نہیں ہے۔ ہاں ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا نہ ہمارے لیے ممکن ہے نہ ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ حسنِ اخلاق سے ہمیں یہ کام نہیں لینا ہے کہ یہ طاقتیں سرے سے ختم ہو جائیں کیونکہ غضب اور خواہشات لاکھ بُری سہی، ہمیں ان کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ خواہش ہی کر لیجیے۔ اگر یہ بالکل نہ ہو تو کھانا، پینا، سفر، آرام، تفریح، سب کی خواہش ختم ہو جائے گی اور زندگی عذاب بن جائے گی۔ یا غضب کو لیجیے۔ اگر غضب بالکل نہ ہو تو آدمی اپنے دشمن کو دشمن کیسے سمجھے گا اور اس کا دفاع کیسے کرے گا۔ اس لیے ان کو قطعی ختم کرنا مقصود نہیں ہے، صرف اعتدال پر رکھنا ہے، اور تربیت و محنت سے یہ بات بالکل ممکن ہے اور یہ ممکن ہے کہ مسلسل جدوجہد سے اور ریاضت سے ان قوتوں کو عقل کے تابع کر دیا جائے تا کہ اِن سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو نقصان کا باعث ہو۔

وہ اسباب جن سے اچھے اخلاق حاصل ہو سکیں

جب اخلاق چند قوتوں کے اعتدال کا نام ہے تو اب یہ اعتدال کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک فطری کہ انسان پیدا ہی عقل کامل لے کر ہو اُس کی قوت غضب اور خواہشات کا اُس پر غلبہ نہ ہو بلکہ یہ دونوں عقل کے تابع رہیں۔ ایسے شخص کو بہت زیادہ تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی، دوسرا طریقہ وہی ہے کہ محنت اور مشق سے یہ بات حاصل کی جائے مثلاً کوئی سخاوت کا کمال پیدا کرنا چاہتا ہے تو شروع میں اُسے تکلفاً ہی چاہیے کہ سخاوت والوں کی طرح مال خرچ کرے، اپنے نفس پر زور دے کر یہ کام کرتا رہے اور برابر کرتا رہے، کچھ دنوں بعد عادت پڑ جائے گی اور اس کی طبیعت میں سخاوت رچ بس جائے گی، ایسے ہی تواضع اور دوسری خوبیاں ہیں۔ جب عادت پڑ جائے اور اچھے کام میں لذت ملنے لگے تب بھی برابر اس کام کو کرتا رہے۔ یہاں تک کہ اُسے اس کام میں لذت بھی حاصل ہو، یہ نہ ہو کہ خرچ کرنے کے بعد افسوس ہو۔ تو جب تک نفس بری باتوں کو ترک کر کے اچھی باتوں کو ہاتھ ہی نہ لگائے کیونکہ نہ کرنے کے مقابلے میں کرنا زیادہ بہتر ہے خواہ وہ تکلفاً ہی ہو۔ یہ بات طے ہے کہ عادت سے کچھ دنوں بعد لذت ملنے لگتی ہے اگر چہ کسی باطل کام کی عادت ہو اور اس میں کتنی ہی مصیبت ہو۔ کبوتر بازی، پتنگ بازی، جوا، قماران میں کس قدر مشکل ہوتی ہے۔ مال کس قدر ضایع ہونے کا خطرہ رہتا ہے جرم کی سزا کا الگ خوف ہوتا ہے مگر عادت تمام مصیبتوں کو لذت سے بدل دیتی ہے، تو جب برائی پر عادت سے نفس کو مزا ملنے لگتا ہے تو اچھائی کو تو نفس جلدی قبول کرے گا کیوں کہ برائی کی طرف نفس کی رغبت غیر فطری امر ہے اور نیکی کی طرف فطری اور طبعی بات ہے۔ اب معلوم ہوا کہ اخلاق محمودہ ریاضت اور محنت سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ شروع میں نہ چاہتے ہوئے انھیں اپنایا جائے اور بعد میں وہ فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں۔

تہذیب اخلاق کا مفصّل طریقہ کیا ہے

صحت مند نفس کی علامت یہ ہے کہ اس میں اخلاق کی خوبی پائی جائے اور تمام باطنی قوتوں میں اعتدال ہو۔ اور برے نفس کا علاج یہ ہے کہ اُس سے رذائل اور خطاؤں کو دور رکھا جائے جیسے اچھے بدن کے لیے ضروری ہے کہ بیماری سے دور رہے۔ جس طرح اصل مزاج اکثر و بیشتر اعتدال پر ہوتا ہے' اسی طرح اصل فطرت انسانی عام طور پر صحیح اور معتدل ہوتی ہے۔ جس طرح بدن شروع میں غیر مکمل ہوتا ہے مگر بڑھنے اور کمال حاصل کرنے کی صلاحیت اس میں ہوتی ہے تربیت اور غذا سے مکمل ہوتا ہے' ایسے ہی نفس میں کمال حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے' تزکیہ اور تہذیب اور علم کی غذا سے وہ مکمل ہو جاتا ہے۔ انسان کا بدن اگر صحت مند ہوتا ہے تو وہ اس کی صحت کی حفاظت کرتا ہے اور اگر بیمار ہوتا ہے تو اس کی صحت کی تدبیریں کرتا ہے۔ ایسے ہی انسان کا نفس اگر بیمار ہو تو اس کی صحت کی طرف فکر کرنی چاہیے اور اگر صحت مند ہو تو اُسے نیکیوں سے قوت پہنچا کر باقی رکھنا چاہیے' جس طرح بدن کے امراض کا علاج عموماً مرض کی ضد سے ہوتا ہے' برودت ہے تو حرارت سے علاج ہوتا ہے' خشک مرض لاحق ہے تو تر دواؤں سے۔ ایسے ہی قلب کی بیماریوں کا علاج اس کی ضد سے ہونا چاہیے۔ جہل کا علاج علم سے کرے' بخیلی کا علاج سخاوت سے کرے' غرور کا علاج تواضع اور انکساری سے کرے اور جس طرح بدن کے مرض میں پرہیز اور دوا کی سختی برداشت کرنی پڑتی ہے اسی طرح قلب کے علاج میں مجاہدے کی سختی برداشت کرنی چاہیے۔ اور علاج پر صبر کرنا چاہیے اور جس طرح طبیب ظاہری مریض کو دوا دیتے وقت اس کی تمام باتوں کا لحاظ رکھتا ہے اسی طرح مرشد اور استاد قلبی امراض میں مرید کے تمام احوال کو سامنے رکھتا ہے' جس طرح جسم کے مرض میں خود اپنی تجویز کردہ دواؤں کا نتیجہ خطرناک ہو سکتا ہے' مجاہدہ نفس میں سے بڑا معرکہ عزم و ارادے کا پورا کرنا ہے اگر نیک باتوں کا عزم و ارادہ کیا ہے اور عہد شکنی ہو جائے تو چاہیے کہ اس کی سزا خود ہی تجویز کر کے نفس کو راستے پر لگائے ورنہ

نفس اس پر غالب ہو جائے گا پھر ساری ریاضت اور محنت برباد ہو جائے گی۔

قلب کی بیماریاں

بدن کے اعضا اگر اپنا کام انجام نہ دیں یا خرابی کے ساتھ پورا کریں تو انھیں صحت مند نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے ہی اگر قلب اپنا اصلی کام انجام نہ دے تو یہ قلب کا مرض ہوگا۔ قلب کا کام نیک باتوں کا حکم کرنا اور خدا کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اب اگر وہ اِن امور خیر سے ہٹ کر برائیوں کی طرف رغبت کر رہا ہے تو یقیناً مریض ہے۔ جیسے معدہ اگر روٹی پانی کو چھوڑ کر مٹی کی رغبت کرے تو آپ اسے کیا کہیں گے، بعض امراض بدن کو لگ جاتے ہیں اور اسے پتہ تک نہیں چلتا۔ ایسے ہی قلب کو مرض لاحق ہو جاتا ہے اور انسان اس طرف سے غافل رہتا ہے۔ اگر بالفرض اسے معلوم بھی ہو جائے تو اس کے علاج میں جس قدر صبر و تحمل کی ضرورت ہے وہ اس کے بس سے باہر ہوتا ہے اور اگر صبر و تحمل کا ارادہ بھی کرلے تو امراض قلب کے طبیب نہیں ملتے کیونکہ طبیب تو علماء تھے اور علماء خود امراض قلب میں مبتلا ہو گئے اس لیے امراض قلوب لا علاج ہو گئے لوگ برائیوں کی طرف جھک پڑے اور ایسے اعمال کرنے لگے جو بظاہر تو عبادت ہے مگر اصل میں ریا کاری اور بد عادت ہے۔

علاجِ قلب

قلب کو اگر بخل لاحق ہو گیا ہے تو اس کا علاج سخاوت سے کرے مگر اعتدال کا دامن یہاں بھی نہ چھوڑے ورنہ یہی سخاوت فضول خرچی بن سکتی ہے اور یہ دوسرا مرض لگ گیا۔ یہ کیفیت ہو جائے کہ انسان مال کو جمع کرے تو اس خیال سے کہ دوسرے بھائیوں پر خرچ کرے گا، مستحق اور غریب لوگوں کی مدد کرے گا۔ اور خرچ کرے تو نمائش کے لیے نہ ہو بلکہ ضرورت کے لیے ہو۔ دوسروں کی مدد کے خیال سے ہو۔

انسان اپنے عیب کس طرح پہچانے

جب کسی شخص کو اپنی بھلائی منظور ہوتی ہے تو وہ اپنے عیوب کو خود تلاش کرنے لگتا ہے، اپنا خود نکتہ چیں بن جاتا ہے اور پھر وہ اس کے علاج میں لگ جاتا ہے مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنے عیوب کو تلاش کریں اور دوسروں کے عیوب سے آنکھ بند کر لیں۔ جو شخص خود کو ایسے مرشد کے حوالے کر دے جو اس کے نفس کے عیوب پر واقف بھی ہو اور اس کو مطلع بھی کر دے، پھر جو کچھ وہ مرشد بتلائے اُس پر عمل کرنا چاہیے یا پھر دوستوں میں کوئی سنجیدہ ،مخلص دوست ہو اس سے کہہ دے کہ مجھے میرے عیوب پر مطلع کر دے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دشمنوں سے اپنا عیب معلوم کرے۔ دشمن اس سلسلے میں بڑے معاون ہوتے ہیں وہ ہمارے عیوب ہی ڈھونڈ ھتے ہیں اس لیے دوستوں سے زیادہ دشمنوں سے نفع پہنچتا ہے۔ اہل بصیرت اور سمجھ دار لوگ دشمنوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں میں جو برائی دیکھے اور خود کو بری لگے اس کو اپنے اندر سے دور کر دے۔ یہ سوچے کہ جب فلاں کی یہ بات مجھے بری لگی ہے تو یقیناً اگر یہ بات مجھ میں ہوگی تو دوسروں کو بری لگے گی، یہ سوچ کر وہ یقیناً اس برائی سے بچے گا۔ یہ سب سے عمدہ طریقہ ہے، اگر اس کی عادت پڑ جائے تو پھر کسی مرشد اور معلم کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔ یہ طے ہے کہ امراض قلب کا مکمل علاج نفسانی خواہشات کو ترک کرنے میں ہے۔ نفس کے ساتھ ریاضت کی تلوار سے لڑنا چاہیے اور ریاضت چار قسم کی ہوتی ہے۔ تھوڑا کھانا، تھوڑا سونا، ضرورت پر بولنا، لوگوں کی تکلیف کو برداشت کرنا۔ ارباب قلوب نے امتحان لیا تو ان کو نظر آ گیا کہ جب جب دل کو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ سرکش اور باغی ہو جاتا ہے اور جب اس کو غم و مصائب سے دو چار ہونا پڑا وہ صاف اور نرم ہوا ہے۔

حسن اخلاق کی علامات کیا کیا ہیں

آدمی جب نیکی کے راستے پر گامزن ہوتا ہے تو ہر لمحہ اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ اس کے اندر تکبر اور بڑائی نہ پیدا ہو جائے اور وہ سمجھنے لگے کہ اب تو میں نیک ہو گیا ہوں، اب مجھے مجاہدے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لیے نیک اور با اخلاق لوگوں کی کچھ علامتیں ذکر کی گئی ہیں کہ ایسے لوگ اپنی خواہشات پر پوری طرح قابو رکھتے ہیں، امانت کی حفاظت کرتے ہیں، جو عہد کرتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں اپنی عبادت میں دل لگاتے ہیں، لوگوں سے نرمی کا معاملہ کرتے ہیں۔ ایک اچھے مسلمان کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہ اپنے دوسرے بھائی کے لیے بھی پسند کرے، اپنے مہمان کی عزت کرے، اچھی بات کرے یا خاموش رہے، اس کا اخلاق بہت اچھا ہو، مصیبت میں دوسروں کے کام آئے، کم آزار اور کم سخن ہو، فضول باتوں سے بچتا ہو۔ کام اور عمل کا دھنی ہو، سچ بولنے والا ہو، نیک، باوقار حلیم دوستوں کا اچھا دوست، ہشاش بشاش، شفیق ہو، بدگفتار، بدکردار، گالی بکنے والا نہ ہو، چغل خور نہ ہو، جلد باز نہ ہو، کینہ نہ رکھتا ہو، حسد سے خود کو پاک رکھتا ہو، با اخلاق لوگوں کا امتحان اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ کہاں تک ایذا اور مشکلات پر صبر کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی مشکلات پر یا دوسرے کی بد اخلاقی پر شکایت کرتا ہے اس کا مطلب یہ کہ اس میں صبر و اخلاق نہیں ہے۔ ایک بار ایک بزرگ کو کسی نے کھانے پر بلایا جب وہ بلانے والے کے گھر پہنچے تو اس نے معذرت کر دی کہ معاف کیجئے میرے گھر پر کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ بزرگ یہ سن کر واپس لوٹے۔ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ اس شخص نے پھر آواز دی کہ آیئے جو کچھ حاضر ہو کھا لیجئے۔ وہ پھر واپس گئے۔ اس بار پھر اس نے منع کر دیا کہ حضرت معاف کیجئے، وہ پھر واپس گئے۔ آپ پھر لوٹ آئے اس بار وہ پیروں پر گر پڑا اور معافی مانگنے لگا کہ میں نے تو امتحان لیا تھا۔ بزرگ نے کہا کہ بھائی اس میں معافی کی کیا بات ہے، میرا معاملہ تو کتے جیسا ہے بلاؤ چلا آتا ہوں، دھتکار دو چلا جاتا ہوں۔ انہیں بزرگ کا قصہ

ہےایک بار راستے میں جا رہے تھے کہ کسی نے اوپر سے راکھ پھینکی۔آپ نے وہ راکھ جھاڑ دی اور چلنے لگے،لوگوں نے کہا جناب آپ نے اس شخص کو کچھ کہا نہیں۔انہوں نے جواب دیا۔واہ جناب میں تو آگ کا مستحق تھا اس نے تو راکھ ہی پھینکی ہے۔دس باتیں ایسی ہیں جن کو حسن اخلاق کا معیار قرار دیا گیا ہے۔انصاف انتقام نہ لینا،گناہوں کو برا جاننا،مشکلات کو برداشت کرنا،نفس کو ملامت کرتے رہنا دوسروں کے عیب سے آنکھ بند کر کے اپنے عیوب پر نظر رکھنا،چھوٹے بڑے سے کشادہ پیشانی سے ملنا،اعلیٰ اور ادنیٰ کے ساتھ نرمی سے بولنا۔

اولاد کی تربیت اور حسن اخلاق کی تعلیم

اولاد ماں باپ کی امانت ہوتی ہے۔ان کی حفاظت اسی طرح ضروری ہوتی ہے۔جس طرح مال و اسباب کی حفاظت ضروری ہے،کم عمری میں بچے کا قلب ہر نقش و صورت سے خالی موم جیسا ایک نفیس جوہر ہوتا ہے،جس رخ پر چاہیں اسے موڑ سکتے ہیں، ایسے وقت میں اخلاق کی تعلیم اس پر پوری طرح اثر انداز ہوگی اس لیے بچے کو ادب سکھائے ،حسن اخلاق اور پاکیزہ سیرت کا مالک بنا دے، بری صحبت سے بچائے، زیب و زینت، لذت و آرام طلبی کی عادت سے اسے بچائے، ہر بچے میں اخلاق فاضلہ کی صلاحیت ہوتی ہے اس لے اسے اجاگر کرنے اور چکانے کی پوری کوشش کرے تا کہ یہ صلاحیت بے کار نہ ہو جائے ،اس کو محنت و جفاکشی کا عادی بنائے ،دوسروں کو کھانا کھلانے کی فضیلت ،دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور دوسرے کی عزت کی اہمیت بتائے قصے کہانیوں کے ذریعے ایسے بزرگوں کا حال سنائے جس سے بھوکوں کو کھانا کھلانے کی اور مظلوموں کے ساتھ مدد کرنے کی فضیلت واضح ہوتی ہو۔لڑکا کوئی اچھا کام کرے تو اس کو انعام دے اس کی حوصلہ افزائی کرے،بعض مرتبہ غلط کاموں اور خطاؤں پر چشم پوشی کرے،خصوصاً جب بچہ ڈرتا ہو چھپ رہا ہو تب اس کو نظر انداز کر دے اور معاف کر دے اور اس کی غلطی کو عام نہ کرے ورنہ اس میں جراءت پیدا ہوگی اس لیے بڑی بات کی برائی اُس پر واضح کرے اور سمجھا بجھا کر تعلیم

دے۔ پڑھنے کے لیے اچھی اخلاقی کتابیں دے بُری کتابوں سے بچائے۔ باپ کو چاہیے کہ اپنے بچوں کے ساتھ وقار ولحاظ سے بات کرے۔ کبھی معمولی سی تنبیہہ بھی کرتا رہے، ساتھ ہی شفقت ومرّوت کا برتاؤ بھی کرتا رہے۔ طرزِ معاشرت میں سادگی اور سختی کا لحاظ رکھے، آرام طلب نہ بنائے۔ دن میں تفریح کا موقع دے، کھیل کود کی اجازت دے، اپنے ساتھیوں کی مدد پر اکساتا رہے، کسی سے کچھ مانگنے نہ دے، گندگی سے بچائے، کثرت کلام سے روکے مگر ایسا نہ جھڑکے کہ اس کا دل ٹوٹ جائے آئندہ مجمع میں بولنے کی جراءت ہی نہ رہے، قسم کھانے کی، جھوٹ، غیبت، چغلی وغیرہ کی برائی اس کے دل میں بٹھادے۔ بچہ کوئی بات کہے تو غور سے سنے اور اس کو جواب پورا پورا دے۔ لغو، فحش، گالی، گفتار سے بچوں کو روکے بری صحبت سے ہمیشہ بچائے۔ استاد مارے تو اس کے سامنے استاد کو برا نہ کہے۔ بچے کو کہے کہ بیٹا صبر کرو، استاد تمہارے فائدے کے لیے مارتے ہیں۔ اسکول سے آنے پر کھیل کود کا موقع دے۔ تعلیم پر ہمیشہ سختی گیری کرتے رہنے سے بچے کا دل مرجاتا ہے، طبیعت کی تیزی ختم ہوجاتی ہے اور تعلیم سے ڈرنے لگتا ہے۔ اپنا ہو یا بیگانہ، ہر قوم، ہر مذہب کے بڑوں کی عزت کرنا سکھائے، اسے بتائے کہ زندگی کا مقصد کھانا پینا اور عیش وعشرت ہی نہیں ہے، کھانے سے مقصد نیک کاموں کے لیے طاقت حاصل کرنا ہے۔ تاکہ دنیا میں پاکیزہ زندگی گزار سکے۔ یہ دنیا چند دن کا ہنگامہ ہے اس لیے نیکی اور شرافت کے ساتھ اسے گزارنا چاہیے اور خدا سے جی لگانا چاہئے۔

راہِ حق میں چلنے کی شرائط

اس راستے میں چلنے کے لیے جو شرائط ہیں ان میں چار چیزوں کا حجاب پہلے دل سے دور کرنا ہوگا۔ مال، عزت، تقلید اور نافرمانی کا حجاب۔ مال کا حجاب اس طرح دور کرے کہ اگر مال کی بہت زیادہ محبت ہے تو ضرورت کے مطابق رکھ کر غریبوں میں بانٹ دے۔ عزت کا حجاب یوں دور کرے کہ جہاں احترام ہوتا ہو وہاں سے دور رہے۔ تواضع اور

انکساری اختیار کرے اور ایسی زندگی گزارے کہ لوگ اس کی طرف مائل ہی نہ ہوں۔ بالکل تنہا اور گوشہ گیر رہے۔ خدا کی مخلوق کی خدمت کے لیے ان کے درمیان رہنا ضروری ہے مگر یہ اس وقت ہے جب اپنی اصلاح ہو جائے۔ دل میں برائی اور تکبر کا خطرہ نہ رہ جائے۔ تقلید کا حجاب یوں دور کرے کہ مذہب میں تعصب سے کام نہ لے۔ دل میں وسعت پیدا کرے تقلیدی قسم کی باتوں سے حتیٰ الامکان بچے اور نافرمانی کے حجاب سے بچنے کے لیے خدا سے ڈرتا رہے۔ اس سے توبہ کرتا رہے۔ مضبوط عہد کرے کہ اب گناہوں سے بچے گا۔ اور عہد پر مضبوطی سے قایم رہے۔ اس راہ میں چلنے سے قبل علوم ظاہری سے خود کو مزین کرلے ورنہ قدم قدم پر نفس دھوکا دے گا۔ اس کے علاوہ کسی مرشد کا ہاتھ تھامے اور اس کے علم و تجربے پر اعتماد کرے، اپنی عقل کو رہبر نہ بنائے۔ جب تک اس مرشد کے ساتھ رہے اس کی ہر بات مانے جو لوگ صرف اپنی عقل کو رہبر بنالیتے ہیں وہ سخت دھوکا کھاتے ہیں۔ ادھر مرشد کو چاہیے کہ وہ طالب کو اس کے حال کے مطابق ایک پناہ گاہ میں رکھے جس کی چار خصوصیات ہیں۔ خلوت، سکوت، بیداری، اور بھوک، بھوک سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے، اس کی سرکشی دور ہوگی، بیداری سے قلب کو جلا اور صفائی پیدا ہوگی۔ بھوک سے حاصل شدہ نور پر بیداری کے نور سے اضافہ ہوگا۔ دل آئینہ ہو جائے گا اور انوارِ الٰہی کی چمک بڑھے گی، سکوت سے لایعنی اور مہمل باتوں سے بچے گا۔ دل بہکنے سے بچا رہے گا، عقل کو قوت ملے گی، خلوت کی وجہ سے اعضا بری باتوں سے بچیں گے، طبیعت بھٹکنے سے باز رہے گی، یہ مشق کرلے تو راہِ سلوک میں قدم رکھے۔ قلب کو مستعد رکھے۔ وسواس اور خطرات کو دل سے دور رکھے۔ اگر غلط اور فاسد خیالات ہجوم کرلیں تو فوراً مرشد سے بیان کردے۔ مرشد اسے سمجھا کر نرمی سے اس کو بھنور سے نکالے گا۔ مرشد کو چاہیے ایسے وقت میں سختی نہ کرے یہ بڑا نازک مقام ہوتا ہے، اگر طالب مطمئن نہ ہوا اور فاسد خیالات اس کے دل میں جم گئے تو تباہ ہو جائے گا۔

جب کوئی شخص راہِ سلوک طے کرتا ہے تو اسے سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی

ہے کہ اس کو عجب، ریا کاری، خود بینی اور خود فریبی وغیرہ کا احساس ہونے لگتا ہے، وہ اپنے انکشاف حال پر خوش ہوتا ہے۔ کرامات ظاہر کرنا چاہتا ہے اور اس سے لذت حاصل ہوتی ہے، اس لیے اسے چاہیے کہ وہ اپنے نفس کی طرف کوئی توجہ نہ کرے اور اصلاح حال میں لگا رہے گا۔ گوشہ نشینی کو سب سے بڑا سرمایہ سمجھے، جو کچھ عجائبات و لطائف قلب پر وارد و نازل ہوں ان کو لوگوں سے بیان نہ کرے۔ اگر بیان کرے گا تو لوگ غور سے اور حیرت سے سنیں گے تو اس کے نفس کو اور بھی لذت ملے گی۔ اور یہ اپنے اس بیان کو بھی لفظوں اور جملوں سے آراستہ کرے گا اور اپنے اس بیان کے لیے طرح طرح کے اشعار، قرآن و حدیث سب کا استعمال کرے گا۔ بظاہر اس کا خیال اور دعویٰ ہے کہ میں لوگوں میں نیکی کو عام کرنے کے لیے یہ باتیں بیان کر رہا ہوں۔ حالانکہ وہ اپنی عزت و شہرت کی طلب میں ایسا کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی دوسرا ایسا ہی اس کا رقیب میدان میں آتا ہے، اس وقت اسے خوش ہونا چاہیے کہ اس مشکل و دشوار کام میں کوئی اس کا مددگار تو مل گیا۔ مگر ایسا نہیں ہوگا وہ اپنے اقتدار میں اور لوگوں میں اپنی عزت میں کسی کو شریک پا کر سخت برہم ہوگا کہ اس نے تو لوگوں کو مجھ سے توڑنا شروع کر دیا۔ اگر اسے یہ منظور ہے کہ لوگ اس کے وعظ سے فائدہ اٹھائیں تو دوسروں کے وعظ و نصیحت سے اس کو برا نہیں ماننا چاہیے۔ اسے خوش ہونا چاہیے کہ اس کے مقصد میں اور مدد مل گئی، اب تک جو کام وہ تنہا کر رہا تھا اب اس میں ایک شریک کار مل گیا۔

بھوک کی فضیلت

کثرت طعام سے دل مردہ ہونے لگتا ہے، جس طرح زیادہ پانی سے درخت جلنے لگتے ہیں اسی لیے کہا گیا ہے کہ زیادہ کھا کر قلب کو مردہ مت کرو، تمام رات کی عبادت سے یہ بہتر ہے کہ انسان رات کو ایک لقمہ ہی کم کھائے۔ ہر برائی کا سرچشمہ شکم سیر ہونا ہے اور ہر نیکی کی بنیاد بھوکا رہنا ہے۔ بھوک سے قلب کی صفائی، طبیعت میں تیزی اور بصیرت

کامل ہوتی ہے، جب کہ زیادہ کھانے کے بعد دل و دماغ بوجھل ہو جاتے ہیں۔ حفظ میں فرق آ جاتا ہے، ذہن کند ہو جاتا ہے، بھوک ہی سے قلب کو نرمی میسر آتی ہے، انکسار تواضع اپنے دوسرے بھائیوں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بغاوت سرکشی اور برائی کا جذبہ بھوک سے مرنے لگتا ہے۔ جب ایک شخص بھوکا نہ رہے گا تو بھوکے لوگوں کے دلوں کا حال کیا جانے گا۔ اور جب ان کا صحیح حال نہ جان سکے گا تو دوسروں کے لیے تکلیف اور مہربانی کہاں سے پیدا ہوگی۔ بھوکا زیادہ بولنا نہیں چاہتا اس لیے گفتگو کے فتنوں سے محفوظ رہتا ہے، اعضا سست رہتے ہیں اس لیے ضروری افعال کے سوا زیادہ اور برے افعال کو اس کا جی نہیں چاہتا، دل و دماغ تھکے تھکے اور سست رہتے ہیں اس لیے غلط خیالات سے دور رہتا ہے، بھوک میں نیند بھی کم آتی ہے اور پھر بیداری کے فائدے اٹھاتا ہے کیوں کہ کثرت نیند سے عمر بھی کم ہوتی ہے اور نیک کاموں کی توفیق بھی کم ہو جاتی ہے، پھر حیوانوں سے ممتاز اور بلند رہے گا۔ کیونکہ کھانا اور کھاتے چلے جانا یہ تو چوپائے کا کام ہے، تو انسان ایسے کام کرلے جس کی وجہ سے چوپائے سے ممتاز رہے وہ بھوک ہے، بھوک سے بدن تندرست رہے گا۔ بیماریوں کا ہجوم نہیں ہوگا، عقلمندوں نے ہمیشہ تندرستی کی حفاظت کی اور دنیا میں مفید کام کیے ہیں۔ بیماری کے آنے سے قبل بھوک سے اسے دور رکھو۔ بھوک زیادہ ہوگی تو ناشکری نہ ہوگی۔ دستر خوان پر جو کچھ ہوگا اسی میں مزا آئے گا۔ اور خدا کا شکر ادا ہوگا۔ ساری غذا بھی اچھی لگے گی۔ اس لیے خوب بھوک میں دستر خوان پر بیٹھے اور بھوک چھوڑ کر دستر خوان سے اٹھ جائے۔ کم کھا کر جو غذا بچے اس سے غریبوں کی، اپنے دوسروں بھائیوں کی مدد کرے۔ اس سے دل خوش ہوگا۔ غذا کم کرنے کے لیے بتدریج مقدار کو کم کرے تاکہ عادت پڑتی رہے اور غذا کی سادگی کا بھی خیال رکھے۔ حکما نے سب سے اچھی غذا گیہوں کو قرار دیا ہے مگر اس کا چھان لینا اور چھان کر روٹی پکانا آسایش میں داخل ہے اس لیے بے چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائے۔ اس سلسلے میں اصولی بات یہ یاد رکھے کہ جس چیز کی خواہش ہو اسے

نہ کھائے، اس میں ایک فائدہ خواہش کا مارنا ہے۔ دوسرے بے خواہش کی چیزوں کو نفس کم قبول کرتا ہے۔ پرانے بزرگ اور صوفیا برسوں معمولی سی خواہش کو مار کر نفس کا علاج کرتے تھے حتیٰ کہ نمک ایسی چیز سے بھی خود کو روکتے تھے۔ اگر کوئی چیز کھانی چاہی اور نفس کا تقاضا شامل ہو گیا تو فوراً وہ ساری چیزیں غریبوں اور مسکینوں کو بانٹ دیا کرتے تھے، آدمی کا پیٹ ہی سب سے بڑی دنیا ہے جس قدر کوئی اس سے بچے گا اسے زہد حاصل ہو گا اور جس قدر اسے ڈھیل دے گا دنیا اس پر قبضہ کرتی جائے گی۔ یہ بات طے ہے کہ تمام اخلاق اور نیکیوں میں اعتدال و میانہ روی اور اوسط طریقہ پسندیدہ ہے۔ نہ افراط ہونہ کمی۔ مثلاً قلب غذا اتنی نہ ہو کہ پسلیاں نکل آئیں۔ انتڑیاں سوکھ جائیں نہ اتنا کھالے کہ سانس لینا دشوار ہو جائے۔

نہ چندں بخور کز دہانت برآید

نہ چنداں کہ از ضعف جانت برآید

اعتدال اور اوسط کی مثال یہ ہے کہ گول اور گرم لوہے کا ایک کڑا زمین پر ڈال دیا جائے۔ درمیان میں ایک چیونٹی چھوڑ دی جائے، چیونٹی اس گرم حلقے سے بچنا چاہے گی جس طرف سے کڑے کے قریب ہو گی گرمی اور تپش سے حیران و پریشان ہو گی یہاں تک کہ اس حلقے کے بیچ میں پہنچ کر اسے سکون ملے گا، اسی طرح شہوات انسان کو ہر طرف سے گھیرے رہتی ہیں جس طرف وہ گرے گا مرے گا، اس لیے درمیانی راہ کو اپنا لے، گھوڑے، ہاتھی اور جنگلی جانوروں کی طرح نفس کو بھی بھوکا رکھ کر مطیع و فرمانبردار بنایا جا سکتا ہے۔ جنگلی درندوں کو پیٹ بھر کر کھلا دیا جائے تو وہ سرکش ہو جاتے ہیں، یہی نفس کا حال ہے، اگر مرشد خود اپنے نفس کو تکلیف میں نہ ڈالے اور مرید کو اس قسم کا حکم دے تو اس سے بدظن نہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ پہلے سے اپنے نفس کو مار چکا ہے۔ اب اسے تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ دو شخص ایسے ہیں جو بھوکے نہیں رہتے، برابر کھاتے ہیں۔ ایک عارف کامل، دوسرا احمق جو خود کو عارف کی

جگہ سمجھ لے اور اس کا نفس دھوکے میں گرفتار ہو۔ ایسا شخص اس بیمار کی طرح ہے جو تندرست کو دیکھ کر کہ وہ ہر قسم کی غذا کھا رہا ہے خود بھی کھانے لگے، اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

ریاکاری کا فتنہ

جو شخص اپنی خواہشات سے کنارہ کر چکا ہے اُسے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر نفس کسی کام کو ترک کرنے پر تیار نہ ہو مگر دنیا کو دکھانے کے لیے لوگوں کے سامنے اس کو چھوڑ دے تو یہ سخت برا فعل ہے یہاں وہ صرف عام انسانوں کو دھوکا نہیں دے رہا ہے بلکہ خود کو اور اپنے ضمیر کو بھی دھوکا دے رہا ہے۔ بہتر ہے کہ نفس کی برائی کو جراءت کے ساتھ ظاہر کر دے۔ اسی کا نام صدق حال ہے۔ زاہد کا سب سے بڑا کمال زہد کا چھپانا ہے۔ یوں ہونا چاہیے کہ مجمع میں کوئی کچھ دے تو لے لے۔ پھر چپکے سے مالک کو واپس کر دے۔ اس میں دوبارہ صبر اور جبر کرنا پڑا۔ ایک مجمع میں لینا دوسرے اپنی ضرورت سے قطع نظر کر کے مالک کو واپس کرنا۔ جب تک یہ مقام نہ حاصل ہو خود کو ناقص سمجھے، دوم، خواہشات پر قابو رکھے، ریاء کاری کو تو چھوڑ سکتا ہے مگر اپنی بڑائی اور تقدس پر داغ لگنے کا خطرہ ہے مثلاً مجمع میں کھانے بیٹھے، اس پر قادر ہے کہ نہ کھائے یا تھوڑا سا کھائے۔ مگر جی چاہتا ہے کہ لوگ تعریف کریں اس لیے ایک اچھی خواہش کو نیت کی خرابی سے خراب کر دیا۔ اسی لیے ایک حکیم عقلمند کا قول ہے "جب تیرے سامنے کچھ آئے اور تیرا دل چاہے تو اس میں سے کچھ چکھ لے۔ اس میں دو فائدے ہیں اول کھانے کی خواہش ختم ہو جائے گی۔ دوسرے نفس ترستا رہے گا کہ کاش اور کھانے کو ملتا اور یہی مقصود ہے کہ نفس کو تڑپایا جائے۔"

زبان کی آفت

زبان بظاہر گوشت کا ایک لوتھڑا مگر خدا کا بڑا انعام ہے۔ اس کا گناہ اور اس کی اطاعت دونوں آسان اور اہم ہیں۔ دوسرے اعضا تو ایک حد کے اندر اپنے اپنے کام

کرتے ہیں مگر زبان کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے، خیر و شر، موجود معدوم، حقیقی خیالی، واقعی ظنی ہر چیز تک اس کی رسائی ہے۔ کوئی چیز دور ہو قریب ہو، صحیح ہو غلط ہو، حق ہو باطل ہو زبان پر سب کا ذکر آ سکتا ہے۔ اسی لیے زبان کو پوری طرح قابو میں رکھنے کا حکم ہے، نہ معلوم کس وقت کیا زبان سے نکل جائے جو آپس میں، خاندان میں، شہر میں، ملک میں فساد و فتنے کا باعث ہو جائے۔ انسان کے لیے سب سے زیادہ نافرمان یہی حصہ ہے، یہ انسان کو وزنی اور باوقار بھی بناتی ہے اور ہلکار اور خفیف بھی کر دیتی ہے اس لیے اب زبان کی آفتوں کی تفصیلات کو بیان کرنا ضروری ہے۔

زیادہ بولنے کی آفت، خاموش رہنے کی فضیلت

زبان سے بچنے کی ایک صورت ہے کہ آدمی زیادہ تر خاموش رہے۔ خاموشی ہی حکمت اور احتیاط کی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جسم کی اصلاح قلب سے ہوتی ہے اور قلب کی اصلاح زبان کی اصلاح پر منحصر ہے، جس کو سلامتی مطلوب ہو اس کو زیادہ تر خاموش رہنا چاہیے۔ اگر کسی کی زبان سے اس کا پڑوسی تنگ ہے تو اس کی زندگی بھر کا بڑے سے بڑا عمل بیکار ہے، سلامتی اور امن وچین کا سب سے بڑا ذریعہ سکوت ہے۔ صاحب بصیرت، حکیم، عقلمند اور اکثر و بیشتر خاموش رہا ہے، دراصل زبان کی حفاظت مال و دولت کی حفاظت سے زیادہ مشکل ہے اور اہم بھی۔ سکوت کے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بولنے میں خطا، جھوٹ، غیبت، چغلی، نفاق، فحش، خود پسندی، تکبر، ممنوعات پر اصرار دجل فریب، مخلوق کو ایذا مخلوق کی پردہ دری اور بہت سے عیوب صادر ہو جاتے ہیں اور خاموشی سے ہمت مجتمع رہتی ہے، وقار اور ہیبت باقی رہتی ہے۔ دل و دماغ نیک اور اچھی باتوں کے لیے فارغ رہتے ہیں، ہزاروں فتنے دبے رہتے ہی۔ اگر گفتگو میں ضرر ہی ضرر ہے، نفع نہیں ہے تو ایسے بولنے سے خاموش رہنا۔ بہتر اور افضل ہے، اور اگر گفتگو میں صرف نفع ہے تو ضرور کلام کرے اور اگر کلام میں نفع اور ضرر دونوں ہوں تو دیکھنا چاہیے جو پہلو زیادہ ہو اُس کے

مطابق عمل کرے' اور اگر کلام میں نہ نفع ہے نہ ضرر تو بولنا ہی بیکار ہے۔ اس طرح اگر کلام کے چار حصّے کریں تو تین حصّوں میں سے سکوت بہتر ہے اور ایک حصّے میں بات کی اجازت ہے۔ معلوم ہوا خاموشی زیادہ رکھے اور کلام کم کرے' انسان کو چاہیے کہ گفتگو کرتے وقت کلام کی آفتوں غیبت' جھوٹ چغلی اور دوسری قباحتوں سے محفوظ رہے۔ ایسی بات کہے کہ نہ خود بولنے والے کو ضرر ہو اور نہ کسی دوسرے بھائی کو۔ کتنا ہی بلند درجے کا عمل کرنے والا ہو اگر بلا وجہ ہر وقت بات اور کلام کرتا رہے تو ڈر ہے کہ اس کی ساری عبادت سارا عمل بیکار نہ ہو جائے۔ نیک بختی اور خوش نصیبی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آدمی بلا وجہ کلام نہ کرتا ہو' خواہ کتنا ہی مفید ہو' بلا موقع' بلا تفکّر اور تدبّر کے منہ سے نہ نکالے۔ بے فائدہ تو کلام کرنا ہی نہیں چاہیے' بے فائدہ کی تفسیر یہ ہے کہ کوئی بڑی تفصیل اور تشریح کے ساتھ اپنے سفر کا حال بیان کرے اور اس میں آسمان و زمین کے قلابے ملانے لگے' جس میں اپنی بڑائی مقصود ہو۔ اگر یہ پورا حال نہ بھی سناتا تو کوئی نقصان نہ ہوتا۔ اور سنایا بھی تھا تو مختصر لفظوں میں خاص سبق آموز اہم واقعات کو سُنا دیتا۔ ایک بے فائدہ کلام یہ بھی ہے کہ دوسروں سے بلا وجہ مہمل قسم کا سوال کیا جائے۔ اس میں اپنا وقت ضایع کیا اور جواب دینے والے کو مجبور کیا کہ وہ بہر حال جواب دے۔ ان تمام باتوں کا علاج یہی ہے کہ تنہائی کو پسند کرے تو شاید کثرت کلام سے بچ جائے۔ زیادہ بولنے کی عادت بھی بری ہے۔ اگر ایک جملے سے بات پوری ہو گئی اور کلام نکل گیا تو مزید نہ کہے ورنہ یہ زیادتی ہو گی اور یہ بری عادت ہے۔ مال کی جگہ زبان کو دے دے یعنی دبا کر رکھے اور زبان کی جگہ مال کو دے یعنی خوب خرچ کرے۔ جو زیادہ بولتا ہے سمجھ جاؤ وہ بہت بے احتیاط اور جھوٹا آدمی ہے۔ ایک عالم کے لیے اس سے بڑا کوئی امتحان نہیں کہ وہ بولنے سے زیادہ سنتا رہے کیونکہ عالم کے دل کا سب سے بڑا تقاضا بولنے اور اپنے علم کو کھولنے کا ہوتا ہے۔ سننا اُس کے لیے بہت مشکل کام ہے کلام میں زیادتی اور کثرت کے علاوہ اس کا بھی خیال رہے کہ باطل اور گناہ کی قسم کی چیزیں نہ آنے

پائیں۔ اس سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ ضرورت سے زاید نہ بولنے کا پکا ارادہ کرے۔ ورنہ احساس بھی نہ ہوگا اور آدمی برباد ہوکر رہ جائے گا۔ بعض بڑے قسم کے واقعات جو پہلے ہو چکے ہوں جن کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو ان کا ذکر بھی زاید بات ہے اس سے بھی بچنا چاہیے۔ اپنے دوستوں' ساتھیوں یا مخالف کی بات کاٹنی اور رد کرنی یہ بھی بُری بات ہے۔ خواہ وہ لفظی گرفت ہو جیسے یہ کہے "جناب ذرا آپ اپنے جملوں پر تو غور کریں' کیا غلط زبان بول گئے ہیں۔" اور خواہ وہ معنوی گرفت ہو" جیسے کسی کی تحریر کی غلطیاں نکالی جائیں یا جو معنی بات کہنے والا اپنی بات میں بیان کر رہا ہے اُسے رد کیا جائے کہ یہ معنی غلط ہیں۔" اسی طرح علمی بحث و مباحثہ جدال و تکرار بھی ناروا بات ہے' گفتگو میں کبھی بحث و مباحثہ اور تکرار نہ کرے۔ نرمی سے افہام و تفہیم کرے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ مجلس میں بیٹھ کر سب کی سُنے خود کچھ نہ بولے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سخت مشکل بات ہے کہ محفل میں بیٹھا ہو' غلط بات ہو رہی ہے' لوگ غلط حصہ لے رہے ہیں کسی کو صحیح بات معلوم ہو اور وہ محض بحث و تکرار سے بچنے کے لیے گفتگو میں حصہ نہ لے۔ اسی لیے ایسے مرد کی تعریف کی گئی ہے بر حق بات جانتے ہوئے بھی لوگوں کی بات کاٹنی چھوڑ دے۔ زبان کی ایک آفت خصومت اور لڑائی ہے۔ اس سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔ یہ خالص جانوروں کی نشانی ہے اور انسانوں کے مقام سے بہت نیچے کی بات ہے' خصومت سے دلوں میں گرہ پڑ جاتی ہے' دل مکدّر ہو جاتا ہے۔ آدمی ایک دوسرے کا دشمن ہو جاتا ہے۔ آپس میں قطع کلام' ترک تعلقات' اور معاملات ختم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب بُری باتیں ہیں۔ اسی لیے تعلیم دی گئی ہے کہ "لوگو دوسروں کو ہمیشہ اچھی بات کہو اور کوئی تم کو سلام کرے تو خوشی سے جواب دو۔ خواہ وہ سلام کرنے والا مجوسی ہی کیوں نہ ہو۔" اچھا کلمہ اور نرم گفتگو کے لیے ہم مذہب کے لوگوں سے اچھی بات کرنی چاہیے۔ "نیکی اور عبادت کی صحیح تعریف یہ ہے کہ انسان کشادہ پیشانی اور نرم زبان رکھتا ہو۔" عقلمندوں نے

کہا ہے اگر تمھاری باتوں سے تمھارا ساتھی اور پاس بیٹھنے والا راضی ہے تو خدا بھی تم سے راضی ہے۔اس لیے نرم کلام کرنے سے دریغ نہ کرے۔پھر گفتگو اور کلام میں زیادہ تکلّف سے کام نہ لے۔گفتگو میں قافیہ بندی' زیادہ فصاحت وبلاغت جس سے مطلب ہی خبط ہوجائے کچھ اچھی بات نہیں ہے۔مطلب اور مدعا سے پہلے لمبی لمبی تمہید بھی زیادہ پسندیدہ نہیں ہے' عام گفتگو میں اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔یہ چیز تو خطبے وغیرہ میں گوارا کی جاسکتی ہے۔اگر افراط وتفریط سے بچ کر ہو'اسی طرح بات بات میں گالی بکنا' کسی کو برا بھلا کہنا یہ بھی برا ہے۔اس سے باطن کی برائی کا پتہ چلتا ہے حتیٰ کہ اپنے دشمنوں یا دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی برا نہیں کہنا چاہیے۔جو بات کہنے کی نہ ہو یا حیاو شرم کے خلاف ہو اُسے ہرگز زبان سے نہ نکالے۔فحش باتیں زبان سے نہ نکالے' فحش کا مطلب یہی ہے کہ قبیح باتوں اور بری چیزوں کا اشارے میں بھی ذکر نہ کرے۔مجلس میں بیٹھ کر اپنی عورتوں کا نام لینا' اُن کی تعریف کرنا' دلچسپی سے اُن کا ذکر کرنا سخت بے شرمی کی بات ہے۔کسی پر لعنت ملامت کرنا یہ بھی سخت بری بات ہے انسان' حیوان' نباتات' جمادات کسی پر لعنت نہیں کرنا چاہیے' اسی طرح جان دار بے جان کسی پر لعنت نہ کرے۔کوئی جب زمین پر لعنت بھیجتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہم دونوں میں سے جو زیادہ نافرمان ہو یہ لعنت اسی پر پڑے' لعنت کے معنی ہوتے ہیں خدا کی رحمت سے کسی کو دور کرنا تو انسان کو حق نہیں ہے کہ وہ کسی کو خدا کی رحمت سے دور کرے۔اور مرے ہوئے لوگوں پر تو لعنت کرنی ہی نہیں چاہیے۔وہ بے چارے تو اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔اُن کو تو ہمیشہ بھلائی کے ساتھ یاد کرنا چاہیے۔ہنسی ٹھٹھا میں تھوڑی سی مقدار بری نہیں ہے لیکن زور سے ہنسنا وقار کے خلاف ہے۔مسلسل اور دیر تک قہقہہ لگانے سے قلب افسردہ ہوجاتا ہے' ہاں ہنسی تبسّم کے ساتھ ہو تو بہت مناسب اور درست ہے۔شریف آدمی سے ہنسی کرد گے تو وہ برا سمجھے گا اور ذلیل سے ہنسی کرد گے تو اس کو تم پر جرائت بڑھے گی' کبھی کبھی وقار کے ساتھ مزاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے

جبکہ اُس مزاح سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

تمسخر، استہزاء اور دوسروں کا مذاق اُڑانا یہ باتیں اس لیے حرام ہیں کہ اس سے دوسرں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ تمسخر دوسروں کی حقارت اور اہانت کو کہتے ہیں یا کسی کے عیب اس انداز پر بیان کیے جائیں کہ دوسروں کو ہنسی آئے یہی بات اگر پیٹھ پیچھے ہے تو غیبت ہے اور سامنے ہے تو تمسخر ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کون اچھا ہے کون بُرا ہے۔ پھر بھلا مذاق اُڑانے اور استہزا کرنے کا کیا موقع ہے، کسی کی تحریر پر، چلنے بولنے پر، ہنسنے ہنسانے پر، قد، کان، آنکھ غرض کسی حصہ جسم یا کسی حرکت کی نقل کرنا یہی استہزا اور تمسخر ہے۔ اس سے بہت بچنا چاہیے۔ اسی طرح افشائے راز، کسی کے راز کو ظاہر کرنا بھی سخت ممنوع ہے۔ اس میں دوستی کا حق مارا جاتا ہے کیونکہ ایک شخص کی بات دوسرے کے پاس امانت ہوتی ہے۔ جھوٹا وعدہ کرنا زبان کے لیے بہت آسان کام ہے مگر اس سے ایک بھائی کو جو دکھ پہنچتا ہے وہ سخت بُرائی کی بات ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اسی کو ہو سکتا ہے جسے کسی کے جھوٹے وعدے پر انتظار کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ ایسے ہی خود جھوٹ بولنا کھلی ہوئی بُرائی ہے۔ چار خزانے ایسے ہیں جن کے بعد اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے راست گفتار ہو۔ امانت کی حفاظت کرنے والا ہو رزقِ حلال اور عمدہ اخلاق کا مالک ہو۔ اگر کسی نے آپ کو کھانے پر بلایا آپ کا دل چاہتا ہے کہ کھالیں مگر آپ نے انکار کر دیا تو یہ انکار جھوٹ ہوگا لیکن کسی صحیح مقصد سے منع کیا ہے تو درست ہوگا، صحیح مقصد جیسے آپ کو یقین ہو کہ صاحب خانہ اخلاقاً پوچھ رہا ہے یا واقعی وہ چاہتا ہے کہ میں کھاؤں مگر اس وقت کھانا کم ہے مجھے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایسے ہی جھوٹے خواب بیان کرنا بھی ایک طرح سے جھوٹ میں شامل ہے۔ ایسے ہی غیبت ایک بڑی بُرائی ہے، جس پر زبان خوب چلتی ہے۔ اسلام نے غیبت کرنے کو بھائی کا گوشت کھانے سے زیادہ بُری چیز بتایا ہے۔ اسی لیے بزرگوں نے نماز، روزہ اور دوسری عبادت کے مقابلے میں افضل اس بات کو قرار دیا ہے کہ غیبت سے بچا جائے۔

غیبت

غیبت کی مختصر اور جامع تعریف یہ ہے کہ کسی شخص کا ایسا ذکر کرنا جس کو وہ سنے تو
اُسے برا معلوم ہو۔ کسی کو جسمانی عیب سے یاد کیا یعنی لنگڑا لولا وغیرہ کہہ دیا یا بُرے وصف
سے یاد کیا' بخیل وغیرہ کہہ دیا یا فرقے کی ذلت کو منسوب کیا۔ جلاہا۔ دھنیا۔ بڑھئی وغیرہ کہہ
دیا۔ یہ سب بہت بڑا ہے۔ اگر وہ شخص اس کو برا مانتا ہے۔ پھر جن عیوب سے کسی کو یاد کیا
اگر وہ عیوب اس میں ہیں تب تو غیبت ہے ہی۔ اور اگر یہ عیوب اس کے اندر نہ ہوں تب
بہتان ہوگا' اس کا دوہرا گناہ ہے۔ سب سے بڑی غیبت وہاں شمار ہوتی ہے جب علما اور تعلیم
یافتہ لوگ محض ریا کاری سے اپنا مقصد ظاہر کرنے کے لیے آتے ہیں وہ اس انداز پر غیبت
کرتے ہیں کہ بظاہر غیبت معلوم بھی نہ ہو مثلاً کسی کا ذکر سنا تو کہنے لگے ''خدا کا شکر ہے ہم
حکام کے محتاج نہیں ہیں۔'' یا کسی کا ذکر سن کر کہیں گے ''بھائی بے شرمی سے خُدا بچائے۔''
تو غرض اس وقت یہی ہوتی ہے کہ دوسرا شخص معیوب اور ان کوتاہیوں میں گھرا پڑا ہے' بعض
اوقات کسی کی تعریف کریں گے'' فلاں شخص کتنا عمدہ ہے' کتنی عبادت کرتا ہے بس ایک کمی
ہے' اور اس میں تو ہم سب ہی گرفتار ہیں ذرا صبر کم کرتا ہے۔ اس طرح اپنے نفس کا ذکر کیا
اس ضمن میں دوسرے کی بُرائی کر دی اور اپنے آپ کو صلحا کے مشابہہ کر دیا۔ بعض اوقات غم
و تاثر کی صورت میں غیبت ہوتی ہے'' ہمارے دوست سے فلاں خطا ہوگئی ہے۔ ہمیں اس
کا بہت صدمہ ہے۔'' لیجئے غم کا اظہار ہو گیا اور اصل مقصد جو دوست کی غیبت اور اُس کے
گناہ کا اظہار تھا وہ بھی ہو گیا۔ حالانکہ غم اور ہمدردی ہوتی تو اس کے ازالے کی کوشش کرنا
ضروری تھا مجمع میں اظہار کی کیا ضرورت تھی۔ غیبت کو سننا اُس کے کرنے کی طرح ہے۔ اور
سن کر خوش ہونا' اُس پر تعجب کرنا یہ سب غیبت ہے کیونکہ اس سے غیبت کرنے والے کی
حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ سننے والا کسی وجہ سے زبان سے منع نہ کر سکے تو دل سے بُرا سمجھے
اور اُٹھ کر مجلس سے چلا جائے غیبت سے دوسرے کی آبرو ریزی ہوتی ہے اور کسی انسان کی

آبروریزی کا کسی کو حق نہیں ہے۔ غیبت یا تو کسی کینے اور حسد کی وجہ سے ہوتی ہے، یا کسی وجہ سے غصّہ آرہا ہو، کسی کی خوشامد میں اُس کے دشمن کی غیبت کر کے اُسے خوش کرنا ہوتا ہے، کبھی اپنی جھوٹی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے کسی کی بُرائی ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کسی کی حقارت کے لیے اُس کا مذاق اُڑانا مقصود ہو، اور شرافت کے خلاف ہیں۔ علما کے اندر دوسرے اسباب غیبت کے لیے اُبھارتے ہیں، مثلاً کسی کو دین میں کمزور پایا تو واعظانہ رنگ میں اُس کا نام لے کر بُرا کہنا شروع کیا۔ مثلاً میاں فلاں شخص دین سے بے بہرہ ہے، فلاں گناہ کرتا ہے۔ اس طرح خود بڑے نیک بن گئے۔ حالانکہ عام آدمی جانتا ہے کہ اُس کا گناہ آپ کے اس گناہ سے کہیں کم ہے، یا کسی شخص کے گناہ پر، بُرائی پر رحم کا اظہار کرے کہ "افسوس بے چارا بڑا قابل رحم ہے، فلاں گناہ کرتا ہے اور جانتا نہیں کہ اس کی سزا کس قدر سخت ہے۔" اور یہ بھول گئے کہ آپ نے جو اس کی بُرائی ظاہر کردی ہے تو آپ پر کس قدر سخت فرد جرم لگ گئی، اُس سے زیادہ قابل رحم حالت تو آپ کی ہوگئی، یہ طریقے بہت غور و فکر کے ہیں عموماً علما اس قسم کے امراض میں گرفتار رہتے ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ تمام بُرائیوں سے باز رہنے کی صورت علم ہے جب کہ اُس پر عمل بھی کیا جائے۔ غیبت کا بھی یہی واحد علاج ہے۔ اس بات میں غور و فکر کرے کہ میں غیبت تو کر رہا ہوں مگر خود کہاں کا ایسا پاکباز ہوں۔ مجھ میں خود لاکھوں بُرائیاں ہیں، دانش مندی تو یہ ہے کہ میں اپنے گناہ دور کرلوں۔ بجائے دوسروں کے عیوب اچھالنے کے خود کو صاف کرنے میں لگ جاؤں۔ اگر کوئی پیدائشی بُرائی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے اُسے تو خدا نے ایسا ہی بنایا ہے۔ اگر کوئی میری بُرائی کرے تو مجھے کیسا بُرا لگے گا۔ یہ سب سوچ کر غیبت پر جو جذبہ اُبھار رہا ہے اُس سے خود کو پاک کرے۔ غصّے کی وجہ سے غیبت کر رہا ہے تو غصّے کو ضبط کرے۔ کسی کو خوش کرنے کے لیے غیبت کر رہا ہے تو سوچے کہ ذرا سا کسی کو خوش کرنے کے لیے اپنے کردار و عمل کو خراب کرلینا کون سی دانش مندی ہے۔ کسی کو حقیر بنانا ہو تو سوچے کہ معلوم نہیں لوگ میری اس بات سے

فلاں کی طرف سے بدظن ہوں یا نہ ہوں مگر اتنی بات تو یقینی ہے کہ میرے بارے میں لوگوں کے دل میں غلط خیال پرورش پائے گا کہ یہ کس قدر بڑا آدمی ہے' کسی کی فضیلت پر حسد کر رہا ہو تو سوچے کہ اپنی فضیلت اور بڑائی تو میں نے لوگوں کے سامنے غیبت کر کے ختم کر دی۔ اب دوسروں کی فضیلت کو کیا نقصان پہنچے گا۔ اس کے علاوہ فضیلت اور ذلت انسان کے اپنے بس کی بات تو ہے نہیں' اس پر جلنا اور حسد کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس طرح اگر مرض کے اسباب کو جان لے اور اُن اسباب کو خود سے دور کر لے تو امید ہے مرض کا علاج بھی ضرور ہو جائے گا۔ اور جس طرح زبان سے کسی کی غیبت حرام ہے اسی طرح دل سے کسی کو برا سمجھنا یعنی بدگمانی بھی حرام ہے' کسی کے لیے دل میں یہ خیال جما لینا کہ فلاں میں یہ یہ خرابی ہو گی' سخت بری بات ہے اور نادانی ہے۔ آپ نے اپنا قلب' اپنا دل بدگمانی سے گندا کر لیا اور ہو سکتا ہے کہ وہ شخص ان خطاؤں سے پاک ہو۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی بڑے حاکم سے چھوٹے حاکم کے مظالم بیان کر رہا ہے تا کہ اُس کے مظالم سے بچا رہے تو اس کو غیبت نہیں کہیں گے یا کسی کو شر اور فساد سے روکنا مقصود ہو مثلاً ایک شخص کے پاس کوئی آتا جاتا ہے' آپ کو معلوم ہے کہ یہ آنے والا عام طور پر لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے تو اب نیک نیتی کے ساتھ اس کا حال بتا دینا غیبت نہیں ہے جبکہ اُس کی بُرائی مقصود نہ ہو۔ ایسے ہی کوئی شخص کسی کو ملازم رکھنا چاہتا ہے آپ کو پہلے سے اس نوکر کی برائیاں معلوم ہیں تو اس سے آگاہ کر دینا غیبت نہیں ہے بلکہ ضروری ہے۔ غرض اپنے بھائی کی خیر خواہی کے لیے ایسا کام کرنا غیبت میں شامل نہیں ہے۔ غیبت کرنے کے بعد اگر ندامت ہوئی ہے تو اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی مانگے۔ اگر تنہائی میں غیبت کی ہے تو تنہائی میں معافی مانگے اور مجمع میں غیبت کی ہے تو مجمع میں معافی مانگے اور خلوص و ندامت کے ساتھ مانگے محض نمائش مقصود نہ ہو۔ اسی طرح چغلی بھی زبان کی ایک آفت ہے۔ بُرے ہیں وہ لوگ جو ایک دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں اور بھائیوں میں لڑائی کراتے ہیں اور نہایت

پسندیدہ وہ لوگ ہیں جو دو دلوں کو جوڑتے ہیں با اخلاق ہیں، دوسرے تمام لوگوں سے محبت کرتے ہیں انسان کی نگاہ جب کسی کی کسی بُرائی پر پڑ جائے تو چاہیے کہ اس سے نظر پھیر لے دوسروں سے چغلی نہ کھائے۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی شخص کا مال چپکے سے لے رہا ہے تو اس کی حفاظت کی خاطر ضرور دوسروں سے کہہ دے، یہ چغلی نہ ہوگی، کسی نے دوسرے شخص کو گالی دی، جس کو گالی دی گئی وہ غائب تھا اُس نے ظاہر ہے سنا نہیں۔ اب اس بات کی چغلی کسی تیسرے نے کر دی تو دراصل یہ گالی اس تیسرے شخص کی طرف سے ہوئی کیونکہ اصل میں اس نے سامنے جا کر گالی دے دی ہے اس لیے جس کے سامنے چغلی ہوا سے چاہیے کہ چغلی کرنے والے کو منع کر دے کہ میاں ایسی باتوں سے بچو۔ چغل خور دلوں سے محبت کو ختم کر کے نفاق ونفرت کا بیج بو دیتا ہے۔ برسوں کی محبت اور خوش گوار تعلقات کو ذرا سی دیر میں ختم کر دیتا ہے، آپس میں اتحاد و محبت جو انسانوں کا اہم شیوہ ہے، چغلخور ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے۔ اسی زبان کی آفت میں بیجا تعریف اور مذمّت بھی ہے۔ مذمّت تو ایک طرح سے غیبت کے تحت آتی ہے۔ تعریف میں بھی بہت سی آفتیں ہیں، کچھ بُرائیاں تو تعریف کرنے والے کے ذمّے جاتی ہیں۔ مثلاً اس قدر تعریف میں مبالغہ کرنا کہ جھوٹ ہو جائے یا تعریف ریا کاری کی حد تک کی جائے یا ان چیزوں کی تعریف کوئی کرنے لگے جس کے بارے میں اُسے معلوم بھی نہ ہو کہ یہ وصف ممدوح میں ہے یا نہیں، یا پھر ممدوح ظالم وفاسق اور زبردست ہے مگر تعریف کرنے والا اپنی باتوں سے اسے خوش رکھتا ہو۔ اسی طرح تعریف سے کچھ برائیاں اس کو حاصل ہوتی ہیں جس کی تعریف کی جارہی ہے مثلاً تعریف سے اُس میں تکبر پیدا ہوتا ہے، یا تعریف سے ذات پر بھروسہ ہو جائے گا تب اپنے نفس کی اصلاح سے غافل ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص تمھاری تعریف کرنے ہی لگے تو اس سے بچنے کا ایک ہی علاج ہے کہ آنکھ بند کر کے اپنے عیوب کو سوچے، اپنے گناہوں کو یاد کرے اور یہ خیال کرے کہ یہ بے چارا تعریف کرنے والا میرے ظاہر کو

میری تعریف کر رہا ہے۔ اگر اسے میری صحیح حقیقت حال کا پتہ چل جائے تو کبھی میری تعریف نہ کرے۔ یہ سب خیال کرنے سے امید ہے اس کا نفس کسی دھوکے سے بچا رہے گا

غصّہ اور حسد کی بُرائی

اسلامی تعلیم کے مطابق زبردست پہلوان وہ ہے جو غصّے پر قابو پالے' غصّے میں حلیم اور باوقار مرد خفیت ہو کر رہ جاتا ہے' جس قدر جلد ممکن ہو غصّے کو فرو کر دینا ہی انسانیت کی شان ہے۔ تمام برائیوں کی کنجی اور جڑ یہی غصہ ہے' غصّے کے نتیجے میں جو نادانی ہو جاتی ہے اس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی' کیونکہ غصّے میں آدمی کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی اور بے عقلی میں جو باتیں سرزد ہو جاتی ہیں وہ بڑی خطرناک ہوتی ہیں' اس لیے غصہ اور عقل کبھی جمع نہیں ہوتے۔ سب سے بہترین حسن اخلاق ترک غصہ کا نام ہے۔ غصہ ایک قوت کا نام ہے جس کا محل و مرکز قلب ہے' یہ قوت کسی ایذا سے قبل موذی کو رفع کرنے کے لیے جوش مارتی ہے اور ایذا کے بعد انتقام اور بدلے کے لیے اُبھرتی ہے کیونکہ انتقام سے اس قوت کو سکون ملتا ہے۔ اس قوت کے لحاظ سے انسانوں کے تین درجے ہوتے ہیں یا تو یہ قوت بالکل ہی نہ ہو تو یہ بُری بات ہے۔ ایسے شخص کو بے غیرت کہا جاتا ہے' غصہ اور حمیت کا ایک دم نہ ہونا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ دوسرا درجہ افراط یعنی زیادتی کا ہے۔ یعنی غصہ اس قدر غالب ہو کہ آدمی مال اور انجام سے بے فکر ہو جائے اُس کی عقل ماری جائے' اپنے آپ پر اختیار نہ رہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ آدمیوں کا غصہ عقل کے تابع رہے' یہ غصہ برا نہیں ہے، ایسا غصہ وہیں آتا ہے جہاں غصے کی ضرورت ہوتی ہے اور اتنا ہی آتا ہے جس قدر غصہ برا نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ اگر بے غیرتی اور بے حمیتی کی حد تک غصہ کم ہو تو غصّے کی عادت ڈالنی چاہیے اور اگر جنون کی حد تک ہو تو اس کو دبا کر اعتدال پر لانا چاہیے سوال یہ ہے کہ کیا جدوجہد سے غصّے کو دور کیا جا سکتا ہے یا نہیں غصہ اگر اس لیے آیا ہے کہ کسی نے کسی کی بہت ضروری چیز چھین لی ہے جو چیز کہ اس کو شدید ضرورت کی وجہ سے محبوب تھی تو ایسا غصہ

کوشش سے ختم تو نہ ہوگا ہاں جدو جہد اور ریاضت سے اُس کا زور کم ہو جائے گا،

بعض وہ چیزیں ہوتی ہیں جو زاید ہوتی ہیں ضروری نہیں ہوتیں مثلاً سجاوٹ اور فیشن کا سامان اگر ایسی چیزوں کے چھن جانے پر غصہ ہے تو امید ہے یہ غصہ سمجھانے سے، غور و فکر سے، ریاضت اور محنت سے ختم ہو سکتا ہے، بعض چیزیں وہ ہوتی ہیں جو کسی کے لیے ضروری ہیں اور جاہل کے لیے بے کار ہے بڑھئی کے لیے اس کا اوزار نہایت ضروری ہے دوسروں کے لیے بے کار ہے تو یہاں غصّے کی نوعیت میں بھی اسی انداز سے فرق ہوگا اصل یہ ہے کہ جائز چیزوں کی اہمیت اگر سمجھانے بجھانے سے دل میں سے ختم ہو جائے تو ان کی محبت بھی ختم ہو جائے گی اور غصہ چونکہ محبت کا تابع ہوتا ہے اس لیے وہ غصہ بھی جاتا رہے گا دنیا کے مکر و فریب کو پہچان کر جس قدر دُنیا سے دور ہوگا اسی قدر دُنیاوی نفع و ضرر کی اہمیت اُس کے دل سے ختم ہوگی اور اسی قدر غصہ ختم ہوتا جائے گا کیونکہ کسی نے نفع کی چیز چھین لی اُس وقت غصہ آتا ہے یا کوئی شخص اپنی کسی چیز میں نقصان پہنچا دے تو جب نفع اور نقصان کی کوئی حیثیت ہی نہ رہی تو غصہ کیوں آئے گا بعض اوقات انسان کو اپنے نفس کی اور اپنی بے عزتی پر بھی غصہ آتا ہے تو اُس وقت انسان کو غور کرنا چاہیے کہ میں اور میرا نفس تو اس قدر ذلیل ہیں کہ فلاں شخص نے جو گالی دی ہے یا جو بے عزتی کی ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے تو اس کو سوچ کر غصہ دب جائیگا۔

غصّے کے اسباب، اُن کے دُور ہونے کے طریقے

ہر بیماری کی طرح غصّے کو بھی اُس کی ضد سے دور کرنا چاہیے اگر غصہ تکبّر کی وجہ سے ہے تو تواضع سے دور کرے، اپنے اندر عجب پیدا ہو گیا ہو اور اس کی وجہ سے غصہ آئے تو نفس شناسی سے دور کرے، فخر پیدا ہو گیا ہے تو انسانوں میں خود کو برابر سمجھ کر دور کرے، غصے میں فکر و ذہن جس قدر پراگندہ ہو جاتے ہیں، بلکہ بسا اوقات ظاہری شکل و صورت جس قدر کریہہ ہو جاتی ہے اس کو سوچے اور وقار و حلم سے کام لے، غصّے میں اگر کھڑا ہوا ہے تو بیٹھ

جائے، بیٹھا ہے تو لیٹ جائے، ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے، دو گھونٹ ٹھنڈا پانی پی لے امید ہے ان اعمال سے غصّے کی آگ سرد پڑ جائے گی، اگر کسی کمزور پر غصہ آیا ہے تو سوچے کہ میری طاقت کا یہ مظاہرہ نہیں ہے کہ اس کمزور سے بدلہ لوں، بہترین طاقت یہ ہے کہ غصّے سے بدلہ لوں اور معاف کر دوں اس سے اپنا ضمیر بھی مطمئن ہو گا وقار اور حِلم کا انداز ہ ہوگا ایک لمحے کا حِلم بہت سے شر و فساد کو ختم کر دیتا ہے

حلم کی فضیلت

حلم کی تعریف یہ ہے کہ غصہ جوش پر نہ آئے اور اگر آ جائے تو اس کو ختم کرنے میں قلب و دماغ کو زیادہ جدو جہد نہ کرنی پڑے، انسان کی فطرت میں حِلم داخل ہے اب جو اس کا مظاہرہ کرتا ہے اُس کے دانش منداور عقلمند ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے شروع میں آدمی کو چاہیے کہ تکلّف کے ساتھ سہی اس کمال کو اختیار کرے آہستہ آہستہ اس کی عادت پڑ جائے گی علم ہمیشہ سیکھنے سے آتا ہے اور حِلم بہ تکلّف حلیم بننے سے پیدا ہوتا ہے، غضب و تکبّر اور ظلم سے ہیجان پیدا ہوتا ہے اور ہیجان، نرمی و حلم کا دشمن ہے اس لیے علم سیکھ کر اس کو حلم و وقار سے مزّین کرنا بڑی شرافت بڑی دانش مندی اور بڑائی کی بات ہے مگر اب لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک بزرگ نے مثال دی "پہلے لوگ پھول ہی پھول تھے، کانٹا نام کو نہ تھا اور اب لوگ کانٹا ہی کانٹا ہیں پھول نام کو نہیں" بزرگوں کا قاعدہ تھا کہ ان کو جب کوئی برا کہتا یا گالی دیتا تو وہ دعا دیتے یا خاموش رہتے بلکہ عملی طور پر گالی دینے والے کو کچھ عطا و بخشش کرتے تھے اس سے بعض اوقات برا کہنے والا اس قدر مجوب و شرمندہ ہوتا کہ زندگی بھر کے لیے اپنی حرکتوں سے توبہ کر لیتا سچ ہے اخلاقی سزا سب سے بڑی سزا ہے حضرت عیسیٰؑ ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے، ان لوگوں نے گالی دی آپؑ نے دعا دی لوگوں نے کہا حضورؑ یہ کون سا صلہ ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔"جس کے پاس جو چیز ہوتی ہے وہ وہی چیز دیتا ہے۔" انتقام اور بدلہ اگر لینا ہو تو ضروری ہے کہ ان حدود کا خیال

رکھے کہ زیادتی نہ ہو اگر کوئی گالی کے بدلے میں گالی بکنے لگے یا غیبت کے بدلے میں غیبت کرے تو اس سے بڑی جہالت کیا ہوگی انتقام اِتنا ہی لے کہ کوئی سچّی بات اُسے کہہ دے جس سے اس کو احساس ہو جائے کہ اگر میں اس کو کچھ نہ کہتا تو یہ نہ سننا پڑتا، اپنے اوپر غضب کو روکنے والوں کی تین قسمیں ہیں ایک گھاس کی طرح ہیں جلدی بھڑکتے ہیں جلدی ہی بجھ جاتے ہیں، بعض پتھر کے کوئلے کی مانند ہیں دیر میں سلگیں دیر میں اور بجھ جائیں سویرے یہ حالت سب سے اچھی ہے اور جو جلد بھڑک کر بجھتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہوتے۔

کینہ:

جب آدمی کسی مجبوری کی وجہ سے انتقام نہیں لے سکتا اور غصہ پینا پڑتا ہے تو یہ غصہ باطن پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہی کینہ بن جاتا ہے اُس شخص سے نفرت بیٹھ جاتی ہے، دل اس کو برا جاننے لگتا ہے اس سے اور برائیاں پیدا ہوتی ہے مثلاً حسد یعنی اس بات کی تمنا کرنی فلاں کے پاس سے دولت یا کمال ضائع ہو جائے یا کسی کو نعمت ملے تو اُس پر خود کو غم ہو یا کسی پر مصیبت آئے تو اُس پر دوسرے کو خوشی ہو، کسی بھائی سے ترک تعلق یا ترک کلام، کسی کو حقیر و ذلیل جاننا، کسی بھائی پر تہمت لگانا، اُس کی غیبت کرنا، اس کو رسوا کرنا، اس کا بات بے بات مذاق اڑانا اُس کے حق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا، کینے کے نتیجے میں یہ اور اسی قسم کی دوسری برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں

عفو اور احسان

دوسروں پر جو اپنا حق ہو یا قرض ہو اس کو معاف کر دینا عفو ہے اور مزید اُس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا یہ احسان ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ جب تک انتقال کا موقع نہ ملے اُس وقت تک حلم اور برداشت سے کام لینا چاہیے اور جب موقع ملے تو عفو اور حسان کرنا

چاہیے۔ دراصل محسن وہی ہے اور حلیم بھی وہی ہے جو ظلم کے وقت حلم و برداشت سے کام لے اور جب بدلہ لینے پر قابو پائے تو معاف کر دے۔

حسد کی حقیقت' اور حسد کیسے دور کیا جائے

حسد ہمیشہ نعمت پر ہوتا ہے' کسی کو خدا نے نعمت دی۔ دوسرا اُسے دیکھ کر جل گیا اور چاہے کہ اس کے پاس نہ رہے تو یہ حسد ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نہ نعمت بُری لگے نہ کسی کے پاس سے ختم ہونے کی تمنا ہو بلکہ یہ خواہش ہو کہ ہمیں بھی مل جائے تو یہ غبطہ ہے اور غبطہ کرنا بُرا نہیں ہے' غبطہ میں کسی کی نعمت کے زوال کی خواہش بالکل نہیں ہوتی بلکہ آدمی میں ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے اور تب وہ محنت اور جدوجہد کرتا ہے کہ خود بھی دوسروں کی طرح ہو جائے اور ظاہر ہے یہ جذبہ مستحق اور پسندیدہ ہے۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔ دوسروں کی نعمت کا زوال چاہنا یہ بہت ہی بُرا درجہ ہے' دوسرے کی نعمت کی تمنا کرنا۔ اس سے غرض نہیں کہ دوسرے کے پاس کیوں ہے نہ یہ خواہش کہ دوسروں کے پاس سے جاتی رہے' تیسرے یہ کہ جو نعمت دوسروں کے پاس ہو خاص وہی نہیں چاہتا بلکہ اُس جیسی اپنے لیے چاہتا ہے لیکن خود کو نہیں ملتی تو دوسروں سے زوال بھی نہیں چاہتا یہ صورت معاف ہے۔ ایک صورت یہ کہ اگر دوسروں جیسی دولت اُسے نہ ملے تو خواہش کرے کہ دوسروں کے پاس سے بھی زائل ہو جائے۔

حسد کیسے دُور ہو

یہ مرض بھی علم سے دور ہوگا۔ پہلے تو یہ جان لے کہ حسد کرنے سے سوائے نقصان کے فائدہ کوئی نہیں ہے اور جس سے حسد کر رہا ہے اُس کا فائدہ ہی ہے۔ حسد کرنے والا خود اپنا دشمن ہوتا ہے۔ ان باتوں کو سوچنے سے امید ہے حسد کا مرض دور ہو جائے گا۔ حسد کا مطلب تو صاف یہ ہے کہ خدا نے ایک نعمت کسی کو دی ہے اور کوئی دوسرا شخص خدا کے اس

فیصلے پر خفا ہے' ناراض ہے تو یہ کس قدر بری بات ہے' دنیا میں حاسد ہمیشہ رنج والم میں گرفتار رہتا ہے۔ جس پر حسد کر رہا ہے۔ وہ تو عیش کر رہا ہے اور یہ خود حسد کی آگ میں جل رہا ہے نعمت والے کی نعمت تو اُس کے پاس رہی اور دشمن برابر حسد کی آگ میں جلتا رہا تو یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ آدمی اپنے سر ایسی مصیبت مول لے۔ حسد کرنے سے نعمتیں چھن تو جاتی نہیں۔ اگر حسد سے نعمت چھن جایا کرتی اور حاسد کی یہ تمنا پوری ہو جایا کرتی تو خود حاسد کے پاس کہاں نعمت رہ جاتی۔ آخر ان کے بھی تو حاسد ہوتے اور ان حاسدوں کی خواہش پر اس کی بھی نعمت چھن جاتی۔ اس طرح تو کارخانہ عالم کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا۔

دنیا خدا کی' خدا کے دوستوں کی' خدا کے دشمنوں کی' سب کی دشمن ہے۔ خدا کی اس لیے کہ خدا کے بندوں کو اُس کے راستے میں نہیں چلنے دیتی' خدا کے دوستوں کی اس طرح کہ ان کو ہر لحہ اپنے دام فریب کی طرف بلاتی ہے' خدا کے دشمنوں کی اس طرح کہ اپنے مکرو فریب میں ان کو اس طرح پھنسالیا کہ وہ دنیا پر اعتماد کر بیٹھے اور آخر میں ایسا دھوکا دیتی ہے کہ سوائے حسرت وندامت کے کچھ نہیں بچتا۔ جب دنیا کا یہ حال ہے تو اس کی حقیقت جاننی نہایت ضروری ہے۔ حضرت عیسیٰ کا قول ہے۔ دنیا سرائے ہے مسافر کی طرح اس پر سے گزر جاؤ اور تمام برائی کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔ دنیا کی خاص بات یہ ہے کہ جس کو یہ ملے وہ بھی مصیبت میں اور جسے نہ ملے وہ بھی مصیبت میں' جسے ملتی ہے وہ مشقت میں پڑ جاتا ہے اور جسے نہیں ملتی وہ رنج اٹھاتا ہے' دنیا یا دنیا کی محبت بری چیز نہیں ہے ہاں دنیا کا غلط استعمال برا ہے ورنہ دنیا کی محبت تو ایک غیر اختیاری فعل ہے' عقلمند دنیا میں نیک کام کرتے ہیں اور دنیا کو غنیمت جانتے ہیں اور بے وقوف دنیا کو پہچانتے نہیں' جب دنیا سے جانے لگتے ہیں تو حسرت کرتے ہیں کہ کاش کچھ وقت ملتا اور کچھ نیک کام کر لیتے' دنیا کی کوئی خوشی ایسی نہیں ہے۔ جس کے ساتھ رنج شامل نہ ہو۔ دراصل مالدار' تونگر وہ ہے جو دنیا کی غلامی سے آزاد ہو۔ یہ ضرور ہے کہ دنیا میں ملوث ہونے والا برا ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دنیا

کو ایک دم چھوڑ دیا جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بتایا جائے کہ کس حد تک دنیا کا استعمال لازمی ہے' انسان کا سب سے افضل اور بلند مقصد نیکی اور عبادت کی زندگی گزارنا ہے جس کے لیے کچھ ریاضت اور مشقت سے کام لینا پڑتا ہے اور جسمانی صحت' زندگی کی ضروریات 'غذا' لباس اور مکان وغیرہ اس سلسلے میں اہم ضرورتیں ہیں اس لیے اس حد تک غذا' لباس' مکان اور زندگی کی دوسری ضروریات کو طلب کرنے والا ہرگز دنیا دار نہیں کہلائے گا۔ بلکہ یہی دنیا اُس کے حق میں آخرت کی کھیتی ہے۔ لیکن انھیں چیزوں کو اگر عیش و عشرت کے لیے حاصل کیا جائے تو یہی دنیا طلبی اور بری بات ہوگی۔ دراصل نیت اور ارادے سے دنیا خراب اور اچھی ہوسکتی ہے۔ اگر دنیا کو نیک نیتی سے حاصل کرے تو ہرگز برا نہیں ہے اور بدنیتی ہو تو یہ دنیا طلبی اور برا کام ہے۔ ایک چیز انسان کی حاجت اور ضرورت ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنی حاجت کو ضروریات زندگی کی حد میں رکھے۔ عیش و عشرت کی حدود میں نہ جانے دے' جسم' بدن اور اُس کی ضروریات میں اس قدر مصروف ہونا کہ علم و عمل' نیکی' طاعت و عبادت کی طاقت باقی رہے یہ ہرگز دنیا داری نہیں ہے۔ باقی پوری طرح دنیا میں لگ جانا' شرافت' نیکی' بھلائی حاصل کرنا جو انسان کا اصلی مقصد ہے اس کو فراموش کرتا ہے مگر نیت اچھی ہے' غریبوں کی خدمت' اللہ کی مخلوق کی خدمت' اہل و عیال کی خدمت' اس کا مقصود ہے۔ پھر دنیا کو ظلم' چوری' دھوکے سے حاصل نہیں کرتا تو ہرگز اُس کی برائی نہیں کر سکتے نہ اس کو دنیا دار ہونے کا طعنہ دے سکتے ہیں۔

دنیا اور اُس کی تفصیلات

دنیا میں صنعت و حرفت' حرفہ اور دوسرے مختلف کام ہیں اُس کی تفصیل یہ ہے کہ عام طور پر انسان تین چیزوں کا محتاج ہوتا ہے۔ غذا' لباس' مکان۔ کاشت کار غذا کا ذمہ دار ہے' کوئی لباس بناتا ہے اور کوئی مکان بنانے کا ذمہ دار ہے۔ پھر ان تینوں کاموں کے الگ الگ آلات ہوتے ہیں' پھر انسان کی ایک اور خصوصیت ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کا خواہش

مند ہوتا ہے۔ یہ اجتماع اگر لق و دق صحرا اور جنگل میں ہو تو جان و مال عزت و آبرو سب کو خطرہ ہے۔ اس لیے شہر، فصیل اور مکان کی ضرورت ہوئی اور یہ اجتماعی صورت شہروں اور آبادی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ پھر انسانی سرشت ایک اور صورت میں جلوہ گر ہوئی اور وہ تھی باہمی نزاع، کش مکش، چیزوں پر قبضہ، حق و ناحق دعویٰ وغیرہ۔ اب ایک حاکم اور فیصلہ کرنے والا ضروری ہوا، اُسے فیصلہ کرنے اور چیزوں کو برابر تقسیم کرنے کے لیے ناپ تول مساحت وغیرہ کی ضرورت ہوئی۔ باہمی اختلافات، لڑائی جھگڑے، چوری، ڈاکے وغیرہ کو دفع کرنے کے لیے اور دوسرے حفاظتی امور کے لیے فن سپہ گری کی ضرورت ہوئی اور حکومت و پنچایت کی ضرورت ہوئی جو ان قضیوں کو دفع کر سکے، سیاست اور میدان میں مخصوص مزاج، مخصوص افراد، اُن میں نظم و ضبط، انتظام و انصرام کے لیے حاکم اعلیٰ کی ضرورت پڑی۔ پھر اگر ایک گروہ پر دوسرا گروہ حملہ آور ہو تو دفاع، طریقہ دفاع اور سامان دفاع نہ معلوم کس کس چیز کی ضرورت ہوئی۔ غرض ایک جنگل، نہ ختم ہونے والا دنیا کے کاروبار اور ضرورتوں کو جوڑتے جایئے، ملاتے جایئے۔ ضرورتوں کا ایک جم غفیر نکلتا جائے گا، انسان مکھی کی طرح اس جالے میں پھنسا نظر آئے گا۔ اصل کیا تھی۔ غذا، لباس، مکان اور انجام کیا ہوا۔ ایک جنگل ایک بکھیڑا۔ پھر دنیا کا کوئی پیشہ بغیر سیکھے، بلا محنت اور جدوجہد کے نہیں آتا اور بعض سہل پسند طبائع سیکھنے سکھانے کی محنت سے بھاگتی ہیں۔ وہ دوسروں کی کمائی کی طرف دیکھتی ہیں۔ اس کام کے لیے دو پیشے تو عام ہیں، چوری اور گداگری۔ لوگوں نے ان دونوں سے حفاظت شروع کی تو ان دونوں نے نئے نئے حربے استعمال کیے۔ بعض بزدل تو رات کو نقب زنی کرنے لگے، سوتے میں مال کھسکانے لگے۔ بعض باہمت دن میں ڈاکے ڈالنے لگے۔ گداگر ذلّت سے سڑکوں پر بھیک مانگتا ہے، ذرا سی تکلیف سے اپنے کسی عضو بدن کو ناقص کر کے اُس کو دکھا کر رحم کی بھیک مانگتا ہے، یا بے رحمی سے بچوں کی آنکھ پھوڑ کر، ان کے عضو بدن کو ناقص کر کے ان کے طفیل میں ہاتھ پھیلاتا ہے۔ بعض لوگ مسخرہ پن، قصے بازی، پھکڑ بازی، نٹ بازی، جو

کر پیش کرتے ہیں، کوئی شعروشاعری کو اپناتا ہے، کچھ لوگ پچھلے لوگوں کے، اولیا وانبیا کے مناقب بیان کرتے ہیں اور گا گا کر سناتے ہیں، کچھ تعویذ، گنڈے کو ذریعہ آمدنی بناتے ہیں، کچھ نجومی بن کر ہاتھ دیکھتے ہیں دنیا کئی صورتوں میں سامنے آئی۔ اور لوگ مقصود کو بھول کر دنیا میں جا پڑے، کھاتے ہیں تو آئندہ کمانے کے لیے، کھانے سے نیکی اور بھلائی حاصل کرنے کا کوئی تصور نہیں ہوتا اور کماتے ہیں تو کھانے اور اُڑانے کے لیے۔ خیرات کرنے، غربا کی خدمت کرنے کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ دھوکے میں گرفتار اور دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم شریعت کی روح کو پا گئے ہیں۔ حالانکہ شریعت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دنیا کو ترک کر کے زاہد بن جائیں اور عمل ہی کیے جائیں۔ دنیاوی منفعت سے محروم رہیں، بعض صرف دنیا ہی میں پھنس گئے ہیں اُنھیں نیکی، بھلائی، اخلاق وشریعت، خدا اور اس کی رضا کا کبھی خیال ہی نہیں آتا۔ دراصل یہ دونوں گروہ گمراہ ہیں۔ بعض لوگ دنیا کو دنیا میں ضرورت کے لیے حاصل بھی کرتے ہیں۔ اور اپنے ذہن ودماغ کو اصل مقصد اور کسی بڑائی اور عظمت کی طرف لگائے رہتے ہیں۔ یہی لوگ کامیاب اور اچھے انسان ہیں۔ یہی راستی اور درستگی کی راہ ہے اور انسانوں میں بہت سے لوگوں نے اس راہ کو اپنایا ہے۔

بُخل کی مذمّت

مال ودولت واقعتاً بڑی آزمائش اور فتنے کی چیز ہے، اس کے حاصل کرنے میں رنج ومحنت بھی زیادہ ہے اور اس کی موجودگی میں خطرات بھی بہت ہیں۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ نہ اس کی موجودگی میں چین ہے نہ اس کے بغیر چین ہے۔ دونوں صورتوں میں آدمی کا امتحان ہوتا ہے۔ پھر مفلس ایک تو صابر اور قانع ہوتا ہے۔ اب ایک بات جاننا چاہیے کہ مال نہ قطعی بُرا ہی بُرا ہے نہ ایک دم خیر ہی خیر ہے۔ اس لیے کبھی وہ قابل تعریف ہے جب کارِ خیر کا سبب بنے اور کبھی وہ برائی کے قابل ہے جب بُرے افعال کا سبب بنے۔

دنیاوی زندگی میں کوئی عظمت اور بلندی چاہے تو تین طریقے ہیں' یا تو نفس کی فضیلت حاصل کرے جیسے علم یا حُسنِ اخلاق وغیرہ یا پھر جسم کی فضیلت حاصل کر لے جیسے صحت و تندرستی وغیرہ یا بعض خارجی فضیلت جو نہ جسم سے متعلق ہے نہ نفس سے مگر دونوں کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً مال و اسباب کی فضیلت' اِن تینوں میں نفس کی فضیلت سب سے اعلیٰ اور بلند ہے۔ اُس کے بعد جسم کی فضیلت اور سب سے آخر میں مال و دولت کی فضیلت ہے۔ اصل میں نفس تو ایک جوہر نفیس ہے جس کی سعادت اور نیک بختی انسان کا منتہائے مقصود ہے اور انسان کا بدن اسی نفس کی خدمت کرتا ہے۔ اس کی حفاظت کرتا ہے اور خود بدن کی بقا اور حفاظت کے لیے غذا' خوراک وغیرہ ضروری ہے۔ اور ظاہر ہے غذا' خوراک وغیرہ بغیر مال کے حاصل نہیں ہوتی۔ تو معلوم ہوا ایک طریقے سے مال و اسباب نفس کے خادم اور اس سے ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں اور دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مال و اسباب خود مقصود نہیں ہیں بلکہ مقصود یعنی ضروریاتِ زندگی کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ اب جو مال کو وسیلہ اور ذریعہ ہی کا درجہ دے اس کو مقصود نہ سمجھے وہ مال کا صحیح مقام بھی سمجھتا ہے اور اس کو صحیح استعمال بھی کرے گا۔ اگر مقصد اچھا ہے تو مال بھی خیر ہوگا اور اگر مقصد میں کھوٹ ہے تو مال بھی فاسد ہوگا۔ مال سے مختلف قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ غذا' لباس اور ضروریات پر خرچ کرنا یہ تو مال کا اصل فائدہ ہے جس کے بغیر آدمی نہ نیک ہوسکتا ہے نہ شریف کہلایا جاسکتا ہے' پھر غریب' فقیر اور ضرورت مند پر خرچ کر کے خدا کی مخلوق کی خدمت کرسکتا ہے اس کے علاوہ اپنے بہت سے دوست' ہمدرد اور بھائی بنائے گا۔ سخاوت کا درجہ حاصل کرے گا۔ اس کے علاوہ اپنی آبرو کی حفاظت بھی ایک شریف انسان کا شیوہ ہے اور یہ کام بھی مال و دولت سے نکلتا ہے' پھر رفاہِ عام اور تمام لوگوں کے آرام کے لیے بھی مال سے بہت سی چیزیں بنوائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً کنواں' سرائے' ہسپتال وغیرہ۔ اس کے علاوہ آدمی سوال کرنے کی ذلت سے محفوظ رہتا ہے' لوگوں میں عزیز و محترم رہتا ہے۔ ایک طرف

مال کے یہ فوائد، دوسری طرف مال سے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ مال سے عموماً طبیعت میں بد عنوانی اور غیر محتاط خیالات جنم لیتے ہیں۔ مفلس آدمی گناہ اور تعیشات کے لیے کہاں سے وسائل مہیا کر سکتا ہے، مالداری کا امتحان مفلسی کے امتحان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مالدار کے پاس عموماً لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اختلاط اور میل جول کی برائیوں میں مال دار ہو جاتا ہے، زیادہ فقیری بہت عمدہ دولت ہے اگر فقیری میں قناعت بھی حاصل ہو، امیدوں اور آرزوؤں کو مختصر رکھے، کیونکہ دو حریص ہیں جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ ایک علم کا حریص دوسرے مال کا حریص۔ سب سے بڑی مالداری یہ ہے کہ انسان کے اندر سے طمع ختم ہو جائے۔ حرص و طمع انسان کو انسان کا محتاج بنا دیتی ہے اس لیے وہ کسی قسم کی حق و انصاف کی بات کہنے کے لائق نہیں رہ جاتا۔ بلکہ انسان اس صورت میں دوسرے انسان کی برائی دیکھ کر چشم پوشی کرنے لگتا ہے۔ یہی مداہنت ہے، آزادی اور عزت صرف قناعت میں ہے۔ سخاوت ایسا وصف ہے کہ خدا کو بہت عزیز ہے۔ اگر سخاوت کرنے والا کسی کو بھی اپنے مال سے فائدہ پہنچائے خواہ وہ کسی مذہب، کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو تو وہ خدا کے نزدیک بہت عزیز اور قابل عزت ہوتا ہے۔ بہترین سخاوت اپنے تمام بھائیوں سے نیک سلوک کرنا ہے، سخی کتنا ہی گناہگار ہو بخیل عابد سے بہت اچھا ہوتا ہے اور بخل سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں ہے۔ سخاوت میں سب سے بڑا درجہ ایثار کا ہے یعنی اپنی ضرورت کے باوجود کسی کو کوئی چیز دے دینا۔ یہ کام مشکل بھی ہے اس لیے اس کا درجہ بھی بہت بڑا ہے۔ اور سب سے بڑی بخیلی یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورت پر بھی خرچ نہ کر سکتا ہو، اگر بیمار ہو تو دوا تک نہ کر سکے، بھوکا ہو تو کچھ نہ کھائے، بس یہ سوچتا رہے کہ کسی طرح بھی مال جمع ہو جائے۔

سخاوت اور بُخل کی صحیح تعریف

ان دونوں کی تعریف میں بڑا اختلاف ہے مگر ہم ان کے اختلاف میں نہیں پڑیں گے۔ اصل یہ ہے کہ مال ایک مقصد اور حکمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے یعنی مخلوق کی

ضرورتوں کو اس سے پورا کیا جائے۔ اب اگر کوئی مال خرچ کرنے کی جگہ روکتا ہے تو یہ بخیلی ہے اور جہاں روکنا ضروری اور درست ہو وہاں خرچ کیا جائے تو یہ اسراف اور فضول خرچی ہے اور ان دونوں کے درمیان کا معاملہ سخاوت ہے مگر یہ درمیانی راہ صرف اعضا سے خرچ کرنے کو نہیں ہے اس لیے مال کے سلسلے میں اتنا حوصلہ اتنی جرات انسان میں چاہیے کہ وہ ضرورت کے وقت بلا جبر کراہ' بلا چون و چرا خرچ کر سکے۔ سوال یہ ہے کہ ضروری اخراجات کیا ہیں۔ اس کے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ عادت اور زندگی کے عام معیار کے لحاظ سے جن جن چیزوں کے بغیر کام نہ چلے وہی ضرورت ہے۔ بخل کا علاج۔ بخل کا سب سے بڑا سبب مال کی محبت ہے اور مال کی محبت کبھی لمبی لمبی آرزو اور امید سے ہوتی ہے کبھی اس توقع سے ہوتی ہے کہ ہماری عمر زیادہ اور طویل ہوگی۔ اگر مثلاً یہ جان لے کہ ہم کل مر جائیں گے تو ہرگز مال کی محبت دل میں نہ ہوگی۔ دوسرا بخل کا سبب خود مال اور پیسے کی محبت ہی ہوتی ہے کسی وجہ سے نہیں بلکہ خود پیسہ ہی اچھا لگتا ہے۔ روپے کی زیادتی سے دل خوش ہوتا ہے اس لیے ہزاروں ضرورتوں کے باوجود بعض لوگ پیسہ نہیں خرچ کرتے۔ بقول شخصے جان دے دیتے ہیں مگر مال نہیں دے سکتے۔ یہ جانتے ہوئے کہ مرنے کے بعد پیسہ ہمارے کسی کام نہ آئے گا' خرچ کرنا گراں گزرتا ہے۔ دل کا یہ مرض قطعی لا علاج ہوتا ہے' بخیل کی صفت اس وقت دور ہو سکتی ہے جب بہ تکلف خرچ کیا جائے بلکہ ایک حد تک ریا کاری بھی کرنی پڑے تو اس موذی مرض سے نجات پانے کے لیے وہ بھی کرے اور غالب خیال ہے کہ نیک نامی اور شہرت کے لالچ میں خرچ کرتے کرتے بخل کی عادت جاتی رہے گی۔ خلاصہ یہ کہ بخل کا علاج یا تو علم سے ہے یعنی اس بات کا علم کہ بخل کے نقصانات کیا کیا ہیں یا عمل سے' عمل یہ کہ بہ تکلف خرچ کرتا رہے اور آگے دیکھیے تو یہ دنیا خود اپنی بھی دشمن ہے۔ مثلاً مال کی حفاظت کے لیے پہریدار ضروری ہے اور پہریدار بغیر مال کے خرچ کے حاصل نہیں ہوتا گویا دنیا کی حفاظت میں بھی دنیا ہی جاتی ہے۔

مال کے معاملے میں ہدایات

مال کے معاملے میں آدمی کو چند چیزیں جاننی ضروری ہیں۔ اول مال کا مقصد اور حساب پہچانے۔ کیونکہ مال کی ضرورت بہرحال انسان کو پڑتی ہے یہ جان لے تو ضرورت کے مطابق ہی مال کے لیے کوشش کرے گا۔ دوسرے آمدنی کے ذرائع و وسائل وسامنے رکھے۔ ظلم، چوری اور دوسرے حرام طریقوں سے حاصل نہ کرے۔ تیسرے اپنی معیشت کا لحاظ رکھے۔ نہ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرے نہ ضرورت سے کم پر راضی ہو کر بیٹھ رہے اور معیشت میں میانہ روی کا لحاظ رکھے۔ چوتھے ضروری اخراجات کا لحاظ رکھے۔ نہ ضروری اخراجات کو روکے کہ بخیل کہلائے نہ بے وجہ خرچ کرے کہ فضول خرچ اور مسرف کہلائے۔ پانچویں اپنی نیت اور حوصلہ بلند رکھے۔ اپنی کمائی سے دوسروں کی مدد غریبوں کی اعانت، حاجت مندوں کی حاجت روائی کا پورا پورا خیال رکھے۔ انسان دنیا کو اور دنیا کی ضرورت کو نیک نیتی اور خلوص سے حاصل کرے، خرچ کرے تو یہی عبادت ہے اس طرح دنیا کا استعمال برا نہیں ہے ضرورت زائد اس لیے رکھنا کہ کسی خدا کے بندے کو ضرورت پڑ سکتی ہے تو اس کی مدد ہو جائے گی۔ یہ بہت پسندیدہ اور مستحسن فعل ہے اور اس جگہ ضرورت سے زائد جمع کرنا بھی عبادت ہے۔

جاہ اور ریا کی مذمّت

حُبِ جاہ وعزت کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان نیک کام کرے اور خفیہ طور پر یہ خواہش رکھے کہ لوگ اس کی طرف مائل ہوں، اور اسی خواہش کے دباؤ سے مجبور ہو کر انسان ریا کرتا ہے یعنی نیک کام کرے گا مگر اپنے خدا کے لیے یا بھلائی اور نیکی کے لیے نہیں کرتا بلکہ لوگوں کو دکھلانے کے لیے کرتا ہے۔ وہ صوفی جو عموماً ان پڑھ ہوتے ہیں وہ اس مرض میں زیادہ گرفتار ہوتے ہیں، دراصل نام کی شہرت بڑا خطرناک جادو ہے، اسی لیے گمنامی کو پسند کیا گیا

ہے۔ اگر کوئی شخص علمی کمال رکھتا ہے یا غریبوں کی بہت مدد کرتا ہے، مخلوق کی خدمت کرتا ہے اور وہ اپنے ان کمالات کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہے تو وہ برا نہیں ہے۔ اگر ان نیک کاموں میں اس کی نیت ریا کاری اور شہرت نہ ہو بلکہ خود ہی لوگ اس کو جان گئے ہوں۔ اصل میں تو نیت اور ارادے پر گرفت ہے، اگر محض نام آوری کے لیے ریا کاری کرتے ہوئے ایسا کیا ہے تو ضرور وہ برا آدمی ہے۔ جاہ وعزت اور مال میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ مال میں آدمی ان چیزوں کا مالک ہوتا ہے جن سے اسے ہر قسم کا فائدہ پہنچ سکے اور جاہ میں انسان دلوں کا مالک ہوتا ہے جس سے وہ دنیا میں نفع حاصل کر سکتا ہے، اپنی تعظیم اور اطاعت کرواتا ہے۔ مالدار مال پر قابو اور قدرت رکھتا ہے اور صاحبِ جاہ دلوں پر قدرت رکھتا ہے۔ مال انسان کو اس لیے پیارا ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے انسان اپنی بہت سی ضرورتیں پوری کرتا ہے، جاہ کے محبوب ہونے کی بھی قریب قریب یہی وجہ ہے کیونکہ جاہ اور لوگوں کے دل کو قابو میں لانے پر ذرا غور کیا جائے تو جاہ اور لوگوں کا دل بظاہر کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے جو منفعت حاصل ہوتی ہے وہ اصل چیز ہے جیسے مال خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ اس لیے محبوب ہے کہ اس سے دس کام نکلتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ جاہ کی محبت مال کی محبت سے زیادہ قیمتی چیز ہے کیونکہ جاہ سے مال بآسانی مل جاتا ہے۔ مال کی محبت کا تعلق دل ہی سے تو ہوتا ہے اور جب جاہ والوں نے دل ہی کو قبضے میں کر لیا ہے تو اب ہر چیز آسانی سے قابو میں آ جائے گی۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کو مال حاصل ہو جائے اس کو دلوں کی محبت بھی حاصل ہو۔ ایک مالدار ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ لوگ اس سے، اس کے مال سے نفرت کرتے ہوں۔ اس لیے جاہ بہرحال مال سے بہتر ہوا۔ دل پر ملکیت بغیر محنت کے حاصل ہو جاتی ہے اور باقی رہتی ہے۔ نہ اس ملکیت میں چوری کا خطرہ نہ گھٹنے کا سوال۔ یہ ایک دل سے دوسرے دل میں سرائیت کرتی ہے کیونکہ دل جب کسی کا معتقد ہوتا ہے تو زبان پر خود بخود اس کا ذکر کثرت سے آتا ہے۔ دوسرے سنتے ہیں اور اس کے معتقد ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مال والا

جاہ کے لیے کوشش کرتا ہے اور جاہ والا مال اور مال والوں سے بے نیاز رہتا ہے۔ مال خود اس کے قدموں پر ڈھیر ہوتا رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مال اور جاہ کا طلب کرنا اس غرض سے ہو کہ اس سے کوئی مفید مطلب حاصل کیا جائے یا کوئی نقصان دور کیا جائے تو یہ برا تو نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اتنی ہی نیت ہو تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ ضرورت ہے اور ضرورت کے لیے کوئی وسیلہ و ذریعہ خواہ وہ مال ہو یا جاہ برا نہیں ہوتا مگر مشکل یہ ہے کہ اتنی قناعت پسند طبیعتیں اب میسر کہاں ہیں۔ اب تو حال یہ ہے کہ ضرورت نہ ہو تب بھی آدمی مال اور جاہ کی محبت میں گرفتار رہتا ہے۔ حتیٰ کہ مال سے بھرا ہوا ایک جنگل کسی کو دے دیا جائے تو وہ دوسرے جنگل کی خواہش کرے گا۔ حالانکہ اس کو اتنے مال کی کبھی ضرورت نہ پڑے گی یہی حال جاہ کا ہے۔ اپنے شہر میں اس کی عزت ہے مگر ابھی تسکین نہیں ہوتی دوسرے شہروں میں نام آوری اسے بے چین رکھتی ہے حتیٰ کہ ان ملکوں میں جہاں شاید زندگی میں کبھی جانا بھی نصیب نہ ہو، جہاں کے بسنے والوں سے کبھی ملاقات کا امکان بھی نہ ہو وہاں بھی اپنا نام پہنچانا پسند کرتا ہے۔ اس کے بظاہر دو سبب معلوم ہوتے ہیں۔

پہلا سبب مال جمع کرنے کا یہ ہے کہ انسان کی امیدیں طویل ہو جاتی ہیں، وہ لمبی عمر کی توقع اور امید رکھتا ہے اور اس صورت میں اسے ہر وقت یہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں اس کا سارا جمع شدہ مال خرچ نہ ہو جائے یا کم نہ ہو جائے یا میری طویل امیدوں اور آرزوؤں کو ناکامی نہ ہو، اس فکر میں وہ حریص ہو جاتا ہے اور اس خطرے کی وجہ سے اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف چھپا رہتا ہے اور یہ خوف اسی وقت دور ہوتا ہے جب وہ اپنے پاس خوب مال دیکھتا ہے اور شب و روز اس میں بڑھوتری بھی دیکھتا ہے۔ یہی حال جاہ کا ہے وہ بلا وجہ غیر ممالک میں جاہ کی طلب نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے ذہن میں فرض کر لیتا ہے کہ شاید مجھے فلاں ملک میں جانا پڑے یا شاید کبھی وہاں کے لوگ اپنے ملک آئیں یا کہیں ملاقات ہو، تو اس وقت میری جاہ کی وجہ سے ہر قسم کی منفعت ان لوگوں سے حاصل ہو سکے گی جن کے دلوں

میں دنیا کی محبت پہلے سے بیٹھی ہوگی۔ دوسرے سبب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان جہاں بہت سی صفات اپنے اندر چاہتا ہے ایک صفت ربوبیت بھی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کا مربی بن کر رہے اور دوسرے اس کے محتاج اور دست نگر ہوں۔ اس صفت ربوبیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو بلند اور منفرد رکھنا چاہتا ہے۔ اسی بنا پر بعض دانشمندوں نے کہا ہے کہ ہر انسان میں طبعاً وہ بات موجود ہوتی ہے جس کی تصریح فرعون نے اپنے الفاظ انا ربکم الاعلیٰ (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں)۔ میں کی تھی اور انسان کا اپنے اندر اس صفت اور اس کمال کو پیدا کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کی ہر چیز پر تمام مخلوق پر غالب اور حاوی رہنا چاہتا ہے تاکہ جس پر چاہے وہ اثر انداز ہو سکے، جس پر چاہے اپنا حکم چلا سکے، وہ ہر مجسم چیز انسان، حیوان، سونا، چاندی پر اپنا قابو چاہتا ہے اور غیر مجسم یعنی لوگوں کے قلوب، نفوس، جذبات، احساسات پر بھی اپنا اثر رکھنا چاہتا ہے تاکہ جاہ حاصل رہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ انسان مال و جاہ پر قدرت اور قبضہ صرف اس لیے چاہتا ہے کہ اس قدرت سے ایک صفت یعنی ربوبیت کو تسکین ملتی ہے۔

نفس کو اپنی تعریف سے لذت اور برائی سے نفرت حاصل ہوتی ہے

تعریف کرنے سے انسان کو اپنے کمال کا احساس ہوتا ہے، جس قدر تعریف کرنے والا ذی حیثیت ہوگا اسی قدر اس کی تعریف سے لذت اور خوشی حاصل ہوگی، تعریف کرنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ تعریف کرنے والے کا دل اس کے لیے مسخر ہو چکا ہے اور دل کی ملکیت آدمی کو بہر حال پسند ہے، بڑے آدمی کی تعریف سے یہ امید بھی رہتی ہے کہ بڑے سے بڑا کام اور مقصد پورا ہوگا، پھر کسی کی تعریف سے سننے والوں کے دل بھی ممدوح کی طرف مائل ہوتے ہیں، اس احساس سے بھی خوشی ہوتی ہے۔ اسی لیے جتنے بڑے مجمع میں تعریف ہوتی ہے اتنی ہی خوشی ہوتی ہے۔ پھر تعریف اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ جس کی

تعریف کی جا رہی ہے وہ صاحبِ عظمت اور صاحبِ کمال آدمی ہے، اگر وہ دل کے تقاضے سے تعریف کر رہا ہے تو سننے والے کو خوشی ہوتی ہے کہ تعریف کرنے والے کا دل اس کی طرف مائل ہے اور اگر کسی دباؤ میں آ کر تعریف کر رہا ہے تو یہ خوشی ہوتی ہے کہ تعریف کرنے والا اس کے دباؤ اور اثر میں ہے، اس کے مقابلے میں ہجو اور برائی نفس کو شاق گزرتی ہے چونکہ نفس کو اپنے نقصان اور کمی کا احساس ہونے لگتا ہے اور کوئی برائی کرتا ہے تو نفس اس پر باخبر ہونے لگتا ہے اس لیے اسے افسوس ہوتا ہے، اس وقت بھی جس قدر بڑا آدمی ہجو کرے گا اسی قدر نفس کو احساس ہوگا۔ پھر ہجو کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دل جو اب تک قابو میں تھا وہ قابو سے نکل گیا ہے اور ظاہر ہے کسی دل کا قبضے سے نکل جانا اور نگاہ سے گر جانا بڑا نقصان کا معاملہ ہے۔

جب دل پر جاہ کی محبت اور طلب غالب ہوتی ہے تو انسان لوگوں میں گھل مل کر رہنا چاہتا ہے۔ اپنے اقوال و افعال میں ان کی پسند ناپسند کا خیال رکھتا ہے۔ یہیں سے نفاق شروع ہوتا ہے، ریاکاری شروع ہوتی ہے، دلوں کو اپنی طرف پھیرنے کے لیے ممنوع اور بری چیزوں کا ارتکاب کرتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ایسا انسان غور کرے کہ عوام کی محبت و نفرت کا کیا اعتبار۔ ذرا سی دیر میں خوش ہیں، تعریف کر رہے ہیں اور ان کی مرضی کے خلاف کچھ ہو جائے تو برائی کرنے لگیں گے اس لیے ایسی عزت حاصل کرنے کے لیے ادھیڑ بن میں کیا لگنا اور اپنے ضمیر نیز اعلیٰ مقاصد، خوبی اور اچھائی کو چھوڑ کر لوگوں کی مرضی کے مطابق کہاں تک اور کیوں چلے، اس لیے جو چیز اچھی ہو، خدا اور خدا کی مخلوق کے لیے ہو وہی کرے خواہ لوگ تعریف کریں یا برا جانیں، اپنے ضمیر اور صداقت کو ملحوظ رکھے۔ پھر جس جگہ شہرت ہو چکی ہو وہاں سے چلا جائے اگرچہ یہ نفس پر شاق گزرے گا مگر یہی اس کا علاج بھی ہے۔ طمع کو دل سے ختم کر دے، ذکر و فکر، عبادت و ریاضت میں اس کا خیال رکھے کہ لوگ بالکل مطلع نہ ہوں۔

تعریف سے بے نیاز کیونکر ہو

تعریف کی لالچ اور ہجو کے خوف میں اکثر لوگ برباد ہو گئے ہیں اس لیے تعریف کرنے والے کے حالات پر ذرا غور کرے تو اس کیفیت کا علاج ممکن ہے۔ تعریف کرنے والا یا تو مال کے لالچ میں تعریف کر رہا ہے یا طاقت اور حسن سے مرعوب ہے، مگر عقل بتاتی ہے کہ یہ چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ آج ہیں کل نہ رہیں گی پھر ان پر تعریف کا کیا اعتبار، اگر تعریف کرنے والا ان اوصاف کا ذکر کر رہا ہے جو ممدوح میں نہیں ہیں تو ان پر خوش ہونا خالی، دیوانہ پن ہے بلکہ اس وقت اسے غور کرنا چاہیے کہ کاش یہ خوبیاں مجھ میں ہوتیں اور کاش تعریف کرنے والے کو میرے صحیح حالات کا علم ہو جاتا تو کبھی وہ دھوکے میں نہ آتا اور اگر تعریف سے اپنے رعب اور دبدبے کا احساس ہو رہا ہے تو یہی سوچے کہ یہ سب کھیل اور عارضی باتیں ہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ انسان حقیقی کمال حاصل کرے اور تواضع اختیار کرے۔ ان باتوں کے بعد تعریف پر خوش ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اب مذمت کو لیجئے، اس کے اسباب پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مذمت پر افسوس اس لیے ہوتا ہے کہ کسی کے دل سے اس کی عزت، وقار اور قبضہ ختم ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ اب غور کرنا ہے کہ برائی کرنے والا اپنے کہنے میں سچا ہے اور خیر خواہی و نصیحت کے لیے برا کہہ رہا ہے یا سچا تو ہے مگر خیر خواہی نہیں بلکہ تکلیف دینا مقصود ہے۔ تو اگر اس کا مقصد ایذا رسانی ہے تو اس میں خوبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے ایک برائی سے مطلع کر دیا، اس پر تو خوش ہونا چاہیے، برا ماننے کی کیا بات ہے۔ کوشش کرے کہ وہ برائی اپنے اندر سے دور کر لے اور اگر خیر خواہی کے لیے برا کہہ رہا ہے تو اس سے بڑا محسن کون ہو سکتا ہے جو تمہیں تمہاری کمزوریوں پر مطلع کرے اور اگر برا کہنے والا اپنے کہنے میں جھوٹا ہے وہ برائیاں تم میں نہیں ہیں تو بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ برائی تمہارے اندر نہیں ہے اب کوئی نادان بلاوجہ برا کہے تو ایک بار اسے روک دو، نصیحت کر دو، پھر چھوڑ دو کہنے دو۔ اور یہ دیکھو کہ جو برائی وہ بیان کر رہا ہے وہ تو

جھوٹ ہے کوشش یہ کرنی ہے کہ کوئی بھی عیب نہ رہے تاکہ سارے الزام جھوٹے ہو جائیں۔

تعریف اور برائی میں لوگوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں

تعریف سے بعض لوگ خوش ہوتے ہیں، برائی سے ناراض ہوتے ہیں، دل میں کینہ رکھتے ہیں، انتقام اور بدلے کی بات سوچتے ہیں۔ یہ لوگ بری فطرت کے ہیں، بعض وہ ہیں جن کو مذمت اور تعریف کا احساس تو ہوتا ہے مگر اس کا اظہار نہیں ہونے دیتے۔ ایسے لوگ نسبتاً بہتر ہیں اور بعض وہ لوگ جن کی نگاہ میں مدح و ذم دونوں برابر ہیں، نہ تعریف سے خوش ہوتے ہیں نہ مذمت سے رنجیدہ، یہ بلند درجہ ہے، اس مقام پر پہنچ کر انسان کو تھوڑا سا محاسبہ نفس کرنا چاہیے۔ تعریف کرنے والا اور مذمت کرنے والا اس کی نگاہ میں برابر ہے یا نہیں؟ ایسا تو نہیں کہ تعریف کرنے والا اسے محبوب ہو اور مذمت کرنے والے سے نفرت ہو۔ غور کرے کہ اگر تعریف کرنے والا مجلس سے اٹھ کر چلا جائے تو اسے دکھ تو نہیں ہوتا اور مذمت کرنے والے کے جانے سے خوشی تو نہیں ہوتی۔ اور تعریف کرنے والے کے رنج و مصیبت پر بہ نسبت مذمت کرنے والے کے زیادہ غم نہ ہو۔ یعنی جس طرح تعریف کرنے والے کی مصیبت پر رنج ہوتا ہو اس مقدار میں مذمت کرنے والے کی مصیبت پر رنجیدہ ہو کیونکہ دونوں اس کی نگاہ میں برابر ہیں۔ یا تعریف کرنے والا خطا کرے تو کم احساس ہوتا ہو اور مذمت کرنے والے کی ذرا سی خطا پہاڑ معلوم ہوتی ہو۔ اگر یہ معیار پیدا ہو گیا ہے تو انسان کو بلندی حاصل ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرے کہ جب اس نے میری مذمت کی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذمت کرنا اس کی عادت ہے تو میرے علاوہ دوسروں کو بھی مذمت کرتا ہوگا پھر اگر مجھے دوسرے کی مذمت پر افسوس نہیں ہوتا اپنی ہی مذمت پر افسوس ہوتا ہے تو بڑی خود غرضی ہے۔ تعریف کرنے والے کو تو برا سمجھنا چاہیے اور مذمت کرنے والے سے خوش ہونا چاہیے کیونکہ تعریف والا فریب نفس میں مبتلا کر رہا ہے اور مذمت کرنے والا ہماری غلطیوں پر مطلع کر رہا ہے۔

ریاکاری

کوئی نیک اور بھلا کام دکھاوے یا لوگوں کے لیے نہیں کرنا چاہیے۔ نیک کام کا کرنا خود ایک انعام ہے، اس کو لوگوں کی خوشنودی کے لیے کرنا یا لوگوں کے خوف سے چھوڑ دینا نہایت کم عقلی کی بات ہوگی۔ ریا میں چار چیزیں ہوتی ہیں۔ ریا کاری، جس کے لیے ریا کی جائے یعنی عام مخلوق، جو چیز دکھلائی جائے یعنی اچھی خصلت اور خود ریا کار یعنی ان خصلتوں کا اظہار اب ریا کاری عموماً پانچ چیزوں سے ہوسکتی ہے۔ ہیئت، قول، عمل، ساتھی دوست اور خارجی اسباب وسامان چہرے پر زردی ظاہر کرنا۔ بدن کو کمزور رکھنا، آنکھ اور پیٹ اندر کو دھنسا ہوئے رکھنا۔ یہ سب جسمانی ریا کاری ہے گویا جسم خوف خدا سے کمزور اور پیلا ہو رہا ہے، اسی طرح بال بکھرائے رکھنا، پیوند لگانا، صوفیوں والا رنگین ڈھیلا ڈھالا لباس پہننا سب شامل ہے اور لفاظی اشعار وغیرہ کے ساتھ وعظ کرنا، تاریخی واقعات کا حفظ کرنا کہ لوگوں میں بڑا سمجھا جاؤں، لوگوں کے سامنے ہونٹ ہلاتے رہنا کہ ہر دم اللہ اللہ کرتا ہے، جگہ جگہ سختی سے نیک باتوں کا حکم دینا یا برائی سے روکنا یہ سب اقوال کی ریا کاری ہے، اس بات کا خواہش مند ہونا کہ زیادہ لوگ مجھ سے ملنے آئیں تاکہ میں مرجع عام وخاص سمجھا جاؤں، دوستوں میں بڑے بڑے شہروں کا، وہاں اپنی خاطر مدارات کا ذکر کرنا، بڑے لوگوں سے اپنی نسبت جوڑنا، یہ سب ریا کاری ہے۔ بعض لوگ عوام کے دل میں قدر ومنزلت بڑھانے کے لیے صومعہ یا معبد میں جا بیٹھتے ہیں۔

ریا کا علاج

ریا کاری یا تو تعریف کی لذت کی وجہ سے ہوتی ہے، یا مذمت کے خوف سے یا لوگوں کی چیزوں کی لالچ کی وجہ سے۔ مثلاً کوئی بخیل شخص سخی لوگوں میں جا بیٹھا۔ وہاں سخی لوگوں نے کچھ لوگوں کی مدد کی۔ جب اس بخیل کا نمبر آیا تو لوگوں کے طعنے کے ڈر سے اس نے بھی کچھ دے دیا۔ اسے معلوم ہے کہ ان سخی لوگوں میں اس کی تعریف کوئی نہیں کرے گا اس لیے تعریف کی لذت کی طرف سے تو صبر کرلیا۔ ہاں مذمت کا خوف سوار ہے۔ یہی

مذمت کا خوف ہوتا ہے جو بعض بے علم قسم کے لوگ ہر مسئلے میں بولتے ہیں کیونکہ خاموش رہنے میں ان کو اپنی جمی جمائی ساکھ بگڑنے کا خوف ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر اس بات کا صحیح اندازہ ہو جائے کہ یہ وقتی بات ہے اور وقتی لذت ہے ورنہ آخر کار ان باتوں کا نتیجہ برا ہوتا ہے، تو ریا کار کبھی ہمت دکھا دے کی نہ کرے گا یا بندوں سے طمع کرنے والا ان کے لیے ریا کاری کرنے والا اس بات کا خیال کرے کہ بندوں سے لالچ رکھنا، ان کی خوشامد، ان کا احسان لینا، ان کی نظروں میں ذلیل ہونا بڑی ہی حقارت کی بات ہے جب کہ دینے اور نہ دینے کا معاملہ بندوں کا نہیں ہے، خدا جسے چاہے اسے ہی ملے گا۔ اگر اس طرح غور و فکر کرتا رہے گا تو ضرور اس کی سمجھ میں بات آ جائے گی۔ انسان کو چاہیے کہ ہر نیک کام اور اچھی بات اپنے دل، اپنے ضمیر کے لیے کرے، چونکہ اچھے کام اچھے لوگ کرتے ہیں اور اچھے لوگ خدا کے اور اس کے بندوں کے پسندیدہ ہوتے ہیں اس لیے ہمیں اچھے کام کرنے ضروری ہیں، جس طرح آدمی اپنی برائیوں کو چھپاتا ہے ایسے ہی نیکیوں کو چھپانا چاہیے۔ بعض لوگ اپنے علاوہ سب کو برا سمجھتے ہیں اور صاف صاف بیان کرتے ہیں، یہ بھی خواہ مخواہ اپنی نیکی کو ظاہر کرنا ہے۔

اظہار نیکی

ریا کے خوف سے جہاں عبادت اور نیکی کا چھپانا ضروری ہے، بعض اوقات نیکیوں اور اچھائیوں کا اظہار بھی ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً لوگوں کو کسی اچھی بات پر آمادہ کرنے کے لیے بعض اوقات ضروری ہوتا ہے کہ سب کے سامنے نیک کام کیا جائے تا کہ ان کو بھی ترغیب ہو اور وہ بھی حصہ لیں۔ مگر ایسے وقت میں اپنے آپ کو بہت سنبھالنے کی ضرورت ہو گی کہ نیت و ارادہ یہی رہے، اگر اس کے ساتھ ہی اظہار اور ریا کا خیال آ جائے تو پھر خفیہ رکھنا ہی بہتر ہے۔

بعض لوگ مجمع میں لوگوں کے سامنے کسی اچھے کام کے لیے پیسے وغیرہ دیتے ہیں، ان کے دل میں یہی خیال رہتا ہے کہ یہ کام خدا کے بندوں کے لیے مفید ہے اس لیے

اس میں جس قدر مدد ہو سکے بہتر ہے۔ پھر ان کو دیکھ کر دوسروں کو شوق ہوتا ہے، اسی لیے اگر اپنے حلقے کا بااثر اور ذمہ دار فرد ہے جس کی بات اور جس کے عمل کو لوگ مانتے ہیں، تو اس کا اظہار اور بھی مفید ہوگا، اور اصل یہ ہے کہ ریا کا خیال بھی دل میں نہ ہونا چاہیے، ورنہ تو خفیہ اور ظاہر دونوں بیکار ہے۔ دراصل ریا کو سمجھنا بہت دشوار معاملہ ہے۔ اس کا امتحان یوں کریں کہ مثلاً کوئی شخص آکر کہہ دے کہ تو جو اس لیے نیک عمل ظاہر کر رہا ہے کہ لوگوں کو ترغیب ہو تو ایک کام یہ کر کہ یہ معاملہ کسی اور کو سونپ دے۔ دوسروں کا عمل دیکھ کر لوگ تقلید کر لیں گے، تو اپنے عمل کو خفیہ طور پر ثواب کے لیے کرے، اب اگر نفس یہ چاہے کہ میں ہی مقتدیٰ بنوں اور میرا ہی عمل لوگوں کے لیے نمونہ بنے تو سمجھ لے کہ یہ نفس کا دھوکا ہے اور اس وقت اگر ظاہر کرے گا تو یہ ریا کاری ہوگی۔ اس طرح عمل کر کے اس کو خود بیان کرنا، کوئی نیک کام کر کے جگہ جگہ زبان سے اس کو ظاہر کرنا یہ بھی برا ہے، اپنے بارے میں خود بڑا بول بولنا بہت لذیذ معلوم ہوتا ہے، ہاں اگر اپنے نفس پر قابو ہے، خلوص کامل ہے، انسان کی تعریف اور مذمت کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور مجلس ایسی ہے کہ بیان کرنے سے لوگوں کو عمل کی طرف رغبت ہوتی ہے تو ایسے وقت میں بیان کرنا ضروری ہے۔ بشرطیکہ نیت صاف اور ارادہ نیک ہو۔ چونکہ طبائع انسانی عموماً کسی کو دیکھ کر کام کرنے کی طرف بہت جلد مائل ہوتی ہیں اس لیے اظہار عمل کا باب بالکل ہی بند نہیں کر دیا گیا ہے۔

تکبر و خود پسندی

تکبر زیادہ تر علم کی وجہ سے آتا ہے، عالم یا کچھ جاننے والا بہت جلد خود کو عام انسانوں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے، اس لیے عالم اور دانشوروں کو بہت احتیاط، تواضع اور اخلاق پیدا کرنے کی ضرورت ہے، ان سے ہر قسم کی خدمت کی امید رکھتا ہے، وہ خود کو مخلوق سے بلند جانتا ہے، حالانکہ علم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے علاوہ سب کو بہتر سمجھے۔ ہر ایک کے ساتھ تواضع اور اخلاق سے پیش آئے۔ بندگی کی شان پیدا ہو، مروت محبت پیدا ہو، دوسری چیز جس سے تکبر پیدا ہوتا ہے وہ انسان کا نیک عمل یا عبادت ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس

بات کا زیادہ خوف ہے کہ کمبل پوش میں تکبر راہ پا جائے اور حریر پوش محفوظ رہے۔ انسان میں اگر تواضع ہے تو یہ اس کی شرافت اور بلندی کی دلیل ہے، اپنے ہاتھ سے اپنا کام یا اپنے گھر کا کام کرنا یہ بھی تواضع ہے، لباس اور وضع قطع کیسی ہی شاہانہ ہو اگر دل نرم اور متواضع ہے تو کوئی برائی نہیں ہے، اسی طرح کھانے پینے سے تواضع کا ثبوت یوں دے کہ جو کچھ اور جیسا میسر آئے بلا تکلف قبول کرلے، طبیعت میں نرم، خلیق، کریم، ملنسار، کشادہ رو رہے۔ متواضع کی شان یہ ہے کہ نہ وہ لوگ کسی شخص اور کسی چیز کو برا سمجھتے ہیں، نہ کسی کو حقارت سے دیکھتے ہیں، کسی کی چیز پر دست درازی نہیں کرتے نہ کسی سے حسد، کینہ، بغض، عداوت اور دشمنی رکھتے ہیں، ہر ایک سے اخلاق و محبت سے پیش آتے ہیں۔

تکبر کا علاج

تکبر سے بچنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرے اور خدا کی معرفت حاصل کرے، اس خود شناسی اور خدا شناسی سے ہی تکبر کے اسباب ختم ہو جائیں گے، جب اسے معلوم ہوگا کہ اس کا نفس کس قدر حقیر و ذلیل اور خطا سے بھرا ہوا ہے تو کسی ظاہری کمال پر تکبر کی جراءت ہی نہ ہوگی بلکہ وہ سمجھے گا کہ ایسے نفس کو سوائے تواضع و انکساری کے کچھ مناسب نہیں ہے۔ اور خدا کو پہچانے گا تو بڑائی، کبر اور عظمت کا مستحق اسی ذات کو سمجھے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کرے کہ ہر انسان سے تواضع اور اخلاق کے ساتھ پیش آئے، خواہ نفس پر کتنا ہی جبر کرنا پڑے۔ جن طبیعتوں میں قدرتاً سرکشی اور طغیان ہوتا ہے ان پر تواضع بہت شاق ہوتا ہے اس لیے انہیں خاص طور پر مشق کی ضرورت ہوتی ہے، کسی عالم کو اپنے علم پر، مالدار کو اپنے مال پر، طاقت ور کو اپنی طاقت پر، عابد کو اپنی عبادت پر، غرض کسی کمال پر کسی کو ناز کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کے باقی رہنے کا سوال نہیں، تو فانی چیزوں پر تکبر کیسا؟۔

صوفیوں کا مغالطہ

صوفیاء کو اکثر مغالطہ اور دھوکا ہوتا ہے، ایک فرقہ حال والوں کا ہے جو اصل صوفیا

کی طرح لباس اور وضع قطع بناتے ہیں، زاگ سنکر ان کو حال آتا ہے، سر نہوڑا کر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہیں، ہوحق کا نعرہ لگاتے ہیں اور خود کو صوفی کہتے ہیں، حالانکہ انسانی اخلاق اور اصلاح باطن میں کورے ہوتے ہیں، جبکہ اس میدان کی بنیادی شرط دل کی صفائی ہے، دل کا کینے، حسد، لالچ، دنیا کی محبت، دوسروں سے نفرت وعداوت وغیرہ سے پاک ہونا ضروری ہے۔ بناوٹی صوفی خدا کے بھی مجرم ہوتے ہیں اور اس زمرے کے اصل لوگوں کو بھی بدنام کرتے ہیں، انھیں میں ایک طبقہ وہ ہے جو علم ومعرفت کا دعوے دار ہے ان کا خیال ہے کہ ہم تمام مقامات کو طے کر چکے ہیں حالانکہ وہ کوئی ٹھوس اور باضابطہ علم نہیں رکھتے بس سُنی سنائی باتوں کو اپنی طرف منسوب کر کے گاتے پھرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جو راز ہمیں مل گیا وہ عوام تو عوام علماء کو بھی نصیب نہیں، ایک گروہ قناعت اور توکل کا دعوے دار ہے۔ وہ جنگل، جنگل، بستی بستی گھومتے ہیں۔ بے زادو توشہ گھومتے ہیں اور اسی کو توکل کہتے ہیں، حالانکہ توکل کا یہ تصور صحیح نہیں ہے

مغالطہ

اسی طرح معرفت کا راستہ طے کرنے والوں کو کبھی کبھی مغالطہ ہو جاتا ہے وہ بعض حجابات ہی کو منزل سمجھتے ہیں، جہاں سے انھیں گزر جانا چاہیے کیونکہ ہر مقام کے بعد دوسرا مقام آتا ہے سب سے پہلا حجاب خدا اور بندے کے درمیان روح یا نفس ہے کیونکہ روح بھی خدا کے انوار میں سے ایک نور ہے جس میں حق کی حقیقت پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے ،صوفی اس حجابِ اوّل روح یا نفس میں اس وقت نہایت درجے کی چمک دیکھتا ہے جب حضرتِ حق کی تجلی سے وہ چمک سامنے آتی ہے جس کے دل پر یہ کیفیت گزرتی ہے اگر وہ دل پر غور کرے تو اس میں جمال کی اس قدر زیادتی پاتا ہے کہ حیران وششدر رہ جاتا ہے، اسی حیرانی میں بعض اوقات انا الحق پکار اُٹھتا ہے کبھی لا الہ میں گم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اگر توفیق الٰہی سے یا پیر اور معلّم کی رہبری سے حجاب دور نہیں ہوتا، آگے راز نہیں کھلتا تو اسی مغالطے میں سرگرداں ہو کر ہلاک ہو جاتا ہے، اور یہ موقع ہے بھی مغالطے کا، کیونکہ اس وقت

تجلی والی شے اور جس چیز پر تجلی پڑ رہی ہے دونوں ایک ہو جاتے ہیں، یعنی خدا اور بندے کے درمیان سے امتیاز من وتو اٹھ جاتا ہے، بعض لوگوں کو اپنے بارے میں نیک اور صالح ہونے کا اس قدر مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کو اچھائی کا حکم دیتے رہتے ہیں اور برائی سے روکتے رہتے ہیں، حالانکہ اکثر معاملات میں وہ اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ خود ان کی اصلاح کی جائے۔ خود کوئی خطا کرتے ہیں اور کوئی ٹوک دے تو ٹوکنے والے کی علمی حیثیت تلاش کرتے ہیں اور غصے میں منہ سے جھاگ اڑاتے ہیں۔ مگر ان تمام باتوں سے کیا حاصل ہے۔ بغیر دل کی اصلاح کے سب بیکار ہے، یہ گمان کہ ظاہری اعمال ہی سب کچھ ہیں ایک موہوم خیال ہے۔ سب سے بڑی چیز دل کا اخلاص ہے۔ اور مخلص وہی ہے جس کا باطن آئینے کی طرح بے داغ ہو۔ اہل علم کو مغالطے سے بہت ہوشیار رہنا چاہیے، محض اصول اخلاق کو جان لینا کوئی بڑائی کی بات نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو۔ فلاح وکامیابی اسی کے لیے ہے جس نے نفس کو سنوار لیا۔ نفس کو سنوارنے کی کوشش یا سنوارنے کے طریقوں کو جان لینا کوئی کامیابی نہیں ہے، انسانوں میں سب سے برا اور بدکار وہ شخص ہے جو عالم بھی ہو اور ساتھ ہی بے عمل یا برا عمل رکھتا ہو۔ اگر عالم یہ دعویٰ کرے کہ اسے خدا اور اس کی تمام صفات کا علم ہے۔ اس کے بعد بھی وہ زندگی میں محتاط نہیں ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے ہرگز خدا کے بارے میں کوئی معرفت یا علم نہیں ہے، محض مغالطہ ہے، دنیا میں اس کی مثال یوں ہے کہ ایک آدمی شیر کا نام، اس کا رنگ، اس کی صورت جاننے کا دعویٰ کرتا ہے پھر بھی اس سے نہیں ڈرتا تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے شیر کو اس کے تمام کمال و صفات کے ساتھ نہیں پہچانا۔ خوف خدا ہی تمام حکمتوں کی اصل اور جڑ ہے۔ کچھ عالم عمل کی بھی کوشش کرتے ہیں مگر دل کو اور ذہن کو وہ بلندی نصیب نہیں ہوتی جو انسانیت، شرافت اور مذہب کی روح ہوتی ہے، چنانچہ وہ تمام برائیاں ان میں پائی جاتی ہیں جو ناپسندیدہ ہیں مثلاً رقابت، حسد، ریا، شہرت کی طلب وغیرہ، ان کو یہ یاد نہیں رہتا کہ خدا صورتوں اور باتوں کو نہیں دیکھتا، وہ دل کے حالات دیکھتا ہے۔ غرض ہر طبقہ مغالطے اور توہمات میں گرفتار ہے

اس لیے حقیقت اور تصنع کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ایک فرقہ وہ ہے جو عالم ہے اور اپنے علم پر عمل کی کوشش کرتا ہے مگر دل کے حالات سے غافل ہے، دل میں برے احوال گزرتے ہیں مگر وہ ان کو اہمیت نہیں دیتا۔ اس سے بڑا خطرہ ہے۔ مثلاً معمولی سی ریاکاری سے عمل سوخت ہو جاتا ہے یا حسد نیکیوں کو اس طرح کھالیتا ہے جیسے آگ لکڑی کو جلا کر ختم کر دیتی ہے، بعض لوگ ظاہری علوم، معاملات، خصوصیات وغیرہ میں ہمہ تن مصروف ہیں، اسے فقہ کا نام دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم دین کے کام میں مصروف ہیں۔ یہ دین کا علم ضرور ہے مگر تمام تر اسی کو مقصد بنالینا، اس کی تحصیل میں باطنی اصلاح سے غافل ہو جانا یہ کس نے بتا دیا ہے، انہوں نے فقہ کا بہت چرچا سنا، بڑے بڑے فقیہہ کی عزت ہوتے دیکھی اس لیے خود بھی اسی پر لگ گئے حالانکہ انہیں یہ حقیقت نہیں معلوم کہ اصل فقہ جو شریعت میں مطلوب ہے وہ کون سی ہے، وہ وہی فقہ ہے جس سے دین میں بصیرت حاصل ہوتی ہے، خدا کی ذات اور اس کی صفات سمجھ میں آتی ہیں، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دل ہمیشہ خدا کے خوف سے لبریز ہو۔ وہ فقہ یہ ہرگز نہیں ہے جس میں مفتی اور فقیہہ الجھے پڑے ہیں، اسی طرح شہر در شہر علم کے پیچھے بھاگتے ہیں، ہر قسم کے مضمون میں گھستے ہیں اور ان تمام کوششوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں فخر سے سر اونچا کر سکیں، اپنے علم پر ناز کر سکیں۔ بعض ایسے بھی لوگ گزرے ہیں کہ وہ علم حاصل کرنے کے لیے بیٹھے، ان کو بتایا گیا:

من حسن اسلام المرء سر که مالا یعینه

(آدمی کے اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور غیر مفید باتوں سے بچے۔)

وہ اتنا سن کر مجلس سے چلے گئے اور کہنے لگے۔ ہمیں اسی قدر تعلیم کافی ہے۔ پہلے اس پر عمل کر لیں، پھر آگے علم حاصل کریں گے۔ غرض علما کے توہمات اور مغالطے کو ایک دفتر چاہیے۔ نمونے کے لیے اتنا کافی ہے۔

جلد چہارم

اسلام کی اخلاقی تعلیمات

صبر وشکر کا بیان

صبر اور یقین دو بڑی عظیم دولت ہیں، جس قوم یا جن افراد کو یہ دولت نصیب ہوگئی ہے وہ کامیاب ہوکر رہے صبر ہی تمام نیکیوں کی اصل اور بہترین تقویٰ ہے۔

انسان میں دو قسم کے داعیے اور تقاضے کی قوت رکھی گئی ہے، ایک تقاضا نیک کام کا، دوسرا خواہشات کی پیروی کا۔ اگر تقاضہ خیر تقاضہ شر کے مقابل ہو اور اس وقت تقاضہ خیر ثابت قدم رہ کر شر کے تقاضوں کو مغلوم کر لے تو یہ بڑی کامیابی ہے اور یہ کامیابی صبر کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ یعنی صبر کا پھل یہ ہوا کہ خیر کا تقاضا شر کے تقاضوں پر غالب رہا، اس لحاظ سے صبر انسان ہی کا خاصہ ہوسکتا ہے۔ جانور اور بہائم اس زمرے سے اس لیے نکل جاتے ہیں کہ ان پر تو صرف شہوات اور خواہشات ہی کا تسلط رہتا ہے، شہوات اور خواہشات سے روکنے والی ان میں کوئی قوت نہیں ہوتی۔ پھر مقابلہ کیسے ہوگا اور صبر کا پتہ کیسے چلے گا۔

انسان بچپن ہی سے خواہشات وشہوات میں گرفتار ہوتا ہے۔ دودھ کی خواہش، سونے کی خواہش، ہاتھ پیر پھینکنے کی خواہش۔ اور بڑا ہوا تو نمکین غذا کی خواہش، کھیل اور کھولنے کی تمنا، اس وقت انسان میں صبر کی دولت نہیں ہوتی، کیونکہ ان قوتوں سے مقابلہ کرنے والی کوئی قوت سامنے نہیں آئی، جیسے جیسے انسان بڑا ہوتا ہے خیر وشر کی قوتوں میں تصادم ہوتا رہتا ہے اور صبر کا سبب پیدا ہوتا جاتا ہے، عقل سلیم اور نور ہدایت کے ذریعے انسان اتنا تو سمجھتا ہے کہ خواہشات کی اتباع کا نتیجہ اس کے حق میں نقصان دہ ہوتا ہے۔ مگر اتنا سمجھ لینا ہی اس کے لیے کافی نہیں جب تک اسے اتنی قدرت نہ ہو کہ جو چیزیں مضر ہیں ان کو چھوڑ بھی دے۔ ان خواہشات کو رفع کرنے کے لیے اسے ایک قوت اور قدرت کی ضرورت ہوتی ہے، خدا کی تائید ونصرت سے انسان کی نیک قوتیں بری خواہشوں کو رفع کرتی رہتی ہیں، کبھی وہ قوت، خواہش کے مقابلے میں کمزور پڑ جاتی ہے اور کبھی غالب رہتی ہے۔ اس کمزوری اور قوت میں انسان کی فطری نیکی وبدی کا بھی دخل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مخلوق میں نور ہدایت مختلف نظر آتا ہے، انسان کا کام یہ ہے کہ برائی اور شر کے تقاضوں کو

رفع کر کے خیر کے تقاضوں کی مدد کرتا رہے۔ یہی صبر ہے۔ اگر برابر جما رہا اور خواہشات کی مخالفت کرتا رہا تو خدا کی تائید اور نصرت حاصل ہوگی اور صبر کی عادت پڑ جائے گی، صابرین میں شمار ہوگا۔ لہٰذا خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا وہ فعل ہے جو صبر سے حاصل ہوتا ہے اور جو صرف انسانوں کی خصوصیت ہے۔

صبر نصف ایمان ہے

ایمان کے دو رکن ہیں ایک یقین، یقین سے مراد ہے ''دین کے ان اصولوں کی قطعی معرفت'' جو بندوں کو ہدایت کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرا صبر۔ صبر سے مراد ہے اس یقین اور معرفت کے مطابق عمل کرنا مثلاً یقین آدمی کو یہ بتاتا ہے کہ برائی اور گناہ مضر ہے، نیکی اور طاعت مفید، اب نیکی پر عمل کرنا یا برائی سے بچنا۔ بغیر صبر کے ممکن نہیں ہے کیونکہ عمل میں خیر کے تقاضے کو غالب کرنے کی اور شر کے تقاضوں کو مغلوب کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہی صبر ہے اس طرح صبر نصف ایمان ہے۔

صبر کی قسمیں

صبر کی دو قسمیں ہیں اول صبر بدن سے کرنا، اس طرح کہ بدن پر مشقت کا تحمل کیا جائے اور بدن سے صبر کرنے کے دو طریقے ہیں، اول یہ کہ خود کوئی فعل کرے یا دوسرا کوئی فعل کر رہا ہو اس کو برداشت کرے، کوئی مشکل کام کرنا یا سخت عبادت کرنا یہ خود فعل کرنے کی مثال ہے اور کوئی مارے اس کو برداشت کرنا اور کسی مہلک مرض یا زخم کو برداشت کرنا، یہ مثال دوسرے کے فعل کو برداشت کرنے کی ہے۔

تو اول قسم بدن کے صبر کی تھی۔ دوسری قسم اپنے نفس کا صبر ہوتا ہے یعنی نفس کو طبیعت کے مطابق چلنے سے یا خواہشات بد سے روکنا، یہ صبر کا اونچا مقام ہے۔ یہاں صبر کے مختلف نام ہیں۔ اگر طبیعت میں بے حیائی اور بے حجابی کا داعیہ پیدا ہوا اور اس پر صبر کر کے رک گیا تو یہ عفت اور پاکدامنی ہے۔ کسی مصیبت پر صبر کیا تو اس کا صبر ہی ہوگا۔ اس

کی ضد یہ ہے کہ طبیعت کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور وہ خوب چیخے چلائے، اس کا نام جزع فزع ہے۔ اگر مالداری اور تونگری کی حالت میں صبر کیا ہے تو یہ صبر ضبط نفس کہلائے گا۔ اس کی ضد اترانا اور گھمنڈ کرنا ہے، اگر جنگ اور لڑائی میں صبر کیا ہے تو وہ شجاعت ہے جس کی ضد نامردی اور بزدلی کہلائے گی۔ اگر غصہ پینے میں صبر کیا ہے تو یہ علم ہے جس کی ضد غضبنا کی ہے، اگر حالات اور زمانے کی دی ہوئی پریشانیوں پر صبر کیا ہے تو اس کو فراخی حوصلہ کہیں گے۔ اس کی ضد کا نام کم حوصلگی ہے۔ اگر کسی بات کو چھپانے میں صبر کیا ہے تو یہ صبر کرنا راز داری ہے، اگر ضروریات زندگی میں سے تھوڑی چیزوں سے صبر کر لیا ہے تو اس کو قناعت کہیں گے۔ اس کے بمقابل شر اور ہوس ہے۔ خلاصہ یہ کہ اچھے اخلاق اکثر و بیشتر صبر میں داخل ہیں۔ اسی لیے جب حضورؐ سے کسی نے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا صبر۔

قوت اور ضعف کے لحاظ سے صبر کی قسم

کبھی باعث دینی، یعنی تقاضہ، خیر داعیہ شر کو بالکل زیر اور مغلوب کر دیتا ہے کہ اس میں نزاع کی بالکل قوت نہیں رہ جاتی اور یہ بات مسلسل صبر سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسے موقعے پر مَن صبر ظفر (جس نے صبر کیا وہ کامیاب ہو گیا) یہ جملہ بولتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے نیک بندے بن جاتے ہیں، انہیں نفس مطمئنہ حاصل ہو جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ کہ داعیہ شر غالب آجائے اور خیر کے تقاضوں کا اُن سے کوئی جھگڑا ہی نہ رہ جائے۔ اس وقت آدمی خیر سے مانوس ہو جاتا ہے اور غافل ہو جاتا ہے۔ گویا عقل جو معزز شے تھی اس کو نفس کے تابع کر دیا اور ایسا شخص سخت سزا کا مستحق ہے۔ ایک حالت یہ ہے کہ جنگ برابر کی ہو، کبھی تقاضہ خیر کی فتح ہو کبھی داعیہ شر غالب آجائے۔ ایسا شخص مجاہد اور مقابلہ کرنے والا کہا جا سکتا ہے۔ اس کو فاتح نہیں کہہ سکتے۔ ضعف اور قوت کے اعتبار سے یہ تین حالتیں انسان پر آتی ہیں۔ اب جو لوگ خواہشات بد اور تقاضہ شر کے ساتھ مجاہدہ نہیں کر پاتے وہ قطعی جانوروں کی مانند ہیں بلکہ اُن سے بدتر' کیونکہ جانوروں میں تو مجاہدے کی قوت ہی نہیں ہے اور انسان میں یہ قوت ہے مگر وہ اس قوت کو ضائع کر رہا

ہے۔صبر کرنے میں آسانی ہو یا دشواری اس لحاظ سے بھی صبر کی دو قسمیں ہیں۔ایک یہ کہ نفس پر شاق گزرے اور صبر کرنے کے لیے بہت محنت کرنا پڑے اس کو بزور محنت صبر کرنا کہتے ہیں۔دوسرے یہ کہ صبر کرنے میں نفس پر کچھ زور نہ پڑے بلکہ عادت کی طرح انسان صبر کر لے۔یہ اصل صبر ہے۔یہ کام یعنی دوسری صورت اس وقت آسان ہوتی ہے جب انسان نیک راہ اختیار کرے اور صبر کے انجام سے نفع کی امید اور یقین رکھے۔چنانچہ جب مسلسل صبر کرنے کی کوشش کرتا رہے تو صبر میں آسانی ہونے لگتی ہے' پھر اس کے بعد رضا کا درجہ نصیب ہو جاتا ہے۔اسی مرتبے کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔''اللہ کی رضا کے لیے عمل کرو اگر رضا نہ حاصل ہو تو بُرائی پر صبر سے بہت سی بہتری حاصل ہوتی ہے۔''

صبر کرنے والوں کے تین درجے ہوتے ہیں' ایک وہ لوگ ہیں جو بُری خواہشات کو چھوڑ دیتے ہیں' یہ توبہ کرنے والے ہیں۔دوسرے وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ بُرا بھلا پیش آئے اس کو خدا کی طرف سے سمجھ کر اس پر راضی رہتے ہیں۔یہ لوگ زاہد کہلاتے ہیں۔تیسرا درجہ یہ ہے کہ بُرا بھلا جو ان کو پیش آئے اس کو خدا کی طرف سے جائیں اور اس محبت و رغبت کریں۔صدیقین کا مقام بھی یہی ہے۔جس طرح رضا کا مرتبہ صبر کے مرتبے سے اشرف ہے اسی طرح محبت کا مقام رضا سے بھی بلند ہے' اس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے صبر گو عمدہ چیز ہے مگر کہاں عمدہ ہے' کہاں بُری ہے یہ جاننا ضروری ہے' ہر جگہ یہ سمجھنا کہ صبر بہتر صفت ہے لہٰذا اس کو اختیار کرنا ہی چاہیے' غلطی ہوگی۔

صبر کی ضرورت' انسان ہر حال میں صبر کا محتاج ہے

حالات کبھی انسان کی خواہش کے مطابق پیش آتے ہیں' کبھی اس کی مرضی کے خلاف ہوتے ہیں۔بہرحال اُسے دونوں حالتوں میں صبر کرنا پڑتا ہے۔خواہش کے مطابق احوال یہ ہیں مثلاً صحت تندرستی' عزت مال' ہمدردوں کی' دوستوں کی کثرت' اسباب اور عیش دنیا کی فراہمی' ان احوال میں صبر کی سخت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ انسان اگر خود کو نہ روکے گا' لذتوں پر صبر نہ کرے گا تو آخر کو سرکشی پر مجبور ہو جائے گا کیونکہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ

جب اُسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ میں بہت غنی اور مال دار ہوں تو وہ طغیان اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے لوگوں نے کہا ہے کہ عیش و عافیت میں صبر کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ فقر و فاقہ اور مصائب ڈال کر کسی کے صبر کا امتحان لیا جائے تو یہ مشکل نہیں ہے' انسان کسی طرح سہارلے جاتا ہے لیکن عافیت' تونگری اور عیش میں ڈال کر صبر کا امتحان لینا سخت ہوتا ہے کم ہی ہمّت والے سنبھل پاتے ہیں۔ مال و عافیت پر صبر کرنے سے مراد یہی ہے کہ مال خوب جمع کرے یا جمع ہو جائے تو اس کی طرف رغبت نہ کرے۔ انھیں چند روزہ امانت سمجھے کہ یہ چیز میرے پاس چند دن کے لیے آئی ہے چھن بھی سکتی ہے۔ اس لیے ایسی چیز کا جمع کرنا بے معنی ہے۔ اس کو خدا نے دیا ہے تو خدا کے راستے میں حق والوں پر خرچ کرنا چاہیے' مال کا شکر ادا کرے' اس طرح کہ غربا اور ضرورتمندوں کو دے۔ جسم اور صحت کا شکر ادا کرے اس طرح کہ دوسروں کے کام آئے ان کی خدمت کرے۔ یہ ایسا صبر ہے جو شکر سے قریب ہوتا ہے' عافیت پر صبر کرنا اس لیے سخت ہے کہ عافیت اور شکر میں انسان کو قدرت حاصل ہوتی ہے پھر بھی وہ بچتا ہے۔

دوسری وہ حالت ہے کہ حالات انسان کی خواہش کے خلاف ہوں بعض ان میں سے وہ ہیں جو انسان کے اپنے بس میں ہوتے ہیں جیسے عبادت کرنا یا برائی سے بچنا' بعض وہ ہوتے ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے جیسے کسی پر مصائب یا حوادث آ جائیں بعض صورت یہ کہ فتنہ آنا تو اُس کے اختیار میں نہ ہو مگر بعد میں اختیار ہو جائے۔ جیسے کسی موذی سے بدلہ لینا۔ موذی کا مسلّط ہو جانا تو اپنے بس میں نہیں ہے مگر اس سے بدلہ لینا اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر صورت میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً طاعت میں صبر اس لیے ضروری ہے کہ عبادت طبعاً نفس کو ناپسند ہے' اس میں ایک طرح عبودیت اور نیازمندی پائی جاتی ہے جو نفس پر شاق ہے' نفس تو ربوبیت اور بڑائی کو پسند کرتا ہے اور ہر نفس میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ اسی لیے بعض صاحب حال عارف اور صوفی کہا کرتے تھے کہ "کوئی نفس ایسا نہیں ہے جس میں وہ بات نہ ہو جو فرعون میں تھی اور جس نے

اُس سے انا ربکم الاعلیٰ (میں تمہارا بڑا رب ہوں) کہلوالیا تھا بس اُس نے اس کو ظاہر کیا کہ اُس نے اپنی قوم کو ذلیل سمجھا۔ تو قوم نے اس کی اطاعت کر لی بس اس کی ربوبیت کو اظہار کا موقع مل گیا۔ باقی عام انسان کے اندر یہ بات پوشیدہ رہتی ہے۔

عبادت اور اچھے کام پر صبر کرنا یہ ہے کہ نہ عمل کے شروع میں ریا کاری اور کسی لالچ سے عمل کرے نہ درمیان میں کوئی فعل کرے جس سے عمل کے خراب ہونے کا ڈر ہو نہ بعد میں ایسا کوئی کام کرے یعنی عمل کا اظہار نہ کرے راز افشانہ کرے۔

اسی طرح معاصی اور خطاؤں میں صبر ہوتا ہے۔ صبر کی قسموں میں زیادہ شدید اُن معاصی پر صبر کرنا ہے جو عادت کی وجہ سے مالوف ہو گئے ہوں۔ اب اگر وہ گناہ یا معاصی ایسے افعال میں سے ہیں جن کے کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی آسانی سے ہو جاتے ہیں تو اُن پر صبر کرنا بہت ہی دشوار ہے جیسے زبان کے گناہ جھوٹ غیبت لڑائی وغیرہ یا اشارتاً وصراحتاً اپنے نفس کی تعریف سے رک جانا یا لوگوں پر اعتراض سے صبر کرنا۔ غرض ان سب سے صبر کرنا بہت دشوار ہے۔ لوگ ان باتوں کو بُرا نہیں سمجھتے ہیں نہ دلوں میں ان باتوں کی کوئی قباحت باقی ہے اس لیے ان پر صبر اور ان سے رکنا بھی مشکل امر ہے۔ دوسری صورت وہ افعال جن کا آنا اپنے اختیار میں نہ ہو مگر ان کا دفع کرنا اپنے اختیار میں ہے مثلاً کسی نے قول یا فعل سے ایذا دی مگر اس کا بدلہ نہ لیا جائے یہ مضبوط ایمان کی دلیل ہے۔ پہلے ایمان دار کے ایمان کا معیار یہی سمجھا جاتا تھا کہ لوگ ایذا پر کہاں تک صبر کرتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ نہ مصیبت کا آنا اپنے اختیار میں ہو نہ اس کا رفع کرنا اختیار میں وہاں صبر کرنا اعلیٰ درجہ ہے جیسے کسی عزیز کا جانا مال کا تلف اور برباد ہو جانا۔ اس قسم کی مصیبتوں پر صبر کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مصیبت میں آدمی کے دل میں ناگواری اور پریشانی ہوئی تو یہ مقام نہ ملے گا! کیونکہ مصیبت میں غم اور پریشانی کا ہونا اپنے اختیار سے باہر ہے۔ یہاں یہ مطلب ہے کہ ہاتھ پیر سے زبان سے اظہار نہ کرے۔ جزع فزع سے بچے بال نوچنا سر پٹکنا شکوہ شکایت کرنا چھوڑ دے رکھے جو روزانہ کے معمولات ہوں

ان میں فرق نہ آنے دے۔ بس اس قدر کافی ہے' ورنہ دل پر کسے اختیار ہے' صبر کا تقاضا بھی بس اتنا ہے کہ اس کا اظہار نہ ہو' ورنہ دل میں ملال رکھنے یا آنسو بہانے سے صبر سے نہیں نکلتا۔ ایک شخص جو مصیبتوں اور پریشانیوں سے دورہ کر دینا چھوڑ کر اپنی دینا میں مست ہے اور اس طرح صبر کیے ہوئے ہے' اس کا درجہ کچھ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ بڑا اور عظیم مقام یہ ہے کہ آدمی اُلجھنوں' پریشانیوں میں رہے نیز خدا اور اُس کی مخلوق کے لیے ہر اُس جگہ جائے جہاں پریشانیوں اور لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی کا سامان ہو اور اُس کے باوجود وہ صبر کرتا ہو' صبر میں انسان کو جو ثواب ملتا ہے اس کا دھیان رکھے تو صبر کی پریشانی کا بہت حد تک ازالہ ہو جاتا ہے۔ فتح موصلیؒ کی بیوی کا ناخن کسی صدمے سے ٹوٹ گیا' وہ مسکرا پڑیں' لوگوں نے پوچھا تو کہا اس تکلیف پر جو اجر ملے گا اُس کے خیال نے تکلیف کا خیال دل سے نکال دیا۔ خدا کی تعظیم اور اس کی پہچان کی دلیل ہی یہ ہے کہ انسان درد کا شکوہ نہ کرے' نہ مصائب کا ذکر کرے یہ کون سی دوستی اور وفاداری ہے کہ دوست کی طرف سے ملی ہوئی کسی تکلیف کا بھی دوسروں سے شکوہ کیا جائے۔ یہ تو دوست کا اور اس کی دوستی کا مذاق اڑانا ہے۔

صبر کا علاج

صبر کا علاج اس بات کے علم سے ہو سکتا ہے کہ جس نے مصیبت ڈالی ہے وہی اس کا علاج کرتا بھی ہے۔ مثلاً نفس اگر برائی کا تقاضا کرتا ہے۔ تو علم سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ انسان جب طرح طرح کی نعمتیں کھاتا ہے' مقوی غذائیں خوب پیٹ بھر کر کھاتا ہے تو برائی کی طرف داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر نگاہ کو آزاد چھوڑنے' ہر بری بھلی چیز کو تاکنے جھانکنے سے اس میں تقویت ہوتی ہے اور اس کے بعد نفس کو آزاد چھوڑنے سے برے افعال صادر ہوتے ہیں۔ اب اس علم کے بعد اس کا علاج آسان ہو جاتا ہے کہ کھانا' پینا' زندگی کی بقا اور عبادت پر مستعد رہنے کے لیے کھائے' پیٹ زیادہ نہ بھرے کہ نفس سرکشی کرے۔ پھر نگاہ و دل کو پاک رکھے۔ چونکہ بنیادی بات اس میں کھانے کا معاملہ ہے اس لیے اس پر توجہ دے۔ جب آدمی کم خوری سے ہمہ وقت نفس میں ضعف محسوس کرے

گا تو گناہ کی طرف ذہن کم جائے گا۔جنگل کے خوف ناک درندوں کو قابو میں رکھنے کے لیے انھیں ہمیشہ بھوکا رکھا جاتا ہے۔یہی حال نفس کا ہے اور اگر اس بات پر قادر ہو کہ سادی غذا کھائے تو بہت مفید ہے۔جن چیزوں سے جذبات میں ہیجان برپا ہوں گوشت' شراب وغیرہ ان سے حتی الامکان بچے۔

نگاہ و دل کی پاکیزگی کا لحاظ رکھے۔صبر اور عموماً ہر عادت کو بدلنے یا نئی بات کی عادت ڈالنے کے لیے بہ تکلف کوشش کرنی پڑتی ہے۔پرانی باتوں اور ان سے متعلق تمام باتوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔یہاں تک کہ نئے افعال طبیعت میں جم جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ عادت بن جاتے ہیں' جو چیز پہلے محبوب ہوتی ہے وہاب مبغوض ہو جاتی ہے۔اس لیے خواہشات بد اور نفسانی شرارتوں کے لیے جو محرکات ہوں اُن سے بچتے رہنا چاہیے' انسان کے اندر اس کے نیک اور خیر کے احساسات کو جبھی تقویت ہوتی ہے جب نفس کو مجاہدے کا پابند بنایا جائے' نیکی اور شرافت کا بدلہ اور انعام یاد دلایا جائے۔آہستہ آہستہ عادت ڈالی جائے کہ انسان کے اندر باعث دینی باعث ہویٰ و ہوس کو شکست دے سکے۔محنت شرط ہے پھر عادت پڑنے پر یہ کام آسان ہو جاتا ہے' انسان کا نفس تو ہر وقت دنیا اور اس کے مخمصے میں اُلجھا اور مشغول رہتا ہے' اس کے مقابلے میں ایک دوسری سلطنت ہے' زہد اور خیر کی سلطنت یہی زیادہ صحیح' پائیدار اور مضبوط سلطنت ہے۔زہد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے غضب اور خواہش کا مالک ہو جائے اور یہی اصل سلطنت ہے کہ انسان ان دو باغی قوتوں کو زیر کرے اور خود ان سے آزاد ہو جائے' ان دونوں کا غالب رہنا اصل غلامی ہے۔

شکر

منعم کی نعمت پر شکر کرنا بہت بڑی شرافت بھی ہے اور نعمت کی زیادتی کا ذریعہ بھی۔شکر سلوک کی منزل میں سے ہے جو علم' احوال اور عمل سے مرکب ہے' جب کوئی نعمت ملے تو تین باتوں کا دھیان اور علم ضروری ہے۔ایک تو اس نعمت کو جانے۔دوسرے یہ جاننا کہ یہ نعمت واقعی میرے حق میں نعمت ہے تیسرے انعام دینے والے کا اور اُس کی صفات

کا جاننا ضروری ہے' یعنی خدا کی نعمت پر یہ خیال کرے کہ اصل مُنعم وہی ذات ہے' درمیان کے سارے ذرائع اس کے حکم کے تابع ہیں۔ اگر صحیح معنوں میں دل اس صفت کو مضبوط طریقے پر مان لے کہ اصل نعمت دینے والی وہی ایک ذات ہے تو یہ خدا کو واحد یعنی ایک ماننے اور اس کو پاک ماننے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مگر اصل انعام دینے والی ذات خدا کو ماننا صرف زبان سے ہوگا تو بے اثر ہے' دل سے بھی یہی اعتقاد اور یقین رکھے۔ اگر کسی شخص کو بادشاہ نے کوئی انعام دیا' وہ شخص جانے کہ اس انعام دینے میں بادشاہ کا وکیل یا وزیر شریک ہے تو صحیح طور پر انعام دینے والا اُس نے بادشاہ کو نہیں سمجھا بلکہ بادشاہ کے ساتھ اُس نے دوسروں کو شریک کر لیا اس وقت وہ پوری طرح سے تنہا بادشاہ کا شکر گزار نہ ہوگا بلکہ اس کی شکر گزاری کا احساس دوسروں میں تقسیم ہو جائے اور اگر صرف بادشاہ کو منعم جانے گا تو کمال شکر میں کوئی نقصان نہ ہوگا یہاں یہ بات سوچے کہ بادشاہ نے انعام کا حکم قلم سے کاغذ پر لکھا ہے تو وہ قلم اور کاغذ کا اس انعام دینے میں کوئی دخل نہیں ہے' یہ دونوں تو بادشاہ اور اس کے حکم کے تابع ہیں۔ یہی حیثیت وکیل اور وزیر کی بھی تو ہے۔ ایسے ہی خدا کو فاعل مختار جانے' باقی ذرائع اور وسائل تو صرف اس کے تابع ہیں' جن سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے خود ان وسیلوں اور ذریعوں کو انعام دینے یا روکنے میں کیا دخل ہے! انسان جب یہ جان لے گا تو ایک موحد کی طرح شکر ادا کرے گا۔ یہ تو شکر میں علم کا درجہ تھا۔ جب یہ علم و معرفت نعمت کے بارے میں حاصل ہو جائے گی تو دوسری شق یعنی حال شروع ہوگا۔ حال کا مطلب یہ ہے کہ نعمت پر نعمت دینے والے سے خوش ہونے کا حال۔ مگر یہ انعام دینے والے سے۔ خوشی جبھی حاصل ہوتی ہے جب انعام پانے والا انعام ہی میں نہ کھو جائے بلکہ منعم کی طرف توجہ رکھے' اس میں یہ چند صورتیں بنتی ہیں مثلاً۔

ایک بادشاہ سفر میں جا رہا ہے۔ اُس نے کسی کو ایک گھوڑا انعام دیا۔ اب انعام پانے والے کی خوشی تین طرح کی ہو سکتی ہے۔ وہ گھوڑا پانے سے خوش ہوا ہو کہ بڑا تندرست' اصیل' خوبصورت گھوڑا ملا ہے' یہ خوشی اس شخص کو ہوگی جسے بادشاہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ

صرف انعام ہی میں مست ہے۔ حتیٰ کہ یہی گھوڑا اگر اس کو جنگل میں مل جاتا تو وہ اتنا ہی خوش ہوتا۔ یا وہ گھوڑا پانے سے خوش نہیں ہوا بلکہ اس خیال سے خوش ہوا کہ بادشاہ نے گھوڑا عنایت فرمایا جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بادشاہ کے دل میں اس کا خیال اور جگہ ہے جو آیندہ بڑے انعام اور سرفرازی کا سبب ہو سکتا ہے۔ ایسے شخص کو اگر گھوڑا جنگل میں یا کسی اور شخص سے مل جاتا تو اُسے خوشی نہ ہوتی، کیونکہ گھوڑا ملنے سے اُسے خوشی نہیں ہوئی ہے اسے تو خوشی بادشاہ سے انعام پانے کی ہے اور وہ بات جنگل سے یا کسی اور شخص سے گھوڑا پانے میں حاصل نہ ہوتی۔ تیسری صورت یہ ہے کہ گھوڑا پانے کی خوشی تو ہے مگر خوشی اس خیال سے ہے کہ اب اس گھوڑے پر سوار ہو کر بادشاہ کے پاس جایا کروں گا اس کی خدمت کروں گا ممکن ہے وزارت کا مستحق قرار دیا جاؤں۔ یعنی بادشاہ کے دل میں اپنے خیال اور اپنی طرف توجہ ہی کو کافی نہ سمجھے بلکہ بادشاہ کے قریب رہ کر جو عہدہ ملنے والا ہے اس کے خیال سے خوش ہو۔ مگر اس عہدے سے خوشی صرف اس لیے ہے کہ اس طرح بادشاہ کی قربت اور اُس کا دیدار نصیب رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایسے شخص سے کہا جائے کہ تم کو وزارت کا عہدہ تو نہیں ملے گا ہاں قربت ملے گی تب بھی وہ اس پیشکش کو قبول کر لے گا۔

ان تینوں صورتوں میں سے اول صورت تو شکر کی نہیں ہے کیونکہ اس میں انعام دینے والے کا تصور ہی نہیں ہے صرف انعام کی خوشی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو منعم کی طرف سے بے نیاز انعام پر اس لیے خوش ہوتے ہیں کہ انعام ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق مل گیا۔ یہ لوگ شکر سے بہت دور ہیں اور درجہ دوم بھی اگرچہ شکر کے تحت آتا ہے اور اس کی خوشی منعم کے ساتھ ہوتی ہے مگر یہ تعلق منعم کی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ منعم سے جس انعام کی انھیں امید ہے وہ پیش نظر ہوتی ہے اور مکمل شکر وہی ہے جہاں بندے کی خوشی اللہ کی نعمت پر اس نظر سے ہو کہ اس نعمت کی وجہ سے خدا کا تقرب حاصل ہو سکتا ہے اور اس طرح اس کا دیدار برابر حاصل ہو سکتا ہے۔ جو خدا سے قریب کرنے والا ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں اور دنیا میں مشغول کر دینے والے خدا سے غافل کرنے والے انعام کے ملنے سے وہ لوگ

رنجیدہ ہوتے ہیں' حضرت شبلیؒ فرمایا کرتے تھے ''شکر سے غرض دیدار منعم ہے' دیدار نعمت نہیں ہے۔'' عوام' شکم ودہان وجسم ہی تک رہتے ہیں اس لیے وہ کھانے پینے پہننے ہی پر شکر کرتے ہیں' اور خواص دلوں کے احوال پر نظر رکھتے ہیں' اس لیے دل کی صحت اور قلوب کی تندرستی پر شکر کرتے ہیں۔

اب تیسرا مرتبہ عمل کا آتا ہے۔ انعام ملنے کے بعد اور منعم حقیقی کو جان لینے کے بعد اس کو جو خوشی ہوئی ہے' چاہیے کہ عمل کے ذریعے اس پر شکر کا اظہار کرے۔ یہ عمل' قلب' زبان اور اعضا تینوں طریقوں سے ہوتا ہے۔ قلب کا عمل یہ ہے کہ اچھے کاموں کا ارادہ کرے۔ تمام انسانوں اور دوسری تمام مخلوق کے لیے خدمت اور ہمدردی کا جذبہ رکھے' زبان کا عمل یہ کہ لفظوں سے خدا کا شکر ادا کرے اور اعضا کا عمل یہ ہے کہ ناپسندیدہ اور برے کاموں سے ہاتھ پیر آنکھ کان کو بچائے۔ اچھے اور پسندیدہ کاموں کی طرف جلدی کرے۔

خدا کے معاملے میں شکر کا کیا مطلب ہے

کسی کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ شکر تو منعم کی موجودگی میں ہوسکتا ہے جہاں منعم کو اُس شکر سے کچھ فائدہ بھی پہنچے۔ مثلاً بادشاہوں کا شکر ہم کئی طرح سے کرتے ہیں اور ہر ایک میں بادشاہ کا کچھ مطلب اور فائدہ ہوتا ہے۔ ایک طریقہ شکر کا یہ ہے کہ ہم بادشاہ کی تعریف کریں' تو اس میں ان کا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگوں میں اُن کا کرم مشہور ہوگا۔ دلوں میں جگہ ہوگی اور اگر بادشاہ کی خدمت کرکے اس کا شکر کریں تو ظاہر ہے بادشاہ کی خدمت ہوتی ہے' یہی غرض پوری ہوتی ہے اور اگر ہاتھ جوڑ کر بادشاہ کے سامنے ادب سے کھڑے ہوکر شکر کریں تو اس میں بادشاہ کا جاہ ومرتبہ بڑھتا ہے' یہی فائدہ ہے۔ غرض کہ شکر کے سبب کوئی نہ کوئی فائدہ منعم کو پہنچتا ہے مگر خدا کے بارے میں تو اس قسم کی کوئی بات نہیں چل سکتی۔ خدا کو تو بندوں سے اس قسم کی کوئی غرض نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی غور کیجیے۔ خدا نے ایک انعام دیا۔ ایک تو اس کا کرم یہ ہے' پھر اس انعام پر اگر شکر کی توفیق ہوئی' بندے نے شکر کیا تو یہ توفیق

دینا بھی تو خدا کا ایک کرم اور اُس کی طرف سے نعمت ہے۔تو اس دوسرے کرم اور دوسری بارِ نعمت پر بھی تو شکر کرنا ہوگا۔کسی نے دوبارہ بھی شکر ادا کر دیا تب بھی تو ہم وہی بات کہیں گے جو پہلے شکر پر کہی تھی' اس لیے یہ ایک لاانتناہی سلسلہ چلے گا۔اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ خدا کا بڑا کرم اور اپنے بندوں کی مجبوری پر اس کا احسان یہ ہے کہ کسی دل میں شکر و نیازمندی کا احساس پیدا ہو جائے۔اسی کو وہ شکر کے طور پر قبول کر لیتا ہے۔منہ سے کہنا تو بڑی بات ہے' اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بندے کا یہ جان لینا کہ یہ نعمت خدا ہی کی طرف سے ہے اس کا شکر ادا کرنا ہے اور خدا اسی سے راضی ہو جاتا ہے۔

بندہ ناشکرا کب ہوتا ہے اور شکر کرنے والا کب ہوتا ہے۔اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لائی جارہی ہے' کوئی بادشاہ اپنے ایک دور افتادہ غلام کے لیے سواری' زادِراہ اور سامان بھیجے اور چاہے کہ غلام بادشاہ کے پاس آ جائے اور اس بلانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ غلام بادشاہ کی قربت سے عزت پائے اور کوئی غرض مطلب بادشاہ کو غلام سے نہیں ہے' یہی معاملہ خدا کا انسان کے ساتھ ہے۔اب غلام کی طرف سے شکر یوں ہے کہ جو چیز بادشاہ نے غلام کو دی ہے اس کو اس طریقے سے اور ان کاموں میں لگائے جو بادشاہ سے قریب کرنے والے ہوں۔اور ناشکری یہ ہوگی کہ ان چیزوں کو بے کار ڈال دے یا ایسے طریقے سے استعمال کرے جس کا نتیجہ اُلٹا نکلے اور وہ غلام بادشاہ سے دور ہوتا چلا جائے' ایسے ہی خدا بندے کو پیدا کرتا ہے اور اس میں طرح طرح کے تقاضے اور خواہشیں پیدا کر دیتا ہے تاکہ انسان ان تقاضوں اور خواہشات کے ذریعے اپنی ذات اور اپنے وجود کے لیے ضروری طاقت' صحت' ہمت' غذا وغیرہ طلب کرے اور مکمل انسان بن جائے تو مقصد تو ان خواہشات کو پیدا کرنے سے یہ ہے مگر انسان اُنھیں خواہشات کے غلط استعمال سے دور جا پڑتا ہے۔

دنیا میں جس قدر چیزیں پیدا ہوئی ہیں خواہ وہ انسان کے اعضا ہوں یا اس سے الگ دوسری چیزیں' وہ سب اسی لیے ہیں کہ انسان ان کے ذریعے بھلائی' خیر اور نیکی کی سعادت حاصل کرے' انسان اگر ان تمام چیزوں کو صحیح مصرف میں استعمال کرتا ہے' جس

مقصد کے لیے یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں' اُن میں استعمال کرتا ہے تو وہ اپنے مالک کا شکر ادا کرتا ہے اور جو سستی کرتا ہے یا غلط استعمال کرتا ہے' وہ نافرمان ہے' ان نعمتوں کو خدا سے دور ہونے میں استعمال کر رہا ہے اور ناشکری کر رہا ہے اور اگر ان نعمتوں کو بیکار رکھا جائے' نہ اطاعت میں استعمال کیا جائے نہ معصیت میں تو یہ بھی ناشکری ہوگی۔

خدا کی پسندیدہ و ناپسندیدہ چیزیں

جب شکر کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی نعمتوں کو ایسی چیزوں میں استعمال کیا جائے جو چیزیں اُسے پسند ہوں تو اب یہ بھی جاننا ہوگا کہ کون سی چیزیں خدا کو پسند ہیں اور کون سی ناپسند۔ خدا کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں کو جاننے کے دو ذریعے ہیں۔ ایک تو سُن کر' دوسرے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر، پہچان کر۔ دوسرا ذریعہ ذرا باریک اور دشوار ہے' پہلے ذریعے کے لیے خدا نے اپنے رسولوں کو بھیجا۔ اُن پر کتاب نازل فرمائی۔ دوسرا ذریعہ باریک اس لیے ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر شے میں انسان کو حکمت معلوم کرنی ہوگی' کیونکہ دنیا کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے اور اس حکمت سے خدا نے کچھ کام مقرر فرما دیے ہیں۔ اور یہی کام جو حکمت کے اندر مقرر کر دیے گئے ہیں خدا کو پسند ہوتے ہیں اس حکمت کی دو قسمیں ہیں' ایک ظاہر ایک پوشیدہ۔

سورج کی پیدائش میں یہ حکمت ہے کہ اس سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح دن کا مقصد تحصیل معاش اور رات کا مقصد آرام ہے' یہ ہے ظاہری حکمت کی مثال۔ ستاروں کی حکمت پوشیدہ ہے' اس کو عام لوگ نہیں جانتے۔ عام لوگ تو یہ جانتے ہیں کہ ستاروں سے آسمان کو زینت ملتی ہے۔ یا مثلاً اعضائے انسانی میں ہاتھ گرفت کے لیے' پیر چلنے کے لیے' آنکھ دیکھنے کے لیے' ناک سونگھنے کے لیے۔ یہ حکمتیں ظاہر ہیں۔ لیکن انسانی بدن کے اندر کے رگ و ریشے۔ پھر بعض اُن میں سے موٹی رگ' بعض پتلی' بعض خالی' بعض جال دار' ان کی حکمت پوشیدہ ہے۔ اب جو لوگ کسی چیز کو اس طرح پر استعمال نہ کریں جس کے لیے وہ دی گئی ہیں تو یہی ناشکری ہوگی۔ ہاتھ سے کسی نے کسی کو مارا یا مال چھین لیا۔

ڈاکہ ڈالا' چوری کی تو یہ سب ہاتھ کی ناشکری ہے کیونکہ ہاتھ اس لیے نہیں دیا گیا تھا۔ ہاتھ مضر چیز کو دفع کرنے اور مفید چیز کو لینے کے لیے بنایا گیا تھا۔

اب خفیہ حکمت کی بات سنیے۔ خدا کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے روپیہ پیسہ پیدا کیا۔ ان سے دنیا کا نظام قایم ہے۔ بذات خود روپے پیسے سے کوئی فائدہ نہیں ہے' نہ یہ کھانے کے کام آسکتے ہیں' نہ پینے کے' نہ پہننے کے۔ مگر انسان ان کا محتاج بھی ہے۔ محتاج کیوں ہے؟ اس کو یوں سمجھئے انسان کو غذا، پانی، لباس وغیرہ میں بہت سے چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس چیز کی اُسے ضرورت ہوتی ہے وہ چیز تو اُس کے پاس نہیں ہے اور جس چیز کی ضرورت ہوتی نہیں ہے وہ موجود ہے ۔مثلاً ایک شخص کو سواری کے لیے اونٹ کی سخت ضرورت ہے وہ اس کے پاس نہیں ہے اور زعفران کی اُسے ضرورت نہیں ہے مگر زعفران اس کے پاس موجود ہے۔ ۔اور دوسرے کے پاس اونٹ ہے لیکن اُس کو اونٹ کی ضرورت نہیں ہے اور زعفران نہیں ہے مگر اس کو زعفران کی ضرورت ہے۔ اب ظاہر ہے ضرورت پوری ہونے کے لیے ہر ایک چاہے گا کہ آپس میں تبادلہ ہو جائے اور تبادلے میں بدلے کے لیے کوئی مقدار مقرر ہونی چاہیے ۔ کیونکہ اونٹ کا مالک یہ تو کرے گا نہیں کہ چاہے جتنی مقدار زعفران کی دوسرا شخص اُسے دے اور بدلے میں یہ اونٹ اسے دے دے' پھر اونٹ اور زعفران میں کوئی مناسبت بھی تو نہیں ہے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ اونٹ کے برابر وزن یا صورت میں زعفران اُسے دیا جائے ۔اس لیے تبادلے کے اسباب میں مساوات اور مناسبت کا پتہ چلنا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ کوئی کپڑے کے بدلے میں گھر' گھوڑے کے بدلے میں آٹا یا موزے کے بدلے میں غلام لینا چاہے تو چونکہ ان چیزوں کے درمیان کوئی تناسب نہیں اس لیے تبادلے کے اسباب میں مساوات کا پتہ نہ چل سکے گا اور تمام معاملات بند ہو جائیں گے ۔اسی وقت کو دور کرنے کے لیے ایک ایسی چیز کی ضرورت پڑی جو ایسے غیر متناسب سامانوں کے درمیان ایک مساوات قائم کر سکے ۔اس کو سامنے رکھ کر جب دونوں چیزوں کو دیکھا جائے تو دونوں چیزوں کے

درمیان مساوی اور غیر مساوی معلوم ہو جائے یہ کام روپیہ پیسہ کرتا ہے تمام مالوں میں یہ دونوں متوسط درجہ رکھتے ہیں اوران سے مال کا اندازہ ہوسکتا ہے مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ یہ اونٹ سو روپے کا ہے اور اتنی زعفران سو روپے کی ہے اور دونوں چونکہ ایک معین چیز کے برابر ہیں اس لیے آپس میں مساوی ہیں، اب ان روپے پیسے کی حیثیت یہ قرار پائی کہ بذات خود اِن سے کوئی غرض نہیں نکلتی، یہ اسی لیے ہیں کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جائیں غیر متناسب اموال کے درمیان مساوات پیدا کریں، ان سے تمام چیزیں حاصل ہوسکیں کیونکہ لوگ' تبادلے میں ان کو قبول کر لیتے ہیں، تو ان روپے پیسوں کا مالک ہونا گویا تمام قسم کے مال کا مالک ہونا ہے ایسا نہیں ہے کہ کوئی صرف کپڑے کا مالک ہو کیونکہ اس کے پاس صرف کپڑا ہے، ہوسکتا ہے اُس کو کھانے کی ضرورت ہو اور کوئی کپڑے کے بدلے میں اُسے کھانا نہ دے اس لیے ممکن ہے اُسے کپڑے کی ضرورت نہ ہو، تو یہ کام روپیہ پیسہ کرسکتا ہے کہ ہر ایک مال کے لیے ہر وقت بدلہ بن سکے کیونکہ وہ ہر وقت ہر حال میں لوگوں کا محبوب ہوتا ہے بظاہر وہ کسی مطلب کا نہیں ہے مگر اس کے ذریعے ہر ایک مطلب نکل سکتا ہے معلوم ہوا کہ روپیہ پیسہ اسی کام کے لیے بنا ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچتا رہے اور لوگوں کا کام نکلتا رہے۔ اب کوئی اس کے خلاف کرنے یا روپے پیسے سے یہ کام نہ لے مثلاً اُسے جمع کر کے رکھے تو اُن کے ساتھ ناانصافی کرے گا اور اس نعمت میں ناشکری کرے گا۔ پھر یہ نقد اور روپے کسی خاص فرد زید' عمر' بکر کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ ہاں اگر یہ کسی کام' کھانے پینے میں آتے تو جو اس کا مالک ہوتا اُسی کے لیے خاص ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ اسی لیے ہیں کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جائیں اور ایک دوسرے کی ضرورتوں کا نظام وانتظام چلتا رہے' جو شخص سونے چاندی کے برتن بنوائے وہ بھی اسی شخص کی طرح ہے جو انھیں دبا کر رکھے کیونکہ سونا چاندی اس لیے نہیں ہے کہ ان کا برتن بنایا جائے' اسی طرح جو روپے پیسے میں سود کا کاروبار کررہا ہے وہ بھی ناشکری کررہا ہے کیونکہ روپیہ پیسہ دوسرے مال کے حصول کا ذریعہ ہیں' اس لیے نہیں ہیں کہ روپے پیسے سے خود روپیہ پیسہ خریدا اور بیچا

جائے۔ یہ تو خود روپے پیسے کی ذات سے فائدہ اٹھانا اور غرض حاصل کرنا ہے جبکہ اُن کی ذات کسی فائدے اور غرض کے لیے نہیں ہے بلکہ دوسرے فائدے اور غرض کے لیے وسیلہ ہے اور ایک شے جس غرض کے لیے ہو اُس کے خلاف استعمال کرنا یہی ناشکری ہے۔

اگر کوئی یہ سوچنے لگے کہ سود حرام اس لیے ہے کہ قرض جس قدر لیا جاتا ہے' لوٹاتے وقت اس سے زیادہ لوٹانا پڑتا ہے لیکن اگر کچھ نقد کوئی شخص فروخت کرے اور دوسرا شخص اتنی ہی مقدار واپس کرے تو اسے حرام نہیں کہا جاتا' اس کی کیا وجہ ہے' حالانکہ سود میں بھی پیسوں کا پیسوں سے معاملہ ہے اور یہاں بھی' اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک روپیہ مثلاً ایک روپے کے بدلے میں بیچا جائے تو اس میں کوئی بھی عقلمند مشغول نہ ہوگا' یہ تو ایک مہمل کام ہوا' جب ایک روپے دے کر ایک روپیہ لینا ہے تو یہی اچھا ہے کہ اپنا روپیہ پڑا رہے۔ اس فضول کام سے کیا نفع' تو عام طور نفس کو اس قسم کی چیزوں کی طرف جس میں کچھ نفع نہ ہو شوق بھی نہیں ہوتا اور جن چیزوں میں نفس کو شوق نہیں ہوتا ہم اس سے منع بھی نہیں کرتے' یہی حال غلّے کے معاملے کا ہے۔ غلّہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس سے غذا اور بعض وقت دوا کا کام لیا جائے چونکہ انسان غلّے کا بہت سخت محتاج ہوتا ہے اس لیے جس کے پاس غلّہ بے ضرورت جمع ہو اُس سے فوراً لے لینا چاہیے۔ اب اگر کوئی غلّے کو غلّے کے بدلے میں بیچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غلّے کا محتاج نہیں ہے بلکہ غلّہ لے لے کر جمع کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی ایک قسم کے غلّے کو دوسری کسی کھانے والی چیز کے بدلے میں بیچتا ہے تو وہ معذور ہے' کیونکہ مثلاً کوئی کھجور کو گیہوں کے بدلے میں بیچ رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے گیہوں کی ضرورت ہے اور جو غرض گیہوں سے نکلتی ہے وہ کھجور سے ممکن نہیں ہے' کوئی ایک سیر اچھا گیہوں لے کر ایک ہی سیر اچھا گیہوں لے کر تین سیر خراب دے رہا ہے تو اگرچہ یہاں بھی غلّے کا معاملہ غلّے سے ہو رہا ہے مگر ضرورت کی وجہ سے اس کی اجازت ہے کیونکہ ممکن ہے اُسے تین سیر ہی کی ضرورت ہو اور خراب ہونے کی وجہ سے صرف لذّت ہی میں تو فرق ہوگا۔ پیٹ بھرنے میں تو فرق نہ ہوگا۔ تو غلّے کا اصل فائدہ یعنی پیٹ بھرنے میں اچھا

اور براغلہ برابر ہے۔ اور لحاظ اس چیز میں اس کی اصل غرض اور ضرورت کا کیا جاتا ہے لذت کا نہیں اس لیے یہاں معاملہ کرنے کی اجازت ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو چیز جس حکمت کے لیے پیدا کی گئی ہے اُس کو اُس سے پھیرنا ناشکری ہے' جب شکر کی حقیقت معلوم ہوگئی کہ بندہ وہ کام کرے جس میں خدا کی حکمت پوری ہو تو جو بندہ اس لحاظ سے شکرگزار ہوگا تو وہ خدا سے قریب اور اس کا محبوب بندہ ہوگا۔

نعمت کی حقیقت

بظاہر ہر قسم کی لذت ہر قسم کی سعادت اور اچھی چیز کو نعمت کہا جا سکتا ہے' مگر اصل نعمت وہی ہے جس میں مرنے کے بعد اچھا بدلہ ملنے کی امید ہو' اس لحاظ سے دنیا کی زندگی میں ہر قسم کے اچھے کام' نیک عمل' پاکیزہ زندگی' دوسروں کے ساتھ ہمدردی' یہ سب نعمت میں داخل ہیں کیونکہ ان سے خدا خوش ہوتا ہے اور ان کا اچھا بدلہ بھی ملتا ہے۔

نعمت کیا ہے؟ اس میں لوگوں کے ذہن کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے' ہم اس کو چار طرح تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی تقسیم۔ ہمارے اعتبار سے ہر چیز چار طرح پر ہوتی ہے۔ اوّل۔ وہ چیز جس کا نفع اس دنیا میں بھی ہو اور مرنے کے بعد بھی اچھا انعام مل سکے جیسے علم' حسن اخلاق وغیرہ۔

دوم۔ وہ چیز جو اس دنیا میں بھی نقصان دہ ہو اور دوسری دنیا میں بھی وہ باعث نقصان رہے۔ جیسے جہالت اور بداخلاقی۔

سوم۔ ایسی چیز جو اس دنیا میں تو نفع دے سکے مگر مرنے کے بعد وبال جان بن جائے جیسے اپنی ہر خواہش اور ہر تمنا کو پوری کرنا۔

چہارم۔ ایسی چیز جو اس دنیا میں تو مضر ہو مگر آخرت میں اس پر نفع مل جائے جیسے خواہشات کو مارنا اور نفس کی مخالفت کرنا۔

ان چاروں میں سے اوّل جو اس زندگی میں اور مرنے کے بعد دونوں جگہ نفع بخش ہے اور وہ حقیقی نعمت ہے۔ اور جو دونوں جگہ نقصان دہ ہو' وہ نعمت کی ضد ہے یعنی زحمت

ہی زحمت ہے۔

وہ چیز جس کا دنیا میں نفع ہے مگر مرنے کے بعد وہ آفت و بلا بن سکتی ہے۔ایسی چیز ایک جاہل کے نزدیک تو نعمت ہوگی باقی کوئی عقلمند اس کو ہرگز نعمت نہیں سمجھے گا۔اسی طرح وہ چیز جس میں اس دنیا میں تھوڑی سی پریشانی ہو تھوڑا سا نقصان ہو مگر مرنے کے بعد نفع ہی نفع ہو۔جاہل و بے وقوف اسے مصیبت سمجھے گا۔مگر صاحب بصیرت عقلمند اس کو نعمت سمجھتا ہے۔

دوسری تقسیم۔یہ ظاہر ہے کہ دنیا کی ساری چیزیں سارے اسباب ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں۔ایسا بہت کم ہے کہ اسباب بہتر ہیں وہ بالکل ہی پاک وصاف ہوں اب ان کو تین درجوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔اول وہ ہیں نفع زیادہ ہو اور نقصان کم ہو۔مثلاً اگر مال واسباب صرف ضرورت کے مطابق ہوں تو اس میں نفع ہی نفع ہے نقصان کا امکان کم ہے۔ دوسرے ضرر زیادہ ہو اور نفع کم ہو۔اس کی مثال یہی مال ودولت ہیں جب لوگ اسکو ضرورت سے زائد جمع کرنا شروع کر دیں۔سوم۔نفع اور ضرر دونوں برابر درجے پر ہے کیونکہ بعض لوگوں کے پاس بہت سا مال ہوتا ہے پھر بھی وہ فائدے میں رہتے ہیں جب کہ وہ غریبوں کی مدد کرتے ہیں خیرات کرتے ہیں دوسروں کے کام آتے ہیں اور بعض لوگوں کے پاس تھوڑا مال ہوتا ہے مگر وہ پھر بھی نقصان میں رہتے ہیں اور مال کی مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں جب کہ وہ قلّت مال پر شکوہ کرتے ہیں ناشکری کرتے ہیں۔

تیسری قسم یہ کہ ہم ہر نیک کام کو تین طرح دیکھ سکتے ہیں۔اول وہ نیک باتیں خود مقصود اور پسندیدہ ہوں جیسے نیک لوگ خدا کی خوشنودی اور رضا چاہتے ہیں تو خدا کی رضا خود ہی بڑا انعام ہے۔اس کے ذریعے اور کسی فائدے کے لیے لالچ نہیں ہوتا۔یہ خود ہی بہت بڑا اور پسندیدہ فائدہ ہے۔دوسرے وہ چیز جو خود تو کچھ قیمتی اور فائدے مند نہ ہو مگر اس کے ذریعے فائدے حاصل ہوتے ہیں اس لیے لوگ انھیں پسند کرتے ہیں جیسے روپیہ پیسہ ہے کہ اگر روپے پیسے سے انسانی ضرورتیں پوری نہ ہوتیں تو روپے پیسے کنکر پتھر کی طرح ہوتے مگر چونکہ ہر ضرورت ہر سامان روپے پیسے سے آسانی سے مل جاتا ہے اس لیے جاہل

اور دنیادار کے نزدیک یہ بھی محبت کے قابل ہوگیا۔ وہ اس کو جمع کرتے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں' اس کو وسیلہ اور ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ خود اس کو ایک نعمت سمجھتے ہیں۔

تیسرے وہ چیز کہ خود بھی محبوب ہو اور دوسرے کاموں کے لیے بھی مفید ہو جیسے صحت وسلامتی۔ انسان کبھی خود صحت وسلامتی کو پسند کرتا ہے اس سے قطع نظر کہ اس سے کوئی فائدہ اور ہو۔ جیسے ایک شخص کو پیدل چلنے کی ضرورت نہ ہو پھر بھی پیر کی سلامتی ضرور چاہتا ہے اور کبھی صحت وسلامتی دوسرے فائدے کی وجہ سے چاہتا ہے۔ مثلاً عام آدمی صحت وسلامتی سے دنیا میں لطف اندوز ہوتا ہے اور نیک آدمی صحت وسلامتی کے ذریعے نیکی حاصل کرتا ہے' نیک کام کرتا ہے' عبادت کرتا ہے۔

اوپر کی تینوں قسموں کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو وہ چیز جو خود مطلوب' مقصود اور پسندیدہ ہے اسی کو ہم اصل نعمت کہہ سکتے ہیں۔ اور جو خود بھی مقصود اور محبوب ہو نیز اس کے ذریعے دوسرا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہو وہ بھی نعمت ہے مگر اس کا درجہ پہلی نعمت سے کم ہے اور جو محض دوسری چیزوں کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہو۔ جیسے سونا' چاندی' روپیہ' پیسہ۔ تو یہ چیزیں معدنیات اور دھات ہونے کے ناتے تو کوئی نعمت نہیں ہیں۔ ہاں ان سے دوسری نعمتیں حاصل ہوسکتی ہیں' اس لحاظ سے ان کو نعمت کہا جاسکتا ہے۔ یہ تین قسمیں ہوچکیں۔ اب چوتھی قسم ایک اور اعتبار سے ہوسکتی ہے۔ شروع میں بتایا گیا ہے کہ نعمت نام لذت کا ہے اور لذت خواہ صرف انسان محسوس کرے یا انسان اور حیوان دونوں محسوس کرتے ہوں۔ بہرحال تین قسم کی ہے۔ اول عقلی۔ دوم' بدنی جن کو بعض حیوانات بھی محسوس کرتے ہوں۔ سوم' وہ بدنی جن کو تمام حیوانات محسوس کرتے ہوں۔ عقلی لذت کی مثال جیسے علم وحکمت کی لذت اس کو صرف انسانی قلب محسوس کرتا ہے' قلب کو جو لذت علم وحکمت سے ہوتی ہے وہ اس لیے کہ وہ صفت جس کا نام عقل ہے' وہ قلب کے ساتھ خاص ہے' یہ لذت سب سے زیادہ اشرف بھی ہے اور سب سے زیادہ کمیاب بھی۔ کمیاب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ علم وحکمت سے صرف عالم اور حکیم ہی لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ اور دنیا میں صحیح معنوں میں عالم وحکیم بہت کم

ہوتے ہیں۔ اور اس لذّت کے اشرف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اول تو یہ اسی دنیا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ لذّت مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے اس کو زوال نہیں ہے' دوسرے اس لذّت کو چاہے جس قدر حاصل کرو' طبیعت پر بوجھ یا گرانی محسوس نہیں ہوتی جیسے بھوک اور نیند کی لذّتوں کو اگر زیادہ حاصل کرلو تو بوجھ۔ سستی اور تھکن کا احساس ہوتا ہے یہ بات علم و حکمت کی لذّت میں نہیں ہے' علم و حکمت خواہ کتنا ہی حاصل کرو کوئی بوجھ' کوئی تکدر نہ ہوگا۔ وہ انسان کتنا بڑا محروم القسمت ہے جو علم و حکمت ایسے دائمی اور بلا تعب و بوجھ ایسی نعمت کو حاصل کرنے پر قادر ہو پھر بھی اسے نہ حاصل کرے' اس سے محروم رہے۔ اور فانی' بوجھل' مکدّر کر دینے والی لذّتوں پر مر مٹے۔

علم کا کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ علم و عقل کے لیے نہ مددگاروں کی ضرورت ہے نہ پہرے داری' بخلاف مال کے۔ مال کی حفاظت انسان کو کرنی پڑتی ہے جب کہ علم خود انسان کی حفاظت کرتا ہے' علم کو جس قدر خرچ کیجئے وہ بڑھتا ہے اور مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے۔ مال چوری' اور عہدہ برطرفی سے جاتا رہتا ہے مگر علم پر نہ چور کا زور نہ حاکم کا جبر۔ سوال یہ ہے کہ جب لذّت علم و حکمت اس قدر قیمتی شے ہے تو اکثر لوگ اس سے محروم کیوں رہتے ہیں۔ اس کی دو وجہ ہیں یا تو ان کو ذوق نہیں ہے اور جس کو ذوق نہ ہوگا وہ علم کی قدر کیا جانے گا' اس کو اشتیاق کیسے پیدا ہوگا یا ان کے مزاج بگڑ چکے ہیں' بیکار باتوں میں پڑ کر دل روگی ہو گئے ہیں اور جیسے بیمار کو شہد کا مزہ کڑوا لگتا ہے ایسے ہی ان کو علم برا لگتا ہے یا ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ طبیعت اور دانائی میں نقص ہے اور وہ صفت جس سے علم کی لذّت معلوم ہوتی ہے پیدا ہی نہیں ہوئی ہے۔ دوسری لذّت جس میں انسان کے ساتھ بعض حیوان بھی شریک ہیں جیسے ریاست اور غلبے کی لذّت۔ یہ لذّت جہاں انسان میں ہوتی ہے وہاں شیر' چیتے اور بعض دوسرے حیوان میں بھی پائی جاتی ہے' تیسری لذّت جس میں انسان کے ساتھ سارے حیوان شریک ہیں۔ وہ پیٹ اور منہ کی لذّت ہے۔ یہ لذّت تمام لذّتوں میں کمتر ہے' ادنیٰ ہے چونکہ یہ کثرت سے پائی جانے والی لذّت ہے اس لیے تمام جانور' کیڑے مکوڑے اس

میں سب شریک ہیں۔انسان جب اس تیسری لذت سے اونچا اُٹھتا ہے تو حکومت و غلبے کی لذت پر پہنچتا ہے اور اس سے ترقی کرتا ہے۔اس وقت تمام لذتوں سے زیادہ علوم و حکمت کی لذت غالب ہوتی ہے۔خدا کی معرفت اور اس کے صفات کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے، یہ صالحین کا مقام ہے۔

ایک اور تقسیم جو تمام نعمتوں میں پائی جاتی ہے یہ کہ نعمت یا تو ایسی ہے کہ وہی انسان کا مقصد ہے یعنی جو نعمت ملی ہے بس انسان وہی چاہتا تھا یا وہ نعمت کسی سعاوت کا وسیلہ اور ذریعے وہ سعادت مل جائے گی۔اور وہ سعادت اُخروی یعنی مرنے کے بعد کی سعادت اور ذریعہ ہو اور انسان اس نعمت کو اس لئے چاہتا ہو کہ اس کے انعام ہے۔دراصل وہی انعام ایسا ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی زندگی ہے جو فانی اور ختم ہونے والی نہیں ہے، وہ ایسا سرُور ہے جس میں غم کی آمیزش نہیں ہے۔وہ ایسا علم ہے جس میں جہل نہیں ہے، وہ ایسی تونگری ہے جس میں افلاس کا غم نہ ہو۔یعنی چاروں باتیں حقیقی نعمت ہیں۔اب وسائل کو لیجئے.....جو اسی سعادت اُخردی کے لیے وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔وسائل کی چار قسمیں ہیں۔اوّل قسم جو سب سے زیادہ خاص ہے۔اور بڑا وسیلہ ہے۔یعنی انسان کے اپنے نفس کے فضائل، سعادت اُخروی کے حاصل کرنے میں نفس کی فضیلت بہت ضروری ہے۔دوم وہ قسم جو نفس کے فضائل سے قریب تر ہوں جیسے بدن کے فضائل۔نفس کے لیے بدن بہت ضروری اور قریب تر ہے اس لیے دوسرے نمبر پر بدن کے فضائل آتے ہیں۔سوم وہ فضائل جو نفس مال دولت، اقربا اور رشتے وار۔یہ سب نفس کے لیے ضروری ہیں۔مگر انسان کے بدن سے الگ ہیں۔چہارم وہ جن کا تعلق نفس، بدن، اور خارج بدن تینوں سے ہو، بغیر اس سے کچھ نہ حاصل ہو سکے جیسے توفیق، ہدایت، خدا کی مدد۔اب پھر اوّل کو لیجیے نفس کے فضائل، یہ دو چیزوں میں آجاتے ہیں ایمان اور اچھا اخلاق، دوم کو دیکھئے، فضائل بدن میں چار چیزیں آتی ہیں تندرستی، قوت، جمال، عمر کی زیادتی، سوم کو لیجئے، بدن سے خارج فضائل میں بھی چار چیزیں شامل ہیں مال اولاد، جاہ و عزت اعلیٰ نسبی ان سب پر غور

کیجیۓ اور قسم چہارم توفیق خدا کو بھی سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اصل نعمت نفس کے فضائل ہیں مگر اس ایک نعمت کے لیے چاروں قسمیں وسیلہ اور ضروری ہیں اب فضائل نفس کے لیے علوم اور تہذیبِ اخلاق لازمی ضرورتیں ہیں اور تحصیل اخلاق بغیر بدن اور اس کی سلامتی کے نہیں ہوگی، ایسے ہی مال و دولت جاہ و مرتبہ اگر انسان کو حاصل نہ ہوں تو نفس کے فضائل حاصل ہونے میں خلل اور نقصان واقع ہوسکتا ہے، انسان جب مال و دولت کی طرف سے بےفکر رہے گا، تو علم و حکمت کے حاصل کرنے میں ہمہ تن متوجہ رہے گا مفلسی میں آدمی سے کوئی خیر کا کام نہیں بن پڑتا ایسے ہی عزیز و رشتے دار اس کے لیے مثل قوت بازو کے ہیں وہ ہر طرف سے بے نیاز نفس کے فضائل حاصل کرنے میں مشغول ہوسکتا ہے اور جاہ و مرتبہ کے باعث انسان اپنے نفس پر سے ذلّت اور ظلم کو دفع کرتا ہے ہر شخص کے کچھ دشمن اور بدخواہ ہوتے ہیں جو اس کو تشویش میں مبتلا رکھتے ہیں، جب انسان کا دل اس وحشت میں گرفتار رہے گا تو وہ کسی طرف توجہ نہ کر سکے گا، اور یہ تشویش عزّت و جاہ سے دور ہوتی ہے اسی لیے بعض حکما نے کہا ہے کہ" دین اور سلطان دونوں قوام ہیں اور ایک دوسرے کو لازم ہیں علماء اگرچہ سلاطین سے بے نیاز ہوں مگر سلاطین ان کے لیے بڑا سہارا ہوتے ہیں، ہر فتنے میں ڈھال اور سپر کا کام کرتے ہیں

ایسے ہی اعلیٰ نسبی اور خاندانی شرافت بھی ایک نعمت ہے، اس سے بھی انسان کو نفس کے فضائل حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے ہم نے جمال کو بھی نعمت میں شمار کیا ہے، یہ مسئلہ ذرا مشکل ہے، جمال کس طرح نعمت ہوسکتا ہے؟ اور اس سے نفس کے فضائل کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، تو خوبصورتی سے اکثر نفس کی فضیلت پائی جاتی ہے کیونکہ نفس کی پاکیزگی اور نفس کے نور کا اثر ظاہر جسم پر آجاتا ہے اسی لیے صاحب فراست نفس کی بڑائی کو ظاہری حسن و جمال سے معلوم کرلیا کرتے ہیں آنکھ اور چہرہ انسان کے باطن کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے کشادہ روئی، اچھے نرم اور پاکیزہ نفس ہونے کی پہچان ہوا کرتی ہے

اب ایک اور نعمت کا ذکر ہوگا کہ توفیق خداوندی کس طرح نعمت ہوسکتی ہے تو سب

سے پہلے توفیق کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے

توفیق میں بندے کا ارادہ اور اللہ کا فیصلہ اور قضا باہم مل جایا کرتا ہے اس ارادے اور اللہ کی قضا و قدر میں کوئی ضروری نہیں کہ اچھی ہی باتیں ہوں خیر و شر سعادت و شقاوت دونوں داخل ہیں ویسے عام طور پر جو اللہ کے فیصلے بھلائی کے لیے ہوتے ہیں توفیق انھیں کو کہا جاتا ہے اس لحاظ سے انسان، توفیق ایسی نعمت کا بہر حال محتاج ہو کیونکہ وہ لاکھ ارادے کرے اگر اللہ کا فیصلہ، اس کی تقدیر، اس ارادے سے نہ ملے گی تو افعال صادر نہیں ہو سکتے

ہدایت کا یہ حال ہے کہ اس کے بغیر کوئی شخص سعادت نہیں طلب کر سکتا کیونکہ انسان نیکی اور بھلائی کا ارادہ کرتا ہے لیکن جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ میری بہتری کس چیز میں ہے ارادہ محض سے کیا فائدہ ہوگا ممکن ہے کسی فساد اور فتنے کو خیر سمجھ کر اسی طرف چل پڑے غرض کہ ارادہ قدرت اور اسباب کے ہوتے ہوئے بھی بلا ہدایت کے کچھ فائدہ نہیں ہے ہدایت کے تین درجے ہیں اوّل خیر و شر کے رستوں کا بتا دینا یہ درجہ عام ہے تمام انسانوں کو دے دیا گیا ہے کچھ تو عقل کے ذریعے سمجھا دیا گیا ہے، کچھ کو وحی کے ذریعے، رسولوں کو بھیج کر

دوسرا درجہ ہدایت کا وہ ہے جو ایک نور کی طرح ہے جو مکمل ہدایت کے بعد خدا کے نبی رسول،، خدا کے نیک بندوں، خدا کے ولی اور دوستوں کے دل میں چمکنے لگتا ہے اسی کے باعث وہ باتیں سوجھتی ہیں جو عام عقل سے نہیں معلوم ہوا کرتیں، یہی ہدایتِ مطلق ہے اسی کو قرآن میں "حیات" اور "نور" کہا گیا ہے ایک اور نعمت "رُشد" رشد کا مطلب یہ ہے کہ رشد خدا کی ایک عنایت ہے جو انسان کو اپنے مقصد کی طرف چلنے میں مدد کرتی ہے اگر اس مقصد میں انسان کی بہتری ہے تو اُس کو اس کی نعمت کے باعث قوت ملے گی اور اگر نقصان ہے تو وہ سست ہو جائے گا، غرض کہ رُشد وہ ہدایت ہے جو سعادت اور خیر کی طرف لے چلے یہ ہے تمام نعمتوں کی تفصیل

خدا کی نعمتیں

انسان پر جس قدر نعمتیں اُتاری گئی ہیں ان سب کا ذکر اور احاطہ تو مشکل ہے لیکن

نعمتوں میں جوسب سے اہم اور بنیادی نعمت ہے اس کا ذکر مع اس کی دوسری جزئیات کے ہم کرتے ہیں ان میں سے ایک انسان کی صحت اور تندرستی ہے، صحت اور تندرستی کے اسباب میں سے قوی سبب انسان کا کھانا پینا ہے جو ضروری ہیں ان کا مختصر حال ضروری ہے دیکھئے کھانا ایک فعل، ایک حرکت ہے اور حرکت کے لیے جسم ضروری ہے، ورنہ حرکت کہاں ہوگی ،حرکت کے لیے پہلے انسان ارادہ کرتا ہے تو دیکھئے ارادہ ضروری ہوا پھر ارادہ کرنے کے بعد اگر انسان میں قوت ہے تب تو ارادے کے مطابق عمل ہوگا۔لہٰذا قوت ضروری ہوئی ، پھر کھانے کے لیے غذا ضروری ہے اور کوئی ایسی چیز ضروری ہے جس سے غذا حاصل ہو سکے۔

ان تمام نعمتوں میں پہلے ان اسباب کا ذکر ہوگا جو چیزوں کے ادراک و معرفت کا ذریعہ بنتے ہیں اور اسی کے ضمن میں ترتیب وار ہم انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان فرق واضح کردیں گے

دیکھئے نباتات بڑھتے پھلتے پھولتے ہیں اور پتھر لوہا مٹی نہ بڑھتی ہے نہ پھولتی پھلتی اور نہ محسوس کرتی ہے اس لیے نباتات ان جمادات سے بڑھ گئے اور آگے دیکھئے نباتات اپنی غذا خود حاصل کرتے ہیں مگر غذا اگر اس کی جڑ کے پاس جڑ سے متصل نہ ہو تو نباتات خدا کو بڑھ کر نہیں لے سکتے کیونکہ بڑھ کر کسی چیز کو لینے کے لیے ضروری ہے کہ لینے والا پہلے سے اُس چیز کو جانتا ہو اور بڑھ سکتا ہو اس معاملے میں انسان اور دوسری مخلوقات ،نباتات سے آگے بڑھ گئے ہیں پھر آگے بڑھ کر لینے میں بھی مختلف درجے ہیں جہاں انسان اور دوسرے جانوروں میں تمیز ہوتی جاتی ہے یہاں حواس خمسہ سے بحث ہوگی ان میں سے پہلا حاسّہ لمس یعنی چھونے کی قوت ہے اس قوت سے انسان ہر چیز کو چھو کر معلوم کر لیتا ہے یا اس کے جسم سے کوئی چیز مس ہو تو اسے معلوم ہو جاتی ہے اب اگر وہ چیز مفید ہے تو یہ اس کی طرف رغبت کرے گا اور مضر و تکلیف دہ ہے تو اُس سے بچے گا حیوان تمام کے تمام یہی کام اس قوت سے لیتے ہیں اس لیے خالی اس قوت کے ہوتے ہوئے انسان اور دوسرے حیوان تو برابر ہیں ہاں نباتات یہ کام اس قوت سے نہیں لے سکتے اس لیے

نباتات نیچے رہ گئے چھونے والی قوت کی موجودگی میں وہی چیز حاصل ہوسکتی ہے جو قریب آ کر چھو جائے مگر ابھی ضرورت ایسی حس اور قوت کی ہے کہ دور کی چیز معلوم ہو سکے اس کے لیے قوت شامہ دی گئی، سونگھنے کی قوت اب دور سے بھی سونگھ کر معرفت حاصل ہو سکنے کے امکان ہو گئے، مگر بو یا مہک تو آنے لگی لیکن یہ کیسے پتہ چلے گا کہ کس طرف سے بو آ رہی ہے اس کے لیے قوت باصرہ، بینائی پیدا ہوئی کہ دیکھ کر جہت اور سمت کا اندازہ ہو سکے مگر آنکھ سے سامنے ہی کی چیز تو نظر آ سکتی تھی دیوار یا پردے کے پیچھے کی چیز کا پتہ چلنا تو مشکل تھا اس لئے قوت سامعہ، سننے کی قوت عطا ہوئی اور نہ صرف سننے کی قوت بلکہ ساتھ ساتھ جو سنا جائے اسے سمجھنے کی صلاحیت دی گئی لیکن ان تمام قوتوں کے بعد بھی نقصان رہ جاتا اگر قوت۔ ذائقہ' میسر نہ ہوتی کیونکہ غذا ملنے کے بعد آدمی کو کیا معلوم ہوتا کہ یہ چیز موافق ہے یا ناموافق، جیسے درخت کا حال ہوتا ہے کہ جو بھی سیال شے اس کی جڑ میں پہنچتی ہے وہ اُسے چوسنے لگتا ہے، قطع نظر اس کے کہ یہ اس کے لیے مفید ہے یا مضر اور بالآخر بعض اوقات نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی زہر کے چوسنے سے مرجھا کر مر جاتا ہے۔ اچھا ایک بار قوتِ ذائقہ کے ذریعے انسان نے چکھ کر پتہ لگا لیا کہ یہ چیز کڑوی ہے یا اُس کے لیے مضر ہے۔ دوبارہ کچھ دن بعد پھر وہی چیز ملی۔ اب ظاہر ہے پھر اسے چکھنا اور پتہ لگانا پڑے گا۔ یا پھر ایسی قوت ہو کہ ایک بار کا علم و تجربہ محفوظ رہے اور ہر بار اُس کے کام آ سکے' اُسے ہر بار زحمت نہ کرنی پڑے۔ تو اسی کام کے لیے انسان کو ایک قوت ''حس مشترک'' نام کی عطا ہوئی یہ نام کی عطا ہوئی ''یہ حسِ مشترک'' ہی ہے جو مذکورہ بالا تمام حواس کے احساسات اور محسوسات کو محفوظ و جمع کر دیتی ہے اور وقت پڑنے پر باہر نکال کر کام لیتی ہے اور اوپر ذکر کی گئیں تمام قوتیں مع حس مشترک والی قوت کے' انسان کے علاوہ حیوان میں بھی پائی جاتی ہیں اس لیے کوئی چیز اور ہونی چاہیے جس سے انسان تمام حیوانوں سے ممتاز ہو سکے۔ اس لیے انسان کو خدا نے ایک اور صفت سے ممتاز فرمایا اور وہ ہے عقل کی دولت۔ اسی سے انسان غذاؤں کا نفع و ضرر پہچانتا ہے' نتیجے کے اعتبار سے جو چیز مضر ہو اس کو معلوم کر لیتا ہے' غذا کا پکانا' اس

کو فراہم کرنا' ایک چیز کو دوسری میں ملا کر نئی غذا تیار کرنا یہ سب کام عقل سے ہوتے ہیں ۔اور یہ عقل کا بہت معمولی سا کام ہے ورنہ تو عقل' کائنات میں' قدرت کے راز اور نکتے کو پا لیتی ہے اور بڑے بڑے کام کرتی ہے۔ یہ تھوڑا سا بیان ادراک اور اسباب اور ادراک کی حکمتوں کا ہو گیا۔ باقی اور بہت سی تفصیل ہم نے چھوڑ دی ہے۔ دوسری نعمت ارادے کا ہونا۔ انسان غذا کو دور سے دیکھ رہا ہے مگر اس کے دل میں شوق و رغبت نہیں ہے تو یہ دیکھنا بیکار ہے' اس کے لیے خدا نے انسان کے اندر غذا کی خواہش پیدا کر دی ہے تا کہ وہ غذا حاصل کرے اور کھا کر زندہ رہے' اس صفت میں جانور تو انسان کے شریک ہیں مگر نباتات شریک نہیں ہیں۔ ایک اور چیز انسان کو دی گئی' خلاف طبیعت چیزوں سے نفرت و کراہت' یہ اُس وقت کام آتی ہے جب انسان کا پیٹ غذا یا پانی سے بھر جاتا ہے۔ تب یہ نفرت و کراہت اس کو مزید کھانے اور پانی لینے سے روک دیتی ہے' ورنہ درخت کا حال ہوتا کہ پانی دیتے جاؤ وہ لیتا چلا جائے گا۔ اپنی ضرورت کے بعد بھی لیتا رہے گا' اس کے اندر کراہیت کی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ ضرورت کے بعد لینا بند کر دے اور آخر کار اسی باعث مر جاتا ہے۔ پھر حصول رزق کے راستے میں اکثر ناگوارا معاملات کا سامنا کرنا پڑتا ہے' بدخواہ' دشمن' مخالف ہر قسم کے لوگوں اور حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات کو اور ایسے بدخواہ اشخاص کو اپنے اوپر سے دفع کرنے کے لیے انسان میں کوئی جذبہ اور کوئی قوت ہونی چاہیے وہ غضب کی قوت ہے' اگر غضب اُس کے اندر نہ ہو تو حاصل کی ہوئی غذا بھی کوئی چھین لے۔ نہ اس میں جوش انتقام اُٹھے گا نہ وہ دفع کر سکے گا۔ انسان کو ان خواہشات و ارادوں کے علاوہ ایک اور ارادہ عطا ہوا جو پوری طرح عقل کے ماتحت رہتا ہے' یہی ارادہ انسان کو بتاتا رہتا ہے کہ غضب کا استعمال کس جگہ مناسب اور ضروری ہے' خواہش کہاں تک ضروری ہے' کاموں کا مآل و انجام کیا ہو گا۔ اس ارادے سے جانور خالی ہوتے ہیں اسی لیے وہ غضب اور خواہش کے استعمال میں بھی آزاد ہوتے ہیں اور کاموں کے مآل و انجام سے بھی بے خبر۔ یہ خصوصیت صرف انسان کے لیے ہے' اب کوئی انسان غضب' خواہش کو بے باکانہ

استعمال کر کے' انجام و نتائج سے بے خبر ہر کام کو بے دھڑک انجام دے کر جانوروں کی صف میں پہنچنا چاہے تو اس سے بڑی کم عقلی کیا ہوگی۔

تیسری نعمت کو دیکھیے۔ غذا کا ادراک ہو گیا' اس کے حاصل کرنے کا ارادہ بھی ہوا مگر جب تک حاصل کرنے کا ذریعہ اور آلہ ہی نہ ہو گا اس وقت تک یہ ادراک و معرفت اور ارادہ و شوق سب بیکار ہے اس لیے حرکت کے لیے آلات کا ہونا اور پھر آلات پر قدرت اور قابو ہونا بھی ضروری ہے' چنانچہ اعضائے انسانی اور ان پر انسان کو قدرت اسی حکمت کے تحت دیے گئے ہیں۔ ہاتھ سے غذا کو لینا' لے کر معدے تک منہ کے راستے سے پہنچانا' اور پہنچانا بھی کس طرح؟ سالم لقمہ تو اندر جانا مشکل تھا اس کے لیے اسی منہ میں دو جبڑوں کی چکی اور دانتوں کا سلسلہ اس کو باریک کرنے کے لیے رکھ دیا گیا۔ پھر لقمے کو دانت تو کھینچ کر اپنے تلے نہیں لا سکتا' یہ کام زبان نے کیا کہ لقمے کو ہر طرف سے دانت کے نیچے کرتی رہے۔ اب غذا چبائی جا چکی' نگلنے کا کام باقی ہے' مگر خشک غذا کا نگلنا بھی تو ایک مرحلہ ہے' اس کے لیے کوئی سیال مادّہ ہونا چاہیے تو اس کام کے لیے منہ کے اندر ہی ایک مادّہ پیدا کر دیا گیا جو غذا کو تر رکھے اور پھسلا پھسلا کر نگلنے میں آسانی پیدا کر دے۔ اس کے بعد بھی غذا کے جز و بدن بننے میں کتنے ہی مقامات آتے ہیں اور ہر مقام پر ایک حیرت ناک نکتہ اور بھید ہے۔ ان سب کو ہم نے اختصار کے پیش نظر ترک کر دیا۔ بہر حال آدمی کو چاہیے کہ خدا کی ان نعمتوں پر غور کرے اور شکر کرے۔ آدمی کھانے کو اوّل تو کم ہی نعمت سمجھتا ہے اور اگر سمجھتا بھی ہے تو یہی نا کہ بھوک لگی' مل گیا' کھا لیا۔ تو اتنی بات تو گدھا بھی جانتا ہے کہ بھوک لگی تو کھا لیا اگر صرف اتنا ہی اُسے معلوم ہے تو وہ کیا شکر کرے گا۔

غذا کے سلسلے میں بہت تفصیل آ سکتی ہے۔ غذا کے ہم تک پہنچنے میں خدا کی کتنی نعمتیں کام کرتی ہیں ان کو تفصیل میں گھسا جائے تو خدا ہی کے اس فرمان پر سر جھکانا پڑتا ہے کہ ''میری نعمتیں اس قدر بے شمار ہیں کہ نہ تم گن سکتے ہو نہ احاطہ کر سکتے ہو۔'' غلّے کا بیج بننا' مٹی میں جانا' مخالف اسباب سے بچا کر موافق آب و ہوا میں اس کی نشو و نما، اس کی تربیت،

سورج سے گرمی، ہوا ، بادل سے پانی، مٹی سے غذا، چاند کے ذریعے میوے اور غلے میں پختگی اور رنگ کا ملنا۔ پھر غلے کو کھانے کے قابل بنانے میں بے شمار نعمت ہے مثلاً گیہوں کا روٹی بن جانا ایک معمولی عمل نظر آتا ہے مگر اس میں پیسنے، پکانے کا عمل پھر اس کام میں لوہے لکڑی آگ، پانی کا کام اور غور کرو درانتی جس سے گیہوں کٹ کر گھر میں آیا، یہاں سے لے کر روٹی بننے تک جس قدر آلات استعمال ہوئے، ان آلات کے مادوں کا پیدا کرنا پھر ان کا خاص ڈھنگ بتانا اور انسانوں کو سکھانا کہ ایسی چیز بنے تو اس سے یہ فائدہ ہے یہ سب اپنے اندر بے شمار تفصیل رکھتی ہیں اور سب کی سب ایک نعمت ہیں

انسان غفلت کی وجہ سے نعمت کو نعمت نہیں سمجھتا یا وہ نعمت اتنی عام ہوتی ہے کہ ان کو استعمال کرتا ہے اور کبھی خیال نہیں کرتا کہ اگر یہ نعمت چھن جائے تو کس قدر مصیبت کا سامنا کرنا پڑے اس عمومیت اور آسانی سے مل جانے کی وجہ سے کبھی شکر کرنے کا خیال نہیں آتا او پر غذا کی جو نعمت ذکر ہوئی یا آگ، پانی ہوا، سانس، تندرستی (بیماری سے پہلے) یہ سب اسی میں آتی ہیں

کسی فقیر نے ایک صوفی سے تنگ، مال کی شکایت کی صوفی نے کہا کہ لے میں تجھ کو پانچ ہزار درم دیتا ہوں تو اپنی ایک آنکھ نکال کر مجھے دے دے، اُس نے سختی سے منع کیا تب صوفی نے کہا تیرے تمام اعضاء کو چھوڑتا ہوں صرف ایک آنکھ ہی ایسی بڑی دولت ہے کہ تو اتنے مال کے بدلے میں دینے پر تیار نہیں ہے اس لیے جا ان تمام نعمتوں کا شکر کر ،شکایت مت کر، اس سے معلوم ہوا کہ عام ضروری نعمتوں کو لوگ بھولے رہتے ہیں اور خاص نعمتوں کا شکوہ کرتے ہیں جو اکثر بے ضرورت ہوتی ہیں لوگ خزانے اور بادشاہتیں طلب کرتے ہیں اور نہ ملنے پر شکوہ بھی کرتے ہیں حالانکہ کبھی صحرا و جنگل میں نا موافق حالات میں پھنس کر بہت ممکن ہے کہ پیاس کی شدت میں ایک گلاس پانی کے بدلے میں خزانے کے خزانے اور ساری بادشاہت بیچ دیں اور تب اندازہ ہوتا ہے کہ اصل نعمت کیا ہے

انسان اگر ان نعمتوں کو نعمت نہیں سمجھتا بلکہ خاص نعمت ہی کو نعمت جانتا اور اسی کا

متلاشی رہتا ہے تو آیئے دیکھیں کہ بہت سی خاص نعمتیں بھی انسان کو میسر ہیں پھر بھی اس کی ہوس پوری نہیں ہوتی اور شکر کی جگہ شکوہ ہی زبان پر رہتا ہے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنے آپ میں غور کرے تو بعض نعمت ایسی نہ پائے جو اُسی کے لیے مخصوص ہو یا اس میں کم آدمی شریک ہوں اس میں سے تین نعمت تو عام طور پر سب جانتے ہیں اول عقل، دوم اخلاق، سوم علم، عقل کا معاملہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شاید ایسا نہ ہو جو عقل میں خود نے زیادہ دوسروں کو سمجھتا ہو یہی وجہ ہے کہ انسان کبھی اپنی دعا میں خدا سے عقل کا سوال نہیں کرتا جو صحیح معنوں میں عقلمند ہوتا ہے اُس کا خوش ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن جو عقل کم رکھتا ہے، یا بالکل نہیں رکھتا وہ بھی خود کو سب سے بڑا عقل والا سمجھتا ہے اور اسی خیال میں مست رہتا ہے، بہر حال جو سچ مچ عقل کا مالک ہے اُسے تو شکر کرنا ہی چاہیے کہ خدا نے یہ نعمت دی ہے اور جو عقل سے خالی ہے مگر سمجھتا ہے کہ میں بڑا عقلمند ہوں شکر اُسے بھی کرنا چاہیے کیونکہ اپنے تئیں تو وہ اپنے آپ کو عقل والا سمجھ رہا ہے اور اس نعمت کا مالک سمجھتا ہے پھر شکر کیوں نہ کرے۔

خلق کا یہ حال ہے کہ ہر شخص دوسروں کے بعض عیب کو ضرور بُرا سمجھتا ہے اور دوسروں کے بعض اخلاق کو ضرور بُرا جانتا ہے' دوسرے کی بُرائی اس لیے کرتا ہے کہ خود کو ان بُری باتوں سے پاک سمجھتا ہے تو ایسے وقت میں اُسے اور بھی شکر کرنا چاہیے کہ خدا نے فلاں بُری بات سے جو دوسروں میں پائی جا رہی ہے مجھ کو پاک رکھا۔ اگر صحیح معنوں میں وہ بُرائی اس میں نہیں ہے تب شکر کرنا ہی چاہیے' لیکن اگر اس کا خیال ہی ہے تب بھی شکر کرے کیونکہ وہ تو اپنے خیال کے مطابق گناہ اور بُرائی سے پاک ٹھہرا۔

اور علم کا معاملہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی باطنی کمزوریوں اور بُری خصلتوں پر واقف ہوتا ہے۔ وہ کمزوری اور بُری خصلت ایسی ہوتی ہے۔ جو خاص اسی میں ہوتی ہے۔ اگر کسی کو اُن کا پتہ چل جائے تو لوگ اس سے سخت نفرت کرنے لگیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ہر فرد کو ایک نہ ایک خاص بات کا اپنے بارے میں علم ضرور ہوتا ہے جس میں نہ کوئی شریک ہوتا ہے نہ کوئی مطلع ہو سکتا ہے۔ تو اُس وقت اُسے خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ خدا نے اس کے عیوب کی پردہ

پوشی کر دی ہے۔ دوسروں کے سامنے ذلیل ہونے سے بچالیا ہے۔ تو یہ تین خاص نعمتیں ایسی ہیں جن کا اقرار ہر شخص کرتا ہے۔ غفلت سے چونکانے اور شکر پر اُبھارنے کے لیے چند صورتیں لکھی جاتی ہیں ممکن ہے لوگوں کے قلوب اس سے راہ پر آ جائیں۔ سمجھ دار لوگوں کو تو اتنا کافی ہے کہ نعمتوں کی جو تفصیل ہم نے لکھی ہے جس کی رُو سے زندگی کی معمولی سے معمولی ضرورت کی چیز بھی نعمت ہے اسی پر غور و فکر کریں تو شکر ادا کرنے لگیں گے۔ اور جو لوگ کسی خاص نعمت کا انتظار کرتے ہیں یا کسی مصیبت کے بعد اس سے پہلی حالت کو نعمت جانتے ہیں ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ بہ اعتبار جان، مال، صحت، تندرستی، نیکی اور برائی، ہمیشہ اپنے سے کمتر پر نظر رکھیں۔ جب ہر اعتبار سے اپنے سے کم درجے کے لوگوں کو دیکھیں گے تو بے شک شکر کریں گے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے دل میں اس بات کو جما لے کہ جب نعمت کا شکر نہیں ہوتا تو نعمت چھین لی جاتی ہے اور پھر دوبارہ نہیں ملتی۔ جب لوگوں کو نعمت ملتی ہے تو جوق در جوق ان کے پاس حاجت مند آنے لگتے ہیں۔ اگر ان حاجت مندوں سے وہ سستی برتتا ہے تو گویا اپنی نعمت کو ضایع کرنا چاہتا ہے۔

زہد و فقر

انسان کی مشکلات اور پریشانیاں اسی قدر زیادہ ہوں گی جس قدر وہ دنیا میں پھنسے گا۔ یوں کہنا چاہیے کہ تمام پریشانیوں کا سب سے بڑا سبب دنیا ہے، جس قدر دل دنیا سے فارغ اور مستغنی رہے گا مطمئن اور پُر سکون ہوگا۔ دنیا سے علیحدگی کی دو صورتیں ہیں۔ کبھی تو دنیا کسی شخص سے دور رہتی ہے، یہ تو فقر ہے۔ اور کبھی آدمی دنیا کو چھوڑ کر اس سے الگ ہو جاتا ہے یہ زُہد ہے۔ بہر حال یہ دونوں صورتیں انسان کے لیے مفید ہیں اس لیے ہم دونوں کو مختصراً بیان کرتے ہیں۔

فقر کیا ہے؟

کسی شخص کے پاس اس کی ضرورت کی چیز نہ ہو تو یہ فقر ہے۔ لیکن اگر ایک بے

ضرورت چیز اس کے پاس نہیں ہے تو اس کے نہ ہونے سے اس کو فقر نہیں کہیں گے۔ اور مال میں فقر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو کچھ مال کی ضرورت ہو اور وہ اس کے پاس موجود نہ ہو تو ضرورت کے مطابق جو مال اس کے پاس نہیں ہے' اس قدر مال میں وہ فقیر ہے۔

زہد جیسا کہ معلوم ہو چکا دنیا سے الگ رہنے کا نام ہے' اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ علیحدگی بہت مکمل ہونی چاہیے۔ حتی کہ اگر کوئی اپنے نفس کے معاملات میں مشغول ہے یا نفس کے ساتھ دشمنی میں مشغول ہے۔ دونوں خدا سے غافل' خدا کے علاوہ دوسری چیز میں مشغول کہلائے گا۔ دشمنی کرنے میں بھی خدا سے اعراض لازم آتا ہے' فرض کیجیے ایک مجلس میں عاشق و معشوق ہیں۔ کہیں سے رقیب آ گیا اب اگر عاشق کا دل رقیب کی دشمنی کی طرف متوجہ ہو گیا' اس کے اس وقت آنے کو برا جاننے میں لگ گیا' تو ظاہر ہے پوری طرح وہ مشاہدہ معشوق کی لذت سے محروم رہے گا۔ غرض کہ معشوق کے ہوتے ہوئے کسی کو محبت سے دیکھنا جس طرح مذہب عشق میں بہت بڑا جرم ہے' اسی طرح معشوق کی موجودگی میں کسی کو دشمنی اور غضب کی نگاہ سے دیکھنا بھی جرم ہے۔ تو گویا یہاں دنیا سے نفرت کرنا گویا دنیا میں مشغول رہنا ہے کیونکہ نفرت ہو یا محبت بہر حال دنیا میں مشغولیت ہے' یہ خدا اور بندے کے درمیان حجاب ہے۔

اب بحث یہ ہے کہ فقیری افضل ہے یا مالداری۔ اس بات پر لوگوں کی رائے مختلف ہے' ہر طبقہ اپنے دلائل رکھتا ہے' لیکن ہمیں ان سب سے قطع نظر امر واقعی کا ذکر کرنا چاہیے۔

دراصل مالداری اسی لیے بری ہے تا کہ وہ خدا تک پہنچنے سے روکتی ہے' اور فقیری اسی لیے پسندیدہ ہے کہ خدا تک پہنچنے میں جو رکاوٹ (مال دولت' روپیہ پیسہ) ہے وہ فقیری میں دور ہو جاتی ہے' مگر بہت سے غنی مالدار ایسے ہیں کہ ان کو غنا اور مالداری نے خدا تک پہنچنے سے نہیں روکا' اور بہت سے فقیر ایسے ہیں کہ فقیری ہی میں لگ کر خدا سے غافل ہو گئے' تو غنا کی برائی ہو یا فقر کی فضیلت اس کو مقصود کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے

۔تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ فقیری خود معرفت الٰہی سے روک دیتی ہے اور مالداری اس سلسلے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے اب افضلیت کا فیصلہ کر لیجئے۔ تاہم ہم کہیں گے کہ مالداری کا فتنہ زیادہ خطرناک ہے مفلسی کا فتنہ اتنا خطرناک نہیں ہے۔ مالداری میں پھنس کر بڑا سخت امتحان ہوتا ہے۔

فقیری کے آداب

فقیر کے لیے کچھ ظاہری اور باطنی آداب ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

آداب باطن۔ خدا نے جس حال میں رکھا ہے اُس سے کراہیت نہ ہو یعنی اپنے فقر کو برا جان کر شکوہ نہ کرے، دل سے اس پر راضی رہے اور شکر کرتا رہے۔

آداب ظاہر۔ کسی سے سوال نہ کرے، اپنی ہیئت کو بگاڑ کر نہ رہے کہ لوگوں کو رحم آئے، نہ فقر کا اظہار کرے نہ شکایت کرے۔

پھر اپنے اعمال اور افعال میں بھی بعض آداب کا خیال رکھے۔ مثلاً کسی مالدار کے سامنے بہت زیادہ انکساری و تواضع نہ کرے کہ اس کی نگاہ سے گر جائے، اپنے فقر پر ایسا اعتماد ہو کہ مالدار اس کی بے پرواہی اور استغنیٰ کو دیکھ کر حسرت کرے کہ کاش میں بھی فقیر ہوتا۔ مالداری سے لالچ یا ان کی ناراضگی کے ڈر سے کبھی حق بات کہنے سے خاموش نہ رہے، فقر کی وجہ سے کسی عبادت یا کارِ خیر میں سستی نہ کرے ورنہ وہ فقر مصیبت بن جائے گا۔

اگر کچھ مال ملے اور اپنی ضرورت سے بچ رہے تو اُسے جلد از جلد خرچ کرنے میں تکلّف نہ کرے۔ اگر مالدار فقیر کے سامنے تواضع کرتا ہے تو یہ بہت ہی عمدہ اور پسندیدہ کام ہے۔ مگر اس سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ فقیر مالدار کے سامنے بے نیازی اور بے پرواہی ظاہر کرے، فقیر کے لیے کم سے کم درجہ یہ ہے کہ مالدار کے پاس نہ بیٹھے، نہ اُن کو اپنے پاس بٹھانے کی رغبت کرے، کیونکہ یہیں سے طمع کی ابتدا ہوتی ہے اور مالدار کی شان و شوکت دیکھ کر اپنے حال سے بیزاری اور پھر ناشکری شروع ہوتی ہے۔

جب فقیر، مالداروں سے ملنے لگے تو سمجھ لو کہ وہ ریاکار ہے، فقیر کی شان یہ ہے کہ

جب اُسے کچھ ملے تو حریص کی طرح ٹوٹ نہ پڑے' اوّل تو وہ اُس چیز کو دیکھے کہ اُس کی کیا حیثیت ہے' چوری' غصب' ڈاکے وغیرہ کا مال تو نہیں ہے' پھر دینے والے کی غرض کیا ہے۔ اگر اُس نے محبت میں دل خوش کرنے کے لیے دیا ہے تو یہ ہدیہ ہے' اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں بلکہ لینا چاہیے اور اگر غرض یہ ہے کہ شہرت اور ریاکاری کی وجہ سے دے رہا ہے تو نہ لے' واپس کر دے۔ پھر لینے والا اپنے آپ کو بھی دیکھ لے' اگر وہ اپنے لیے لے کر رکھنا چاہتا ہے تو ایک فقیر راہِ خدا پر گامزن کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ زائد از ضرورت سامان لے کر آئندہ کے لیے رکھ چھوڑے۔ اور اگر لے لیا ہے تو اب ذرا ایسا کام کرے جو نفس پر شاق گزرے یعنی ظاہر میں لے لیا تو اُس کو چپکے سے غریبوں میں تقسیم کر دے۔ حاجت سے زائد جو چیز آئے اس کو خدا کی طرف سے امتحان خیال کرے کہ خدا نے یہ سامان دے کر امتحان و آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

اور اگر وہ اپنے لیے نہیں لے رہا ہے بلکہ کچھ غریبوں اور فقیروں کی ذمے داری اپنے سر لے رکھی ہے تو حاجت سے زائد لے سکتا ہے' مگر لے کر فوراً تقسیم کر دے' اپنے پاس نہ رکھے۔ ہوسکتا ہے دل میں لالچ پیدا ہو جائے نیت بدل جائے۔

فقیر سوال کرسکتا ہے یا نہیں

سوال کرنا مطلقاً منع ہے۔ انسان سے سوال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے خدا کی شکایت کی ہے اُس نے آپ کی ضرورت پوری نہیں کی اس لیے انسان سے ضرورت کے لیے سوال کرنا پڑا۔ ایک شخص کا غلام کسی دوسرے سے کچھ سوال کرے تو اُس شخص کی کس قدر توہین کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سوال کرتے وقت سائل اُس شخص کے سامنے خود کو ذلیل کر رہا ہے جس سے سوال کیا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ صرف خدا کی ذات ہے کہ انسان اس کے سامنے خود کو ذلیل کرے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے سامنے انسان خود کو ذلیل کرے۔ تیسرے جب کوئی شخص سوال کرتا ہے تو دوسرے کو پریشانی میں ڈالتا ہے کیونکہ بعض اوقات سوال پورا کرنے کو دل نہیں چاہتا مگر سوال کرنے والا بار بار اصرار کر کے

اُسے مجبور کر رہا ہے۔ وہ شرم یا اصرار سے مجبور ہو کر دیتا ہے۔ نہیں دیتا تو غیرت آتی ہے' غرض دونوں طرح اُسے ایذا پہنچتی ہے۔ جب سوال ان وجوہ سے بالکل منع کر دیا گیا ہے تو اس کی بالکل اجازت نہ ہونی چاہیے۔ مگر ہم اکثر مواقع پر اس کی اجازت بھی پاتے ہیں' تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ سوال ویسے تو منع ہے لیکن ایسی حاجت جو ضرورت انسانی کے قریب ہو' جس کے بغیر چارہ' کار نہ ہو اور جس کے علاوہ مفر کا کوئی راستہ نہ ہو اس وقت سوال کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ جس کے پاس ضرورت سے زائد سامان ہو یا سوال کر کے ضرورت کے مطابق سامان جمع کر لیا ہے اس کے بعد مانگنا یا سوال کرنا یہ بڑا اور ممنوع ہے۔ سائل جو جھولی بھر لیتے ہیں اور سوال کرتے پھرتے ہیں وہ سائل نہیں' تاجر ہیں حضرت عمرؓ ایسے سائلوں کو دُرّے مارا کرتے تھے۔

غنا کی مقدار جس کے بعد سوال منع ہو وہ بھی معلوم ہونی چاہیے۔ اس میں ضروریات زندگی کا لحاظ کرنا ہوگا اور انسان اگر صحیح معنوں میں دیکھے تو تین چیز ضرورت کی ہے۔ غذا' لباس اور مکان۔ ان تینوں میں معیار جس قدر بڑھاتا جائے گا' بڑھتا جائے گا۔ باقی صحیح اندازہ یہی ہے کہ سادہ لباس تن ڈھانکنے کو' سادی غذا اور حسب ضرورت مکان کافی ہے۔ باقی رہا غذا میں کام و دہن کی لذت کو شامل کرنا یا مکان میں نقش و نگار اور لباس میں فیشن یہ سب فقیر اہل سلوک کے لیے زیبا نہیں ہیں۔ یہ اصول ایسے ہیں کہ ان کو کسی ضابطے میں مقید کرنا مشکل ہے۔ اس میں انسان خود اپنے معاملات کا جائزہ لے اور تعیشات کے بوجھ سے خود کو آزاد کر کے ضرورت تک محدود رکھے۔

زہد کا بیان

کبھی انسان ایک شے کو چھوڑ کر دوسری چیز کی طرف رغبت کرتا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے دل میں دو جذبے کام کرتے ہیں۔ پہلی چیز سے نفرت اور دوسری جسے وہ لینا چاہتا ہے اس سے محبت' یعنی وہ پہلی چیز کو بری سمجھتا ہے اور دوسری کو اچھی جانتا ہے' اس اصول پر اگر کوئی دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو چاہتا ہے تو زاہد کہلائے گا۔ اب جو خدا کے علاوہ ہر

چیز سے دل ہٹا لے حتی کہ اُسے اپنے عمل وفعل سے سوائے خدا کے اور کسی انعام کی غرض نہ رہے وہ زاہد مطلق ہوگا اور جو دنیا سے دل ہٹالیں مگر صرف خدا اُن کا مقصود نہ ہو بلکہ وہ دوسری نعمتوں کی لالچ بھی رکھتے ہوں زاہد وہ بھی ہیں مگر کم درجے کے ہوں گے' پھر زاہد وہ نہ ہوگا جس کے پاس دنیا نہ ہووہ دنیا چھوڑ دے کیونکہ ترک دینا میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ جو چیز چھوڑی جارہی ہے وہ اُس کے قبضے ہی میں نہیں ہے اس کو چھوڑنا کیا معنی رکھتا ہے اور اس ترک میں ضروری ہے کہ جس طرح ظاہر میں ایک چیز کو چھوڑ دیا ہے دل اور ذہن بھی اس سے ہٹالے، اعضائے بدن کو بھی اس سے فارغ کرلے جیسے کوئی جب اپنی کوئی چیز بیچ دیتا ہے تو اس کے سامنے بھی اس کے مال کے بدلے میں وہ نقد جو خریدار سے اسے مل رہا ہے زیادہ بہتر ہوتا ہے اور اس کا اپنا مال کم درجے کا ہوتا ہے جبھی اس سے دل ہٹالیتا ہے اور ایسا ہٹاتا ہے کہ اس بیچے ہوئے مال کا خیال بھی نہیں آتا، نہ اس کی طرف نظر کرتا ہے، تو وہ تاجر اپنے فروخت شدہ مال کے لحاظ سے زاہد کہلاتا ہے گا۔

زہد کے مختلف درجے ہیں، ایک شخص دنیا میں زہد کرتا ہے مگر دنیا کی خواہش بھی ہے۔ دل دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے جس کو وہ بہ جبر روکتا ہے یہ شخص متزہد کہلائے گا، یہ زہد کی ابتدا ہے۔ ایسے کے بارے میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں دنیا کی محبت اسے دبا نہ لے اور اس کا مجاہدہ بیکار ہو جائے دل پھر دنیا میں پھنس جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا کو برضا ورغبت چھوڑ دے یعنی جس چیز کو اب حاصل کرنا چاہتا ہے اسکو دنیا کے مقابلے میں قیمتی جانتا ہو۔ اب اگر اس کو اپنے زہد کا احساس ہے اور اسے خیال آرہا ہے کہ ہم نے ایسی چیز چھوڑ دی ہے جس کی بہر حال کوئی حیثیت تھی تو یہ درجہ بھی نقصان کا ہے اور اس میں بھی کچھ زیادہ فضیلت نہیں ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ زہد برضا ورغبت اختیار کرلیا ہے۔ ساتھ ہی اسے کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ میں نے کیا چیز چھوڑی ہے یعنی دنیا اس کے نزدیک اس قدر حقیر وذلیل تھی کہ اس کو اس قابل نہیں جانتا کہ اس کے چھوڑنے کی بھی کوئی قیمت سمجھتا ہو جیسے ابو یزید ایک بزرگ نے عبدالرحیم دوسرے بزرگ سے پوچھا۔ میاں ابھی آپ کیا ذکر رہے تھے؟

کس چیز میں زہد کا ذکر تھا، انہوں نے کہا کہ میں ترکِ دنیا کا ذکر کر رہا تھا۔ ابو یزید نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ ارے میں سمجھا کسی چیز کے چھوڑنے کا ذکر تھا۔ دنیا تو ناچیز ہے اس کا چھوڑنا ہی کیا؟ تو یہ ہے زہد کا کمال۔ اور دوسرے کمال زہد یعنی دنیاوی لذتوں کو چھوڑنے کا یہ ہے کہ یہ ترک دنیا نہ تو اس لیے ہو کہ اس پر کوئی انعام ملے گا، نہ کسی خوف و خطرے سے بچنے کے لیے ہو، بلکہ محض ہمہ تن خدا میں مستغرق ہو اور وہی ذات، اس کی خوشی، اس کی رضا اس کا مقصود ہو۔ دراصل موحد حقیقی وہی ہے جو خدا کے سوا کسی چیز کو طلب نہ کرے کیونکہ خدا کے علاوہ کسی چیز کو طلب کرنا خدا کو چھوڑ کر اس چیز کی عبادت کرنی ہے۔

زہد کی کچھ جامع قسم کی علامات ہیں۔ مثلاً زاہد وہ ہے جو موجود چیز پر بہت خوش ہو نہ معدوم اور گمشدہ چیز پر رنجیدہ ہو اور اگر کوئی اس کو برا کہتا ہے یا اس کی تعریف کرتا ہے تو اس پر کوئی اثر نہ پڑے۔ اس کی نظر میں دونوں برابر ہوں۔ اسے خدا سے محبت ہو اور خدا کی محبت میں ماسوا سے بے نیاز ہو۔ دنیا میں اپنے اعزا، رشتے دار اور خدا کی دوسری تمام مخلوق سے محبت ہو تو وہ بھی خدا کے لیے ہو۔ جس میں یہ علامات ہیں اسے زاہد کہا جا سکتا ہے۔

محبت، شوق اور اُنس

محبت کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ علم و معرفت ضروری ہے۔ علم و معرفت کا یہ مطلب ہے کہ جس چیز سے محبت کرتا ہے اُسے جانتا ہو۔ جاننے اور پہچاننے کا شعور ہو۔ اس تعریف کے بعد خود بخود جمادات اور نباتات وغیرہ اس سے نکل جاتے ہیں کہ وہ کسی سے محبت کر سکیں۔ محبت میں طبیعت کا میلان ایسی چیز کی طرف ہوتا ہے جس سے طبیعت کو لذت ملتی ہے۔ اگر لذت نہ ملے بلکہ تکدر ہو تو وہاں نفرت ہوگی محبت نہ ہوگی۔ یہی طبعی میلان جب پختہ ہو جاتا ہے تو عشق بن جاتا ہے۔

یہ بات طے ہے کہ انسان کو اپنے نفس سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے نفس کے علاوہ دوسروں سے بھی محبت کرتا ہے مگر یہاں بھی کسی نہ کسی درجے میں اس کے نفس کو فائدہ ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ غیر سے محبت ہو اور اس کے اپنے نفس کو دخل نہ ہو یہ

ذرا مشکل امر ہے۔ اگرچہ ایسی محبت بھی پائی جاتی ہے اور ممکن ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جو اپنے آپ سے اور اپنے نفس سے محبت کرتا ہے تو اس کی طبیعت میں یہ رغبت ہوتی ہے کہ اس کا نفس دائمی طور پر باقی اور قایم رہے۔ اسی لیے انسان موت سے نفرت کرتا ہے کہ اس میں نفس کا دوام اور بقا ختم ہو جاتا ہے۔ موت سے اس لیے نہیں ڈرتا کہ موت کے بعد کے حالات سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا تو شاید ہی کسی کو احساس ہوتا ہو۔ پھر دوسری بات انسان کی فطرت میں یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کا کمال دیکھنا چاہتا ہے، نفس کا نقصان انسان کو کسی حال میں گوارا نہیں ہے۔ اب انسان جو اپنے اعضاء مال و دولت، عزیز و اقارب، رشتے دار اور دوستوں سے محبت کرتا ہے تو وہاں یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ ان سب باتوں سے اس کے نفس کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ اور ہر انسان جو اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے وہاں بھی یہی نفس کا دایم اور باقی رہنا مطلوب ہوتا ہے کیونکہ انسان نفس کی بقا تو چاہتا ہے مگر یہ بھی جانتا ہے کہ یہ تمنا فضول ہے، نفس کو دوام اور بقا بہر حال نہیں مل سکتی تو وہ اولاد کو اپنے بعد اپنا نائب اور قایم مقام جانتا ہے اور چاہتا ہے کہ میرا لڑکا باقی رہے تاکہ نسل باقی رہے اور نسل کی بقا میں کسی نہ کسی درجے میں اس کی اپنی بقا ہے۔ لوگ ہمیشہ اس لڑکے کو اس کے نام سے جانیں گے تو دنیا میں نام تو زندہ رہے گا۔ عزیز دار سے محبت اس لیے ہوتی ہے کہ انسان ان سے اپنے نفس میں قوت محسوس کرتا ہے اور یہ بہر حال نفس کا کمال ہے، یہ محبت کا پہلا سبب ہے کہ انسان کو اپنے نفس سے محبت ہوتی ہے۔

دوسرا محبت کا احسان ہوا کرتا ہے۔ مشہور ہے ''الانسان عبدالاحسان انسان'' احسان کا بندہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ احسان کرنے والوں سے محبت ہوتی ہے اور اگر غور کیا جائے تو اس کا سرا بھی اول سبب سے جا ملتا ہے کیونکہ احسان کرنے والا مدد ہی کرتا ہے اور اس مدد سے نفس کو دوام یا کمال حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے جو شخص محسن سے اس کے احسان کی وجہ سے محبت کرتا ہے، وہ محسن کی ذات سے محبت نہیں کرتا اس کے اس احسان کی وجہ سے کرتا ہے۔ تیسری وجہ محبت کی یہ کہ کسی شخص یا چیز کی ذات سے محبت ہو جائے خواہ

اس سے خود کو کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، یہی محبت محبت حقیقی کہلاتی ہے اور یہ محبت دیرپا ہوتی ہے جیسے کسی جمال کی اور خوبصورتی کی محبت۔ یہاں جمال کا ادراک خود ایک لذت ہے، اور لذت انسان کو بہرحال محبوب ہوتی ہے۔ سبزہ، آب رواں، فطرت کے دوسرے مناظر بالطبع محبوب ہوتے ہیں، انہیں سوائے دیکھ کر لذت پانے کے اور کوئی نفع نہیں حاصل ہو سکتا۔ یہاں حسن اور جمال کو کسی خاص صورت شکل سے مقید نہ کریں بلکہ حسن و جمال کا حقیقی اور وسیع تصور ذہن میں رکھیں کیونکہ بعض آواز، بعض نقش و نگار، بعض خوبصورت خیالات اپنے اندر حسن رکھتے ہیں اگرچہ وہ ظاہری شکل صورت سے خالی ہیں۔ اسی طرح زندگی کے تمام کاموں میں ایک حسن مطلوب ہوتا ہے۔ جو پسندیدہ بھی ہوتا ہے، اس حسن کی تھوڑی سی تفصیل ضروری ہے، کسی شے کا حسن اور جمال دراصل یہ ہے کہ جس قدر کمال اس شے کے لیے مناسب ہو سب اس میں پائی جائے۔ جب وہ تمام کمال جو اس شے میں ممکن ہو اس میں جمع ہو جائے تو اس شے کو بہت حسین کہیں گے۔ اور کمال میں جس قدر کمی ہوگی اسی قدر حسن کے معیار سے گری ہوگی۔ مثلاً حسین گھوڑا وہ ہے جس میں ایک گھوڑے کی تمام ممکنہ خوبیاں جمع ہو جائیں۔ صورت، شکل، رنگ، خوش، رفتاری، مالک کی اطاعت وغیرہ یا عمدہ خط وہ ہے جس میں خوشنویسی کے تمام اوصاف کا کمال پایا جائے حروف مناسب ہوں، کشش درست ہو، نشست صحیح ہو، کرسی اور دائرے برابر ہوں۔

بعض اوقات حسن ایسی چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے جن کا حواس و ادراک سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مثلاً کسی کا اخلاق عمدہ ہو، کسی میں بہترین خصلت ہو، کسی کے بات کرنے کا افہام و تفہیم کا انداز نہایت خوبصورت ہو، دیکھیے ان چیزوں کا حواس خمسہ سے کوئی تعلق نہیں، اس کا تعلق دل اور ذہن کی پسندیدگی سے ہے۔ چونکہ یہ تمام خوبیاں اچھی ہیں اس لیے جس شخص میں یہ خوبیاں پائی جائیں گی اسے بھی لوگ پسند کریں گے۔ اسی طرح انسانوں کا پہلے گزرے ہوئے بزرگوں سے محبت کرنا بھی باطنی احساس کے ذریعے ہوتا ہے۔ یعنی ان لوگوں میں جو خوبیاں تھیں ان کی وجہ سے آج تک لوگ انھیں پسند کرتے

ہیں۔ معلوم ہوا کہ بعض حُسن و جمال اور اچھائیاں وہ ہیں جو محض نورِ بصیرت سے معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا ظاہری اعضا سے کوئی تعلق نہیں' اچھائی' نیکی' حسن و جمال کے بذات خود محبوب ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ کسی بادشاہ کے بارے میں بتایا جائے کہ وہ عادل' انصاف پسند' رعایا پرور' مہربان' داد و دہش کرنے والا تھا تو دل ایسے حاکم کی طرف کھنچتا ہے' خواہ اُسے مرے ہوئے صدیاں گزر چکی ہوں یا وہ زندہ بھی ہو تو ہزاروں میل دور ہو' کہ کسی حال میں خود کو اس سے فائدہ پہنچنے کی توقع نہ ہو مگر دل اس کی طرف ضرور مائل ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ محبت میں یہ ضروری نہیں کہ کسی پر احسان ہی کیا جائے تب محبت ہو گی بلکہ محسن اپنی ذات سے بھی محبوب ہوتا ہے کیونکہ اس میں بعض حُسن و خوبیاں ایسی ہیں جو بذات خود مطلوب اور محبوب ہوتی ہیں۔ ایک سبب محبت کا اور ہے۔ وہ ہے نہایت لطیف قسم کی پوشیدہ مناسبت' ایسی مناسبت جو حبیب اور محبوب کے درمیان ہوتی ہے' یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات بغیر کسی ظاہری غرض کے صرف دو روحوں کی باہمی مناسبت سے دو آدمیوں میں محبت ہو جاتی ہے۔

محبت کرنی ہے تو صرف خدا سے کرو

جب معلوم ہو گیا کہ محبت کے لیے کچھ سبب' کوئی وجہ ہوتی ہے' ظاہر ہے یہ سبب اور یہ جس میں پائی جائے گی' اسی سے محبت ہو گی اور جس ذات میں جس قدر کم زیادہ یہ محبت کا سبب ہو گا اس سے اسی قدر کم زیادہ محبت ہو گی۔ اب اسباب کو اور خصوصیات کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو ایک ذات میں یہ ساری خوبیاں پوری طرح نظر آئیں گی اس لیے اسی سے محبت کرنی چاہیے اور وہی محبت کے لائق ذات ہے اور وہ خدا کی ذات ہے' مثلاً پہلا سبب اپنے نفس سے محبت ہے۔ اب اگر انسان صحیح طور پر پہچان لے' جان لے اور مان لے کہ جو چیز اسے اس قدر عزیز' اور محبوب ہے اس کو پیدا کرنے والا' مکمل کرنے والا' باقی رکھنے والا خدا ہے تو کوئی معنی نہیں کہ اُسے خدا سے محبت نہ ہو جائے۔ جس شخص کو بھی اپنا نفس محبوب ہو گا اسے ضرور خدا سے محبت ہو گی کیونکہ اسی نے یہ محبوب نفس اُسے عطا کیا ہے۔ دوسرا سبب لو۔

یعنی انسان اس سے محبت کرتا ہے جو اس کی جانی ' مالی مدد کرے ' دشمنوں سے اس کی حفاظت کرے ' تمام بڑے فتنوں کو اس سے دفع کرے ۔ تو اس پہلو سے بھی سوچیے تو خدا کے علاوہ کون ہے جس سے محبت کی جائے ۔ کیا یہ باتیں خدا سے بڑھ کر یا خدا کے علاوہ کوئی کر سکتا ہے ۔ اگر کوئی انسان احسان کرتا ہے تو وہ بھی تو خدا ہی کرتا ہے ۔ آخر اس انسان کو کس نے پیدا کیا ' جس نے احسان کیا ' اس کے مال کو کس نے پیدا کیا جس سے احسان ہوا ۔ اُس شخص میں یہ قدرت اور یہ ارادہ کس نے پیدا کیا کہ اُس نے تم پر یہ احسان کیا ۔ تمھاری طرف اس کے دل میں توجہ اور محبت کس نے پیدا کی کہ اوروں کو چھوڑ کر اس نے تمھارے ہی ساتھ احسان کیا ۔ پھر اس کے دل میں کس نے یہ بات ڈالی کہ تمھارے ساتھ احسان کرے تو دنیا میں یا دنیا چھوڑنے کے بعد اُسے نفع ملے گا ۔ ان باتوں پر غور کرو تو خدا ہی کی ذات سامنے آئے گی اور معلوم ہوگا واقعی وہی محبت کے لائق ذات ہے ۔

تیسرا سبب لو کہ انسان دوسرے انسان سے اس کی نیک عادتوں ' اچھی خصلتوں کے باعث محبت کرتا ہے ' اس میں یہ ضروری نہیں کہ محبت کرنے والے پر بھی اس نے احسان کیا یا نہیں ۔ اس اعتبار سے بھی وہ تمام کمالات اور خوبیوں کا مجموعہ اور مرکز ہے وہی محبت کرنے کے لائق ہے ۔

چوتھا سبب لیجیے ۔ حُسن و جمال ۔ جمال ظاہری تو ظاہری آنکھ سے سوجھتا ہے ۔ مگر جمال باطنی کا ادراک تو باطنی آنکھوں سے اہل باطن ہی کر سکتے ہیں اور جو جمال کہ دل سے اس کا ادراک ہوتا ہے تو وہ دل کو محبوب بھی ہوگا ۔ جیسے کسی نیک شخص سے محبت ہو جو عرصہ ہوا دنیا سے جا چکا ہے تو ظاہر ہے یہاں انسان باطن کی آنکھوں سے اس کی خوبیوں کو دیکھ رہا ہے اور محبت بھی دل میں موجزن ہے ۔ یہ خوبصورتی نہ اس شخص کے چہرے کی ہے نہ ظاہری ہیئت کی اور نہ دیکھنے والا انھیں ظاہری آنکھوں سے دیکھ رہا ہے ۔ یہی باطنی حُسن ہے جس کو انسان کے حواس خمسہ ادراک نہیں کرتے ۔ ہاں جس کو یہ باطنی حسن ملتا ہے اس کے افعال و کردار میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے ' اسی سے طبیعت کی خوبصورتی کا پتہ چلتا ہے ۔ اس

لحاظ سے غور کیا جائے تو خدا کی ذات کمال سے متصف ہے اور وہی محبت کے لائق ہے۔ جو لوگ خدا سے محبت نہیں کرتے وہ یا تو خدا کے ان اوصاف کو نہیں سمجھتے یا خدا میں یہ صفت مانتے ہی نہیں یا اچھائی اور خوبیوں کو طبعاً پسند نہیں کرتے' اس قسم کی محبت تو انسان کے احسان کرنے والی محبت سے کہیں اعلیٰ اور اشرف ہے' احسان تو کبھی کبھی ہوتا ہے مگر اس محبت کی سرشاری تو ہمہ وقت دل میں رہتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ''میرے نزدیک محبوب وہ ہے جو میری عبارت بغیر کسی لالچ کے کرے۔'' اور کہا گیا ''اس سے زیادہ ظالم کوئی نہیں جو میری عبارت دوزخ کے ڈر سے یا جنت کی لالچ میں کرے۔''

معرفت اور دیدار الٰہی اعلیٰ اور اشرف کیوں ہے

انسان میں بہت سی قوتیں رکھی گئی ہیں اور ہر قوت کے لیے الگ الگ لذت ہے' اس کی لذت انتقام اور بدلہ ہے۔ بھوک ایک قوت ہے۔ اس قوت کو کھانے سے لذت ملتی ہے۔ بصیرت ایک قوت ہے' اس کو دیکھنے والی چیز سے لذت ملتی ہے۔ ایسے ہی انسان کے دل میں ایک قوت ہے' اس کی لذت یہ ہے کہ وہ حکمتوں کو جان لے' ان باتوں کو معلوم کرے جو خیال میں بھی نہ آسکتی ہوں۔ دل کی اس قوت کا نام عقل ہے۔ یہ عقل صوفیا کے نزدیک مانی گئی ہے۔ فلاسفہ اور بحث و مناظرے والی عقل یہ نہیں ہے اب جو قوت خدا کی معرفت سے لذت پاتی ہو اور اُسے دریافت کرتی ہو اس کی بلندی کا کیا ٹھکانہ' یہ قوت چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ہے گویا اس کا تقاضا علم و معرفت ہے اور یہی اس کی لذت ہے۔ علم و معرفت کی معمولی لذتوں کا حال یہ ہے کہ کسی کو معمولی سی چیز کا عالم کہہ دو' کس قدر خوش ہوتا ہے۔ اور علم میں جو معرفت جس قدر بلند ہوگی اسی قدر عالم و عارف کو لذت حاصل ہوگی گویا عالم کو لذت' معلوم کی بڑائی اور شرافت کے مطابق زیادہ یا کم ہوتی ہے' جو لوگوں کے باطن کا حال بتاتا ہے وہ کیسی لذت پاتا ہے اور کس قدر فخر کرتا ہے کیونکہ ظاہر کے مقابلے میں باطن کا علم زیادہ اہم ہے۔ پھر شہر کے رئیس کے باطن کا حال بتانا معمولی لوگوں کے مقابلے میں زیادہ وجہ مسرت اور باعث فخر کام ہے۔ رئیس کے اوپر مملکت کے وزیروں

کا حال بتائے تو اور لذّت بڑھ گئی اور وزیر سے بڑھ کر بادشاہ کا حال بتانے لگے اس کی معرفت حاصل ہو جائے تو فخر و مسرت کا کیا پوچھنا۔ معلوم ہوا کہ ''معلوم'' جس قدر اشرف و اعلیٰ ہوگا۔ علم اور عالم کا مرتبہ' اُس کی خوشی' اُس کا فخر' اور لذّت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اب ظاہر ہے ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات کا علم اور اس کی معرفت کے جاننے میں لگا رہنا یا جان لینا سب سے زیادہ اعلیٰ اور افضل کام ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جس کو ذات باری تعالیٰ کی معرفت کا ایک ذرّہ بھی حاصل ہو جاتا ہے وہ اس کی لذّت میں بالکل گم ہو جاتا ہے۔

محبت کے معاملے میں اختلاف

محبت کے معاملے میں لوگ مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی زیادہ محبت کرتا ہے کسی کو کم درجے کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں لوگ جس قدر زیادہ یا کم جانتے ہیں اسی قدر محبت میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے خدا کے چند نام سنے۔ اس کی بعض صفت سنی۔ بس وہیں تک محدود ہیں' بعض نے خدا کے بارے میں ایسے ایسے مفہوم اپنے ذہن میں ڈھال لیے کہ خدا اُس سے پاک ہے۔ بعضوں نے یہ بھی نہ کیا' بس تسلیم کے طور پر ایمان لائے' بعض وہ ہیں جو اس میدان میں گھس پڑے اور حقیقت پانے میں لگ گئے۔ غرض جو جس مقام پر ہے اس کی محبت میں ویسی ہی کمی زیادتی ہوگی۔

خدا کی معرفت سے انسان کی سمجھ قاصر کیوں ہے

یہ بات طے ہے کہ جس قدر چیزیں موجود ہیں سب سے زیادہ ظاہر اور واضح چیز خدا کی ذات ہے۔ اس وجہ سے تو اس کا سمجھ میں آنا بہت ہی آسان ہونا چاہیے مگر معاملہ اس کے برعکس ہے' ہمارا دعویٰ ہے کہ اس کا وجود ظاہر تر ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے یہ مثال سامنے رکھیے کہ ایک شخص کچھ لکھ رہا ہے یا کچھ سی رہا ہے تو اس شخص میں زندگی کی علامت' زندگی کے آثار اور حیات کا وجود صاف ظاہر ہے۔ حالانکہ زندگی کا پتہ ہمیں حواس خمسہ میں

سے کسی چیز سے نہیں چلا بلکہ لکھنے والے یا سینے والے کی حرکت سے یہ بات ثابت ہوئی۔ اسی طرح عالم اور اس کے تغیرات، انسانی جسم اور اُس کے تغیرات کو دیکھیے۔ غور کیجیے ان میں سے ہر چیز ایک شاہد، ایک دلیل ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا، حرکت اور تغیر میں لانے والا کوئی ہے ضرور۔ چونکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اُس کے وجود پر گواہ ہے اس لیے اس کا وجود اس قدر ظاہر و واضح ہے کہ عقلیں اس کے ادراک میں حیران رہ گئیں اور اُس کا ظہور نگاہوں میں پوشیدہ ہو گیا۔ کیونکہ چیزوں کا نگاہوں سے مخفی ہونا یا تو چیز کے غائب ہونے سے ہوتا ہے یا بالکل واضح ہونے سے بھی ہوتا ہے، سورج اپنے نور کے ساتھ اس قدر واضح ہوتا ہے کہ ہماری نگاہیں اس کی تاب نہیں لا سکتیں اور وہ ہم سے غائب رہتا ہے۔ ہماری عقلیں چونکہ ضعیف ہیں اور جمال خداوندی نہایت درجے پر واضح اور روشن ہے اور یہی غایت درجے کا ظہور اُس کے مخفی رہنے کا سبب ہے۔ تو بصیرت والے کائنات پر نظر ڈال کر کائنات کے پیدا کرنے والے کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، خود اپنے نفس کے مشاہدے سے بعض اوقات خدا کے وجود میں گم ہو جاتے ہیں۔ چونکہ دنیا کی ہر چیز کا شعور بچپن میں کم عقلی کے دور سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد سے مسلسل ہر شے آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ انسان برابر ان چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ان سے مانوس ہو جاتا ہے اس لیے کسی چیز میں کوئی نئی بات یا کوئی معرفت و سبق نہیں ملتا۔ ہاں اچانک کوئی نیا سبزہ، نیا جانور یا غیر مانوس کوئی بات سامنے آتی ہے تو خود طبیعت کے تقاضے سے معرفت کا قول سامنے آ جاتا ہے اور انسان واہ واہ کہہ اٹھتا ہے۔

رضا اور اُس کی حقیقت

خدا کے حکم پر راضی رہنا، رضا کی حقیقت۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خواہش کی مخالف چیزوں میں اور مصیبت میں آدمی صبر تو کر سکتا ہے باقی اس پر راضی بھی رہے یہ ممکن نہیں ہے۔ لیکن ایسے لوگ محبت کو نہیں مانتے۔ ورنہ محبت کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ محب اپنے محبوب کی ہر بات سے راضی ہو، خواہ وہ

مرضی کے موافق ہو یا مرضی کے خلاف۔ یہ رضا یا تو اس طرح سے ہو کہ جو رنج و مصیبت محبوب سے پہنچی ہو اس کا قطعی احساس ہی نہ ہو۔ اکثر ایسا ہوتا بھی ہے کہ جب دل کسی کام میں یا کسی ذات میں اُلجھ جاتا ہے تو دوسری تکلیفوں کا احساس سرے سے ختم ہو جاتا ہے' لڑنے والے کی ساری توجہ لڑائی کی طرف ہوتی ہے۔ اُسے پتہ نہیں چلتا کتنے زخم آئے کتنے اور کتنا خون بہا۔ یا پھر درد و رنج کا احساس تو ہو مگر وہ اس درد سے راضی ہو بلکہ بہ رغبت اس درد کو چاہتا بھی ہو۔ فصد کھلوانے والا یا پچھنے لگوانے والا ان دونوں کی تکلیفوں سے واقف ہوتا ہے' اُسے احساس ہوتا ہے مگر وہ اس درد پر راضی ہوتا ہے اور رغبت سے یہ کام کرواتا ہے ایسے ہی وہ شخص ہے جو خلاف طبیعت چیزوں اور مصیبتوں میں صبر بھی کرتا ہے اور راضی بھی رہتا ہے کیونکہ اُسے اس رضا کا انعام اور اس کا عظیم بدلہ معلوم ہے۔ سختی میں جو ثواب جو بدلہ جو انعام رکھا گیا ہے وہ جن لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے وہ لوگ ساری زندگی تمنا کرتے رہتے ہیں کہ کبھی سختی سے باہر نہ نکلیں۔ بعض لوگ تو رضا کے اس مقام پر ہوتے ہیں کہ کہتے ہیں ''مجھ کو وہی پسند ہے جو تجھے پسند ہے۔ اگر چہ وہ میری مرضی اور خواہش کے خلاف کیوں نہ ہو۔'' بعض صوفیا مصائب میں گرفتار ہوتے ہیں' اگر دوسرا ان سے ہمدردی اور رحم دلی کا اظہار کر دیتا ہے تو انھیں بڑا لگتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''یہ میرے اور خدا کے درمیان تیسرا شخص کیوں آ گیا۔'' اب جو لوگ اس قسم کے مقامات سے عاجز اور لاعلم ہوں انھیں یہ مناسب نہیں کہ اس پر تنقید کریں اور اس کا انکار کریں۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خواہشات کے خلاف باتوں پر رضا محال و ناممکن نہیں۔

دُعا مانگنی رضا کے خلاف تو نہیں ہے۔

دعا مانگنے سے انسان مقام رضا سے خارج نہیں ہوتا۔ اسی طرح گناہ کو برا جاننا مجرم سے خفا رہنا' گناہ کی باتوں کو بُرا جاننا' اُن کو دور کرنے کی کوشش کرنا' ان میں سے کوئی بھی رضا کے مخالف نہیں ہے۔ بعض لوگوں کو اس میں دھوکا ہوا۔ وہ کہنے لگے کہ ہر برائی اور ہر بدکاری خدا کے فیصلے سے ہوتی ہیں اس لیے ان پر راضی رہنا بندے کی شان بندگی

ہے۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ بڑائی اور بدکاری، مکروہ باتوں پر راضی نہ رہنا خود ایک عبادت اور بندگی ہے۔ چنانچہ ایک اصول یہ یاد رکھیے، انسان بڑائی اور گناہ سے دور رہ کر ان میں شریک ہوتا ہے اگر دور رہ کر یہ بڑائی اور گناہ اُسے بُرے نہ معلوم ہوں اور وہ ان سے راضی ہو جائے گویا برائی پر راضی ہونا خود برائی میں شریک رہنا ہے، اسی اصول سے اگر ایک انسان مشرق میں مارا جائے دوسرا مغرب میں ہوتے ہوئے اس کے قتل پر راضی یا خوش ہوا ہے تو یہ خود بھی اس قتل میں شریک ہے۔

نیّت، اخلاص اور صدق کا بیان

ہر چیز کے لیے ایک روح ہوتی ہے۔ عمل کی رُوح نیت ہے، ہر عمل بغیر صحیح نیت کے ایک مشقت ہے اور جس طرح دنیا میں ہر چیز کے لیے اس کی اچھائی اور خوبصورتی کا کوئی معیار ہوتا ہے ایسے ہی نیت کے اچھے اور خوبصورت ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خالص ہو، ریاکاری اور نام ونمود کے ارادے سے ملوث نہ ہو۔ خلاصہ یہ نکلا کہ ہر عمل سے پہلے نیت ضروری ہے اور نیت میں سچائی اور خلوص ضروری ہے۔ اب ہم پر لازم ہے کہ ہم نیت، سچائی اور خلوص تینوں کا بیان پیش کریں۔ ان میں سے جس کے بارے میں جس قدر بیان واختصار ضروری ہے ہم پیش کرتے ہیں۔

نیت کے بارے میں ایک اصول یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تمھاری صورتوں کو اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دلوں کو اور اعمال کو دیکھتا ہے، دلوں سے مراد یہی ہے کہ وہاں نیت کس قسم کی ہے۔ نیت سے بڑے بڑے کام بگڑ جاتے ہیں۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس نے ان کاموں کو صحیح طور پر انجام دیا ہے اور اس کا نتیجہ بھی صحیح نکلے گا۔ ایک شخص لڑتا ہے، اس لڑائی میں وہ سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نیک کام میں مصروف ہوں، خدا کے لئے لڑ رہا ہوں، مجھے اس کا انعام ملے گا۔ حالانکہ محض نیت کی خرابی کی وجہ سے اس کی ساری محنت اکارت ہو جاتی ہے یعنی حقیقت میں اس کی یہ لڑائی یا حمیت وغیرت کے لیے ہوتی ہے یا خالص دنیاوی سلطنت اور ریاست وثروت کے لیے یا تعصب کی وجہ سے اور ان تمام صورتوں میں اس کا یہ

سمجھنا کہ میرا یہ فعل نیک اور خدا کے لیے ہے قطعی غلط ہے۔ اگر کوئی کسی سے قرض لے رہا ہے اور واپس کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو وہ چور ہے۔ ان باتوں سے نیت کی اہمیت اور عمل میں نیت کا مقام معلوم ہوتا ہے۔

نیت' قصد و ارادہ سب ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہ سب دل کی ایک حالت کا نام ہے اور یہ حالت علم و عمل کے درمیان میں ہوتی ہے۔ علم اس سے پہلے ہوتا ہے کیونکہ اگر کسی شے کا علم ہی نہ ہوگا تو اس حالت کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے انسان کا ہر کام اس کی ہر حرکت اور سکون تین چیزوں سے پورا ہوتا ہے۔ علم' ارادہ اور قدرت' کیونکہ انسان جس چیز کو نہیں جانتا اس کا ارادہ نہیں کرتا لہٰذا علم ضروری ہوا۔ اور کام نہیں کرتا جب تک ارادہ نہیں کرتا' لہٰذا عمل کے لیے ارادہ ضروری ہوا اور ارادہ کہتے ہیں دل کا کسی کام کے لیے تیار ہونا۔ ایسا کام جو اُس کے خیال میں اُس کے اپنے مقصد کے لیے موافق اور مفید ہو۔ پھر صرف ارادہ ہی کافی نہیں ہے۔ ارادے کے بعد کام پر قدرت کا ہونا بھی ضروری ہے جس کی وجہ سے وہ اعضا کو حرکت دے کر کام کر سکے۔ اگر قدرت نہ ہو تو محض ارادے کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک اپاہج شخص جس کے ہاتھ پاؤں گل چکے ہوں لاکھ ارادہ کرے مگر کوئی چیز لے نہیں سکتا۔ معلوم ہوا بدن کے اعضا بغیر قدرت کے حرکت نہیں کر سکتے اور قدرت ارادے کی منتظر رہتی ہے اور ارادہ علم و معرفت کا محتاج ہے۔ تو جب علم کے بعد دل میں یہ بات جم جاتی ہے کہ فلاں کام ہمارے لیے مفید اور ہمارے مقصد کے موافق ہے تو ارادہ اٹھتا ہے اور جب ارادہ ہوتا ہے تو قدرت ارادے کی تابع ہے اور ارادہ علم کے بعد دل میں اعتقاد جم جانے کا محتاج ہے۔ چنانچہ ہم نیت کو اعتقاد اور قدرت کے درمیان کی ایک حالت کہہ سکتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نیت بہر حال ایک مخفی معاملہ ہے اور پوشیدہ چھپ کر کی جانے والی نیکی' ظاہری نیکی سے بڑھ کر ہوتی ہے اس لیے نیت عمل سے بہتر ہے۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ ایک طرف عمل بے نیت کا ہو' دوسری طرف نیت بے عمل کی ہو تو ایسی نیت جس کے ساتھ عمل نہ ہو' یعنی صرف نیت' اُس عمل سے بہتر ہے جس میں نیت نہ ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ دل اگر کسی اچھے کام کا ارادہ کرے تو یہی نیت ہے اور تمام ظاہری اعمال کے کرنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ دل خیر کے ارادے کا عادی ہو جائے اور بھلائی اس میں جم جائے تو جب مقصود اصلی دل کا خیر کی طرف مائل ہونا اور خیر پر جم جانا ہے تو اس لحاظ سے یقیناً نیت افضل شے ہے، کیونکہ صرف اعضا کی حرکت کو تو طاقت نہیں کہا جا سکتا جب تک اُس حرکت سے خیر کا ارادہ بھی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی نیک کام کا ارادہ کیا اور کسی وجہ سے کام نہ کر سکا، عمل نہ ہو سکا۔ تب بھی یہ شخص عمل کرنے والوں میں شمار ہوگا، کیونکہ ارادہ تو کیا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی وجہ سے کام نہ کر سکا۔

نیت سے کس قسم کے اعمال پر اثر پڑتا ہے

ہم مختصراً اعمال کی تین قسم کر کے دیکھیں گے کہ ان پر نیت کا اثر پڑتا ہے یا نہیں۔

اول معاصی۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ ہم کوئی سا برُا فعل برُا کام کریں اور نیت اچھی رکھیں تو وہ کام حسن نیت کی وجہ سے اچھا ہو جائے گا تو یہ غلطی ہے، نیت کی وجہ سے کام کی برُائی ختم نہیں ہو جاتی۔ جس چیز میں ذاتی طور پر کوئی شر ہو اس میں نیت کی وجہ سے خیر نہیں آ سکتی۔

اخلاص

دنیا کی ہر چیز میں آمیزش اور ملاوٹ ہوتی رہتی ہے۔ اب اگر کوئی چیز اس آمیزش سے خالی ہوتی ہے تو ظاہر ہے اسی کو خالص کہیں گے۔ افعال سے بھی جب ملاوٹ اور آمیزش ختم ہوتی ہے تو وہ خالص ہوتے ہیں۔ انسان کو جو قدرت عطا ہوئی ہے وہ کسی نہ کسی سبب سے وجہ سے، عمل کی طرف اُٹھتی ہے، قدرت کبھی ایک ہی سبب سے عمل کی طرف اُبھارتی ہے، کبھی اس کے لیے دو سبب ہوتے ہیں۔ جب سبب صرف ایک ہی ہو تو اُس وقت جو فعل صادر ہوتا ہے اس کو اخلاص کے ساتھ عمل کہا جائے گا، جیسے ایک شخص نے صدقہ دیا اور اُس کی غرض صرف ایک ہے یعنی ریا یا نام و نمود تو وہ مخلص ہے اس اعتبار سے کہ ریا تنہا ایک سبب ہے جو صدقے پر اُبھار رہا ہے۔ اس میں کسی اور سبب کی آمیزش نہیں ہے اور جو محض خدا کی خوشنودی کے لیے صدقہ کر رہا ہے وہ بھی مخلص ہے کیونکہ اُس کے سامنے

بھی ایک ہی سبب ہے۔ یہ تعریف لغت کے اعتبار سے ہے مگر اصطلاح کے لحاظ سے اخلاص اسی کو کہتے ہیں کہ نیت صرف خدا کے لیے خالص ہو اور کوئی دوسری آمیزش اس میں نہ ہو۔

اخلاص بہت کمیاب دولت ہے' دلوں کا آمیزش سے پاک رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے' خصوصاً علما کے لیے یہ کام بہت مشکل ہے۔ برسوں لوگ علم کی خدمت میں لگے رہتے ہیں یا نیک کاموں میں مصروف رہتے ہیں' اُنھیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کا سارا عمل محض اخلاص نہ ہونے کی بنا پر بیکار ہو رہا ہے' ریا کاری اور نام و نمود کی مخفی خواہش ان کے ذہن و دماغ میں پرورش پاتی رہتی ہے۔ واعظ کو دیکھیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس بات کی خوشی ہے کہ خدا نے ہم سے اُمّت کی اصلاح کا کام لیا حالانکہ کوئی دوسرا واعظ اُن سے اچھا وعظ کہتا ہو' لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو جائیں تو اُن کو کس قدر بُرا معلوم ہوگا۔ اگر اُن کے وعظ کا مقصد اُمّت کی اصلاح تھی تو ان کو دوسرے واعظ کے آ جانے سے خوش ہونا چاہیے کہ خدا نے ان کی مشکل آسان کر دی' اب تنہا محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ اور مقصد یعنی اُمّت کی اصلاح آسانی سے مکمل ہو جائے گی وہ بہانہ کریں گے کہ ہمیں یہ غم ہے کہ اب اصلاح اُمّت کا ثواب جو ہمیں ملتا تھا وہ دوسرے کو ملنے لگا۔ حالانکہ کوئی شخص ایک کام دین یا مخلوق کی خدمت کا اگر اپنے سے بہتر کسی شخص کے سپرد کر دے تو اس میں زیادہ ثواب ہے۔

صدق

کم از کم چھ چیزیں ہیں جن میں صدق ہو سکتا ہے۔ قول میں صدق' نیت کا صدق' عزم و ارادے کا صدق' ارادے کے پورا کرنے میں صدق' عمل میں صدق اور معاملات کی تحقیق میں صدق۔

زبان کے صدق کا مطلب یہی ہے کہ گذشتہ اور آیندہ کی خبروں میں صدق ہو۔ وعدے کا پورا کرنا' خلاف وعدہ نہ کرنا' یہ بھی اس میں آتے ہیں۔ ہر انسان پر لازم ہے کہ اپنی زبان اور اپنے قول کا نگراں رہے۔ ہمیشہ وہ بات کہے جو واقعے اور حقیقت سے متعلق ہے۔ صدق نیت کی بات یہ ہے کہ تمام حرکات و سکنات میں اس کی غرض و غایت خدا کی خوشنودی

ہو اور کسی سبب یا وجہ کا اس میں دخل نہ ہو ورنہ صدق نیت باقی نہ رہے گا۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ نیت کی سچائی کے لیے اخلاص ضروری ہے یعنی جو نیت میں سچا ہو گا وہ مخلص بھی ہو گا کیونکہ یہی مفہوم اخلاص کا بھی ہے۔ صدق عزم و ارادے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان سوچتا ہے اگر میرے پاس اتنے پیسے ہوں تو میں غریبوں کی خدمت کروں۔ تو جب یہ سوچے یا کسی نیک کام کرنے کے بارے میں سوچے تو اس میں قطعی لچک یا بہانہ شامل نہ ہو۔ پختہ ارادہ رکھے کہ اگر ایسا ہوا تو ضرور غریبوں کی خدمت اور دوسرے نیک کام کرے گا۔ اگر سوچ رہا ہے مگر دل میں کچھ بہانہ ہے یا پیسے کی محبت کی وجہ سے یہ عزم کمزور ہے تو عزم کا صدق باقی نہ رہا۔

چوتھا صدق عزم کو پورا کرنے میں ہے۔ عام طور پر لوگ عزم کر لیتے ہیں۔ جیسے وعدہ کسی سے کسی کام کا کر لیتے ہیں۔ سوچتے ہیں کرنے میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے موقع ملا نفس تیار ہوا تو پورا کریں گے نہیں تو نہ کریں گے مگر موقع پر جب وقت آتا ہے قدرت حاصل ہوتی ہے تو ڈھیلے پڑ جاتے ہیں یہ بات عزم کی وفا میں صدق کے خلاف ہے اعمال کا صدق یہ ہے کہ جرأت و ہمت کے ساتھ جو خیر دل میں اُبھرا ہے اس کے مطابق ظاہر میں عمل ہو ایسا نہ ہو کہ ظاہری عمل دل کے خیال سے الگ ہو یہ بات ریا کو چھوڑنے سے آتی ہے ریا کار کے ظاہری عمل اور دل کے ارادے میں تضاد اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے ایک بزرگ ابو عبید تستریؒ عرفہ کے دن (جس دن حج ہوتا ہے) عصر کے بعد اپنا کھیت جوت رہے تھے ایک صوفی ان کے پاس آئے ان کے کان میں کچھ کہا انھوں نے انکار میں سر ہلا دیا وہ صوفی مستانہ وار جھومتے ہوئے واپس ہو گئے تستریؒ کے ایک ساتھی یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے انھوں نے بڑھ کر معاملہ دریافت کیا تستریؒ نے جواب دیا یہ شخص مجھ سے حج میں چلنے کو کہہ رہا تھا میں نے انکار کر دیا کیونکہ میں نے حج کی نیت نہیں کی تھی میں نے تو شام تک اس کھیت کو جوت کر ختم کرنے کی نیت کی ہے اس صورت میں ایک کام کو عبادت میں کیسے شریک کر لوں میرے لیے تو کھیت کو مکمل کر لینا ستر حج سے بہتر اور افضل ہے

مراقبے اور محاسبے کا بیان

اہل بصیرت پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اپنے نفس کا محاسبہ اور اپنے احوال کی نگرانی سے انسان کا نفس کس قدر قابو میں رہتا ہے وہ وقت کے ایک ایک لمحات کی اور ہر سانس کی نگرانی رکھتے ہیں

ایک تاجر جب دن بھر کی محنت کے بعد اپنا حساب کرتا ہے تو اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ کچھ نفع ملے اب ہر چیز اور ہر نیکی کے لیے عقل کو تاجر سمجھے اور نفس کی پاکیزگی نفع ہے کیونکہ ساری کامیابیوں کا دارومدار نفس کی پاکیزگی پر منحصر ہے۔ اور یہ نفس کی پاکیزگی ہمیشہ اچھے کام کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ نفس کو ان کاموں کی طرف لگائے جن سے اُسے پاکیزگی حاصل ہو اور برابر محاسبہ کرتی رہے کہ نفس نے کہاں تک نفع حاصل کیا۔

یوں تو انسان اپنی ہر سانس اور پوری زندگی کا جائزہ لیتا رہے اور بہکنے یا بھٹکنے سے اُسے روکے، ساری متاع یہی عمر کا معمولی سا حصّہ ہے جس قدر خیر کرنا ہے، نیکی کمانی ہے اسی عمر میں کر لی جائے، اسی لیے بڑی ہوشیاری سے اس حیات مستعار کو کام میں لگایا جائے۔ بدن اور جسم کے تمام اعضا کو فکر و ذہن کی ساری صلاحیت کو مفید کاموں میں خرچ کیا جائے، مثلاً زبان کا معاملہ یہ ہے کہ زبان ہلانے میں کوئی مشقت نہیں ہوتی مگر اس کی خطا و لغزش بے شمار ہے۔ غیبت، جھوٹ، چغلی، فخر و غرور، دوسروں کی حقارت، لڑائی، جھگڑا، گالی یہ سب زبان کی آفتیں ہیں لہٰذا نفس پر جبر کر کے زبان کو ان باتوں سے رُوکے اور بہت اچھے اچھے کرنے کے کام ہیں ان کو انجام دے۔ ایسے ہی دوسرے اعضا کو صحیح اور نیک مقاصد میں استعمال کرے۔ بہرحال اعضا کے طاعات و معاصی ظاہر ہیں ان کا خیال رکھے۔

مراقبے کی حقیقت

مراقبہ کہتے ہیں کسی رقیب کا لحاظ رکھنا اور اپنی توجہ رقیب کی طرف پھیر لینا۔ ایک

شخص کسی کا لحاظ کر کے کوئی کام چھوڑ دے تو اس کو مراقبہ کرنا کہیں گے اور تصوف کے نزدیک مراقبہ قلب کی ایک حالت کا نام ہے یعنی قلب ہمہ وقت رقیب کو دیکھتا رہے اور یہ حالت ایک معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بات کی معرفت کہ خدا دل کی باتوں کا جاننے والا اور باطن کے احوال سے باخبر ہے۔ جب یہ معرفت یقین کے درجے کو پہنچ جاتی ہے تو دل پر مستولی اور غالب ہو جاتی ہے اور قلب رقیب کے دیکھنے کو ہمہ وقت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی کو کسی بات کا یقین ہو مگر وہ چیز اس کے دل پر غالب نہ ہو' آخر آدمی کو موت کا یقین ہے مگر دل پر اس کا غلبہ نہیں ہوتا اور جو لوگ یقین کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں وہ گم رہتے ہیں' ان کے پاس سے قیامت گزر جائے تب بھی احساس نہ ہو۔

دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جن کو احساس تو رہتا ہے کہ خدا ہمارے ظاہر و باطن کا نگراں ہے مگر وہ مدہوش نہیں ہوتے۔ وہ ظاہری اعمال کے ساتھ مراقب بھی رہتے ہیں وہ ہر کام میں فکر کرتے ہیں۔ خدا سے حیا کی وجہ سے ہر کام میں تامل کرتے ہیں۔ وہ اپنے نفس کے محاسبے اور معائنے کے ساتھ ساتھ اس کو تنبیہہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ان کا مطلب بھی حاصل ہو جاتا ہے اور وہ نفس نیکی کا عادی ہو جاتا ہے۔

دوسرے پر نصیحت جب ہی کارگر ہوتی ہے جب اپنا محاسبہ کر کے اپنے آپ کو راستے پر لگا لیا جائے۔ انسان کو چاہیے کہ جب مراقبہ اور محاسبہ کر کے اپنے نفس کی کوتاہی معلوم کر لی' پھر اس کے بعد نفس کو بالکل مہلت نہ دے' فوراً اس کی تادیب کرے ورنہ برائی کا عادی ہو جائے گا۔ اور پھر اس کا باز آنا دشوار تر ہوگا۔ نفس کی سرکشی بڑی مشکلوں سے دور ہوتی ہے مگر جب نفس پر اس کی مرضی کے خلاف عمل کا بوجھ آپڑتا ہے تبھی تو وہ آہستہ آہستہ عادی ہو جاتا ہے' پچھلے اکابر' صوفیا عورتوں اور مردوں نے ذرا ذرا سے قصور پر اپنے نفس کو اس قدر سزائیں دی ہیں کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر ان کو اسی میں کیف ملتا تھا کیونکہ نفس کی پاکیزگی سے معرفت اور نیکی کا بدلہ ملتا تھا۔

امام شافعیؒ کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے:۔

”کاموں میں صحیح نظر رکھنا مغالطے اور
خطاؤں سے بچاتا ہے۔ رائے میں پختگی کا ہونا
ندامت اور قصور سے بچاتا ہے۔ اگر آدمی ہر کام
میں تامل اور غور وفکر کرتا ہے تو اس کی احتیاط
اور دانائی ظاہر ہوتی ہے۔ حکما اور صاحب رائے
لوگوں سے مشورے لیتے رہو اس سے نفس میں
استقلال اور بصیرت میں دانائی پیدا ہوگی۔ عزم
سے پہلے فکر کرو۔ کام سے پہلے سوچ لو اور
مشورہ کرلو۔“

فکر کا بیان

تامل اور تفکر بڑی دولت ہے‘ اس سے جہاں باطن کی بصیرت پیدا ہوتی ہے‘ وہیں صدیوں کی عبادت سے بڑھ کر عبادت بھی ہے۔ فکر کی حقیقت اور طریقہ جاننا ضروری ہے۔

فکر کیا ہے؟

فکر دو چیز کی معرفت کے بعد اس میں اس طرح غور وفکر اور تامل کرنا ہے کہ اس سے ایک تیسری معرفت حاصل ہو جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص اس موجودہ دنیا میں غور و تامل کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ دنیا بہتر ہے یا اُلجھنوں اور پریشانیوں کی اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیا بہتر ہے‘ اب اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی سے سنے کہ وہ دوسری دنیا اچھی ہے‘ یہ سنتے ہی اُس نے مان لیا‘ اگرچہ اس بات کی اُسے کچھ حقیقت معلوم نہیں ہوسکی نہ کچھ بصیرت حاصل ہوئی‘ صرف دوسروں سے سُن کر اعتماد کیا اور اس دنیا سے الگ ہوکر آخرت کی راہ میں لگ گیا۔ اسے تقلید کہیں گے۔ یہ معرفت نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس بات کو جانے کہ ہر پائدار‘ مستقل اور دائمی رہنے والی چیز کو اختیار کرنا

چاہیے' پھر جانے کہ آخرت اور دوسری زندگی ایسی ہی یعنی پائدار' مستقل اور دائمی چیز ہے۔
اب ان دو معرفتوں کے بعد اُسے ایک تیسری معرفت حاصل ہوئی کہ آخرت ہی اختیار کرنے کے قابل ہے' تو یہ تیسری معرفت اس طرح حاصل ہوئی کہ اس سے پہلے دو اور معرفت دل میں لانی پڑی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیسری معرفت تک پہنچنے کے لیے پہلی دونوں معرفتوں کا دل میں لانا تفکر' تامل اور تدبر کہلاتا ہے۔ ایک معرفت پہلے سے دل میں جمع ہوتی ہے' دوسری معرفت بھی دل میں موجود ہے۔ دونوں ایک خاص ترکیب سے ملتے ہیں پھر اُن سے ایک تیسری معرفت نکلتی ہے' پھر یہ تیسری معرفت گول میں آئی ہوئی کسی اور معرفت سے ملتی ہے تو ایک اور نئی معرفت سامنے آتی ہے۔ اسی طرح علوم وحکمت کے ثمرات اشیا کی معرفت کی صورت میں بڑھتے رہتے ہیں' اور علم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اکثر لوگ جو علم کی زیادتی سے محروم رہتے ہیں وہ اس لیے کہ ان کے پاس سے ہی کوئی معرفت نہیں ہوتی' چنانچہ دوسری معرفت کا دل میں آنا' دو معرفتوں کا ترکیب پانا' پھر نتیجہ اور پھل تیسری معرفت کی صورت میں پیدا ہونا' ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوسکتا' گویا راس المال ہی نہیں ہے منافع کہاں سے ہوگا۔ یا بعض اوقات راس المال تو ہوتا ہے مگر تجارت کا طریقہ نہ جاننے کی وجہ سے راس المال میں بڑھوتری اور نمو نہیں ہوتا بلکہ راس المال جس قدر ہوتا ہے اتنا ہی رہ جاتا ہے' یعنی انسان کے پاس معارف راس المال کی طرح ہوتے تو ہیں مگر ان کو اچھی طرح دوسری معرفتوں سے ملانا' غور وفکر کرکے اور کوئی نکتہ یا نئی معرفت نکالنا یہ فن نہیں آتا' اس لیے نیا نتیجہ یا ثمرہ حاصل نہیں ہوتا' بس جس قدر علم حاصل ہوگیا ہے یا معرفت پیدا ہوگئی ہے، اتنا ہی رہتا ہے۔ فکر کا ثمرہ علم ہوا کرتا ہے پھر علم سے دل کا حال بدلتا ہے اور دل کی تبدیلی کا اثر ظاہری اعمال پر پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فکر تمام خیر کی اصل اور مبدا ہے اسی لیے فکر بہ مقابلہ ذکر کے افضل ہے کیونکہ فکر قلب کا ذکر ہوتا ہے اور قلب کا ذکر ظاہری ذکر سے افضل ہے' کامیابی اسی میں ہے کہ انسان ظاہر سے زیادہ باطن کی فکر کرے اور دراصل عمل ظاہر بھی وہی بہتر ہوتا ہے جس میں فکر اور ذکر قلبی شامل ہو۔ اسی لیے کہا گیا ہے ''ایک ساعت کی

فکر برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔'' فکر کی راہیں بہت سی ہیں مگر ہم وہ صورت لکھ رہے ہیں جس میں ایک سلیم الطبع ذہن فکر کر کے مطمئن ہو سکتا ہے کہ واقعی فکر کی راہیں یہی ہیں

ہر روز صبح کے وقت ۱؎ اپنے اعضا اور اپنے ظاہری اعمال میں فکر کرے کہ کہیں کوئی غیر مناسب حرکت تو نہیں ہوئی ہے۔ اگر کچھ یاد آئے تو فوراً اُسے ترک کرنے کا ارادہ کرے اور اگر دن کے آیندہ حصّے میں کسی بُرے کام کا ارادہ ہو تو اُس سے بچنے کا ارادہ کرے۔ ۲؎ اپنے مال کے سلسلے میں فکر کرے اور دیکھے کہ میرے پاس کافی مال ہے، میں کسی غریب اور ضرورت مند کی ضرورت کہاں تک پوری کر رہا ہوں، باطنی ۳؎ صفات میں فکر کرے، مثلاً بخل، کبر، غضب، ریا، حسد، بدگمانی، غرور وغیرہ کو اپنے دل میں تلاش کرے اور ان کو دل سے دور کرے۔ ۴؎ ان چیزوں پر فکر کرے جن سے گناہوں کی تلافی ہوتی ہے، مثلاً گناہ سے توبہ کر لی یا نہیں، گناہ پر ندامت ہے یا نہیں، بلاؤں اور مصائب پر صبر کر سکتا ہے یا نہیں، نعمت پر شکر کرتا ہے یا نہیں۔ مخلوق کے ساتھ محبت ہمدردی اور خدمت کا جذبہ ہے یا نہیں اور کس قدر خدمت کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے تمام انسان، حیوان، نباتات، جمادات، دریا، جنگل، پہاڑ، چاند سورج، ستارے، نیلا آسمان، معدنیات، ہیرے جواہرات، نئی نئی ایجادات، غرض کائنات کا ذرّہ ذرّہ دعوت فکر دے رہا ہے، انسان شب و روز کی اُلجھنوں سے کسی وقت الگ ہو کر ایک لمحہ ان میں سے کسی ایک چیز میں، پھر اس چیز کی تصیلات میں، اس کی صنعت میں، پھر اس چیز کی تفصیلات میں، اس کی صنعت میں، اس کے فائدوں میں غور کرے تو امید ہے مخلوق میں اس طرح فکر کرنے سے، خالق کی معرفت، اس کی عظمت وہیبت اور اس کی قدرت سمجھ میں آئے گی، اور جس قدر کائنات کی معرفت بڑھے گی خالق کے جلال و عظمت کی معرفت کامل تر ہو گی۔

توکّل

توکل کے معنی و مفہوم میں عام طور پر بڑی غلط فہمی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ علم کے لحاظ سے بہت دقیق اور عمل کے اعتبار سے بہت مشکل بھی ہے، یوں سمجھیے کہ توکل میں

اسباب ظاہری پر اعتبار کرنے کو منع بھی کیا جاتا ہے اور اسباب سے بالکل ہاتھ اُٹھا لینے کا بھی حکم نہیں ہے' اس لیے توکل کے ایسے معنی جو عقل کے بھی مطابق ہوں اور مطلوب بھی ہوں ذرا مشکل کام ہے' اس لیے ہم اس پر توجہ کرتے ہیں۔ توکل کی تعریف میں اکثر لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر ہم ان سب کو چھوڑ کر امر واقعی کو لیتے ہیں۔

''توکل'' وکالت سے نکلا ہوا لفظ ہے' جس کے معنی ہیں ''دوسرے پر اعتماد کر کے کام سپرد کر دینا۔'' جس کو کام سپرد کرتے ہیں اس کو وکیل کہتے ہیں' اور جو کام سپرد کرتا ہے اس کو متوکل کہا جاتا ہے' یہ قاعدہ ہے اور عادت ہے کہ کوئی بھی متوکل یعنی کام سپرد کرنے والا اُسی وکیل کو کام سپرد کرے گا جس کی طرف سے اُسے اطمینان اور اعتقاد ہوگا' اس کو عاجز و مجبور نہ سمجھتا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ ''توکل دل کے اعتماد کو کہتے ہیں۔'' دینوی معاملے میں متوکل' وکیل میں چار چیزیں چاہتا ہے۔ اول ہدایت' ہدایت سے باریک گوشے پر وکیل کی نظر ہو تا کہ کسی پہلو سے بھی متوکل کو نقصان نہ پہنچ سکے۔ دوم قدرت' قدرت اس لیے کہ مثلاً ایک شخص نے ایک جھگڑے میں کسی کو وکیل بنایا' وکیل جب حاکم کے سامنے اُس شخص کے جھگڑے کو فیصلے کے لیے لے گیا اور خوف' بزدلی' یا حیا کی وجہ سے اس کے معاملے پر پوری طرح بحث نہ کر سکا تو ظاہر ہے اس کا معاملہ کمزور پڑ جائے گا' اس لیے قدرت ضروری ہے۔ تیسرے فصاحت' فصاحت اس لیے کہ جو بات دل میں ہے اس کو بخوبی بیان کر کے متوکل کے توکل کا حق ادا کر سکے۔ چوتھے مکمل شفقت' یہ اس لیے کہ اپنے اوپر توکل کرنے والے کے معاملے میں کوئی کمزوری نہ چھوڑے بلکہ دل و جان سے اس کی طرفداری کرے' اگر وکیل میں یہ چار باتیں مکمل طور پر ہوں گی تو متوکل کو اس پر پورا پورا بھروسہ ہوگا' ورنہ اس کا دل متردد رہے گا۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر اب اصل توکل پر غور کیجئے جو بندہ اپنے خدا پر رکھتا ہے۔ دیکھیے اللہ تعالےٰ اپنے اُوپر توکل کرنے والے کے تمام معاملات کو بخوبی جانتا ہے' وہ توکل کے بھید اور مقصد سے بخوبی واقف ہے۔ پھر وہ سب سے بڑی قدرت اور طاقت والا ہے' وہ ایسا حاکم ہے کہ تمام معاملات اسی کی عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔

بندوں پر اس کی رحمت کامل اور اس کی عنایت شامل ہے' ان امور کو جاننے کے بعد بے شک وہ خدا پر پورا بھروسہ اور توکل کرے گا۔

اتنا جان لینے کے بعد یہ جاننا چاہیے کہ توکل میں کئی مقامات ہیں۔ بعض وہ ہیں جو ہماری ظاہری سمجھ سے بالاتر ہیں' اور ان پر ہم پہنچ بھی نہیں سکتے۔ یعنی اُن پر پہنچنا ممکن نہیں ہے ہاں مشکل ضرور ہے' مثلاً بچّے کو ماں پر توکل ہوتا ہے کہ بھوک لگے تب' کوئی ستائے تب' غرض ہر حال میں اُسے ماں اور صرف ماں یاد آتی ہے' وہ کسی اور طرف توجہ کر ہی نہیں سکتا گویا ماں پر بھروسہ اس کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ پس جو خدا پر ایسا توکل کرلے وہ کسی حال میں کبھی سوائے خدا کے کسی کو اپنا سہارا اور مددگار نہ سمجھے گا۔ اس میں بھی ایک مقام اس سے بلند آتا ہے وہ یہ ہے کہ خود کو خدا کے سامنے اس طرح ڈال دے کہ اپنی ہر حرکت' ارادے اور ہر جنبش کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دے۔ مثلاً ایسے بچے کی طرح ہو جو یہ جانتا ہے کہ اگر ماں سے فریاد نہ کرے گا تو ماں خود ہی اسے ڈھونڈھ لے گی' اگر وہ ماں کے دامن سے نہ لپٹے گا تو ماں خود ہی اسے اُٹھا لے گی' اور اگر وہ ماں سے دودھ نہ مانگے گا تو ماں خود ہی اسے دودھ پلائے گی' یہ مقام توکل کا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ متوکل خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے اُس سے سوال اور دعا بھی چھوڑ دے۔ مگر یہ وہ مقامات ہیں۔ جو عوام کے ذہن اور دسترس سے دور ہیں' اس لیے ہم عام توکل سے بحث کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بندے کو توکل کے بعد اسباب اور ظاہری تدبیروں سے کچھ تعلق رہے گا یا نہیں؟ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جب ایک شخص نے کسی معاملے میں اپنے وکیل پر اعتماد اور توکل کرلیا تو اب وہ تدبیر جو وکیل کے علاوہ دوسروں سے متعلق ہے' اُسے نہیں کرے گا' مگر جو تدبیر اس کا وکیل بتائے گا اُسے تو کرنا ہی پڑے گا۔ مثلاً وکیل نے کہا کہ جب تک تو عدالت میں موجود نہ ہوگا میں تیرے معاملے میں کچھ نہ بولوں گا' تو وہ شخص خواہ مخواہ عدالت میں حاضری کے لیے تدبیریں کرے گا' اور ظاہر ہے کہ اس کی یہ تدبیر' اس کا عدالت میں حاضر ہونا کسی طرح بھی توکل کے خلاف نہیں ہے' یہاں وکیل سے بداعتمادی یا توکل نہ کرنے کا الزام اس پر نہیں

آئے گا بلکہ غور کیجیے تو وکیل نے توکل کو مکمل کرنے کے لیے کچھ ضروری ہدایت دی ہے۔ ''یعنی اس کا عدالت میں حاضر ہونا۔'' اور وہ شخص بھی پورے توکل کے لیے اس تدبیر پر عمل کر رہا ہے۔ اگر اس کو اب بھی وکیل پر اعتماد نہ ہوتا یا اس پر توکل نہ ہوتا تو وہ وکیل کے کہنے پر کیوں حاضر ہوتا۔ دوسری مثال تدبیر کی یہ ہے کہ اس شخص کو وکیل کی بعض عادتوں کا علم ہے جیسے اسے معلوم ہے کہ میرا وکیل عدالت میں اُس وقت بحث کرتا ہے جب اُس کے سامنے مقدمے کی دستاویز موجود ہو۔ اب اس کا توکل جبھی پورا ہوگا جب وہ اس ظاہری تدبیر پر بھی عمل کرے اور وکیل کی عادت کا لحاظ رکھتے ہوئے دستاویز لے کر حاضر ہو۔ غرض یہ دونوں صورت تدبیر میں داخل ہے' یہ توکل کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں اس کی تدبیر خود عدالت میں آنے یا دستاویز لانے کے بعد ختم ہوگئی۔ اب وہ وقت آپہنچا کہ اس کا اطمینان اور اعتقاد صرف وکیل پر رہ گیا ہے' اس تقریر کے بعد تمام اعتراض توکل پر سے ختم ہو جاتے ہیں' توکل کی یہ شرط ہرگز نہیں ہے کہ آدمی تمام تدبیر اور سارے کام سے ہاتھ اُٹھالے اور خدا کے فیصلے کا انتظار کرتا رہے۔

بعضوں کو یہ گمان ہے کہ توکل کے معنی یہ ہیں کہ نہ بدن سے کوئی کام کرے' نہ دل ودماغ سے کوئی تدبیر سوچے' پھٹے پرانے لباس پہن کر پڑا رہے' یہ بالکل جاہلانہ بات ہے۔ اس سلسلے میں بھی تھوڑی سی تفصیل ہے۔ انسان اپنے اختیار سے جو کوششیں کرتا ہے وہ چار قسم کی ہوتی ہیں۔ اوّل' کسی نافع چیز کو حاصل کرتا ہے۔ دوم' حاصل کی ہوئی چیز کی حفاظت کرتا ہے۔ سوم' کسی ایذا دینے والی چیز کو ایذا دینے سے پہلے دفع کرتا ہے۔ چہارم' مصیبت جو اپنے اوپر آگئی ہو اس کو دور کرتا ہے۔

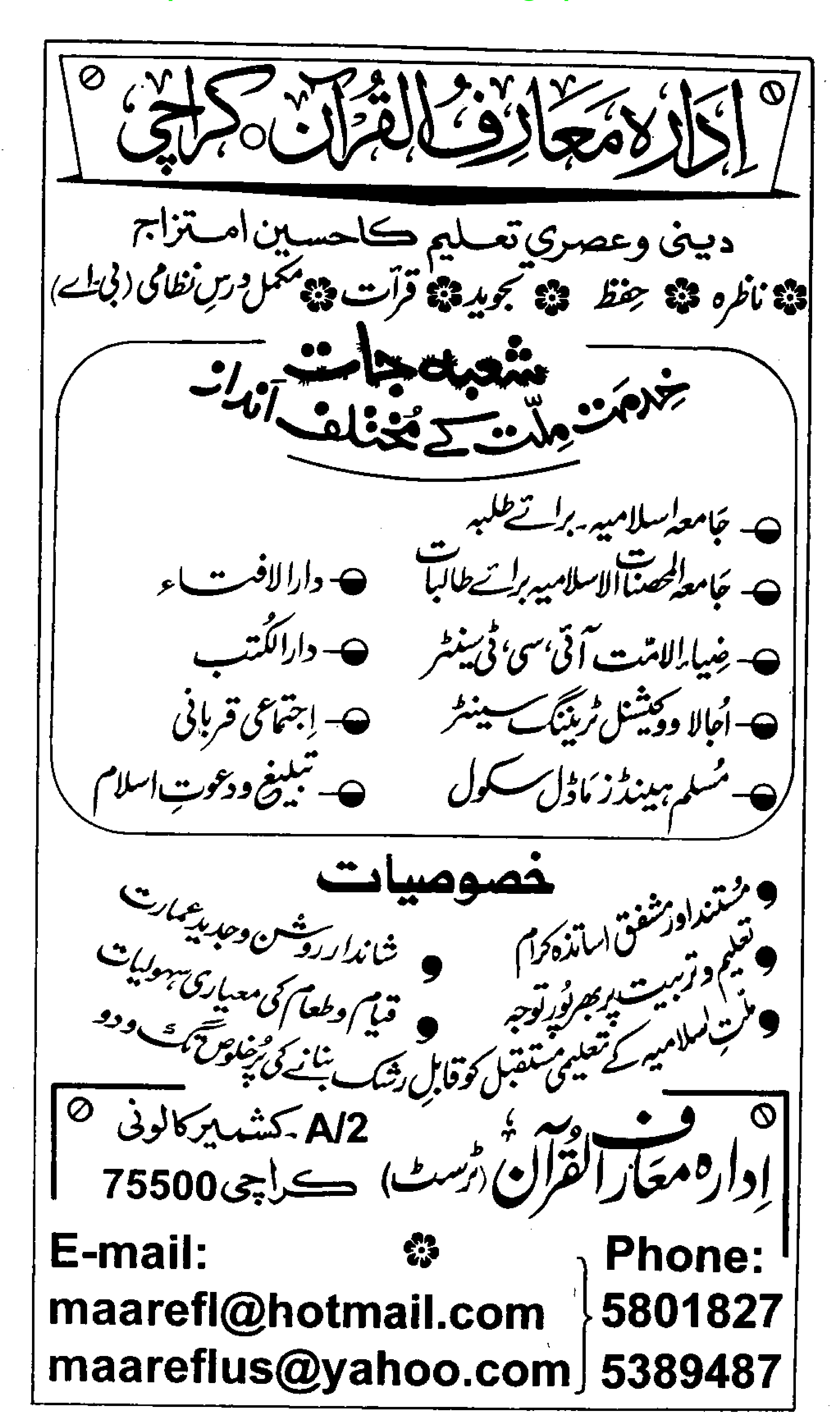
اب ان چاروں میں توکل کی شرط کیا ہے۔ نافع چیز میں مثال ہے کہ آدمی کے سامنے کھانا رکھا ہوا ہو اور وہ بھوکا بھی ہوگا مگر اس پر ہاتھ نہ بڑھائے اور کہے کہ میں متوکل ہوں تو یہ توکل کے خلاف ہے۔ اس کو جنون کہتے ہیں کیونکہ خدا نے اس کے لیے قطعی اسباب بنادیے ہیں' ان کے خلاف نہیں ہوتا۔ اسی طرح بغیر بیج اور محنت کے غلّہ طلب

کرنے والا مجنون ہے۔ توکل تو اس علم کو کہتے ہیں کہ ہاتھ‘ منہ‘ دانت‘ کھیت‘ بیج‘ مٹی‘ محنت خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور کھانا‘ پانی‘ کھیت میں غلہ دینا یہ سب اُسی کا کام ہے اور اس کا بھی علم ہو کہ ہمیں فلاں مقصد کے لیے فلاں فلاں کام کرنا ہوگا اور توکل اس حالت کا نام ہے کہ باوجود ان ظاہری اعضا کے ظاہری حرکت کے قلب کا اعتماد یہی ہو کہ کامیابی اور مقصد بہر حال خدا کے ہاتھ میں ہے‘ ہماری ان ظاہری حرکتوں کے اوپر منحصر نہیں ہے‘ ہمیں تو اس تدبیر کا حکم ملا ہے‘ ہم کرر ہے ہے۔ ہم یہ نہ کریں گے تو نہ کھانا کھا سکیں گے نہ غلہ پائیں گے کیونکہ بغیر کچھ کیے ہوئے پاجانا خدا کی عادت کے خلاف ہے۔

دوسری قسم یعنی ایک شخص اپنی ضرورت کی چیز کو حفاظت سے رکھ لیتا ہے تو یہ بھی توکل کے خلاف نہیں ہے۔ اس میں بھی لوگوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں‘ بعض ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ ایک وقت کھانا کھالیا دوسرے وقت کا کھانا محفوظ نہ کیا بلکہ دوسرے کو دے دیا۔ مگر ہم اُن لوگوں کو دیکھیں گے کہ اگر وہ حفاظت سے نہ رکھیں تو اُن کا ذہن پرا گندا ہوتا ہو‘ جس سے عبادت میں اور اُن کے مقاصد پر اثر پڑتا ہو‘ تو اُن کو رکھ لینا ہی بہتر ہے بلکہ کسی کے دل کو اگر کچھ جمع رہنے سے اس قدر سکون ملتا ہو کہ وہ سکون اور دلجمعی سے عبادت میں مصروف ہو سکتا ہے تو اس کے لیے بہت اچھا ہے کہ حفاظت کرے۔ اس کے خلاف توکل کے نام پر عمل کر کے دل کو پریشان نہ کرے‘ پھر اگر مال یا کسی چیز کے جمع کرنے سے کسی بُرائی میں نہیں پڑتا اور یہ چیز اسے کسی بھلائی سے نہیں روکتی تو ضرور حفاظت کرے‘ یا عیال دار اگر اپنے متعلقین کے خیال سے جمع کرتا ہے تو ہرگز توکل سے باہر نہیں ہے۔ ہاں زیادہ حرص و ہوس اور بالکل مال اور دنیا پر گرنا توکل ہی کیا شرافت و انسانیت کے بھی خلاف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دل کے استغنا کے ساتھ جمع کرنا اور ہر وقت اُسی میں مشغول نہ رہنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ تیسرے موذی چیزوں کے دفع کرنے کی بات ہے ضرر کبھی نفس اور جان پر آتا ہے‘ کبھی مال پر‘ کہیں بھی توکل کا منشا یہ نہیں ہے کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے یا مثلاً درندوں‘ حشرات الارض والے علاقے میں سو جانا‘ بارش سے گرتی ہوئی چھت کے

نیچے سونا اور آگ لگی ہوئی عمارت میں گھسنا، دشمنوں میں خود جانا اور پھر یہ کہنا ہم نے توکل کیا ہے، یہ توکل کے سراسر خلاف ہے۔ اسی طرح سے جو مصائب سر پر آپڑیں ان کو توکل کے نام پر دفع کرنے کی کوشش نہ کرنا، یہ بھی توکل کے خلاف ہے۔ یہاں بھی وہی تفصیل ہے کہ دوا کو مطلق شفا اور صحت کا سبب نہ ماننے، یہ علم رہے کہ خدا نے مرض اور مصیبت میں علاج اور چارہ جوئی کا حکم دیا ہے اور حال یہ ہو کہ علاج اور دوا کے بعد بھی قلب کو یہ یقین کامل رہے کہ شفا اور صحت نہ طبیب کے ہاتھ میں ہے نہ دوا اور علاج سے ممکن ہے۔ کارساز کوئی اور ہی ذات ہے۔

اس تمام بحث سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ توکل میں اسباب پر مکمل بھروسہ اور اسباب سے قطعی دست برداری دونوں عقل و شریعت کے خلاف ہیں۔



ادارہ معارف القرآن ۔ کراچی
دینی وعصری تعلیم کا حسین امتزاج
ناظرہ ✿ حفظ ✿ تجوید ✿ قرأت ✿ مکمل درسِ نظامی (بی اے)
شعبہ جات
خدمتِ ملت کے مختلف انداز
جامعہ اسلامیہ۔ برائے طلبہ
جامعۃ المحصنات الاسلامیہ برائے طالبات
ضیاء الامت آئی، سی، ٹی سینٹر
اجالا ووکیشنل ٹریننگ سینٹر
مسلم ہینڈز ماڈل سکول
دارالافتاء
دارالکتب
اجتماعی قربانی
تبلیغ ودعوتِ اسلام
خصوصیات
مستند اور مشفق اساتذہ کرام
تعلیم وتربیت پر بھرپور توجہ
ملتِ اسلامیہ کے تعلیمی مستقبل کو قابلِ رشک بنانے کی پُرخلوص تگ ودو
شاندار روشن وجدید عمارت
قیام وطعام کی معیاری سہولیات
ادارہ معارف القرآن (ٹرسٹ)
A/2۔ کشمیر کالونی
کراچی 75500
E-mail:
maarefl@hotmail.com
maareflus@yahoo.com
Phone:
5801827
5389487


Voice:
042-7248657
Mobile:
0300-9467047